مسعود حسن رضوی ادیب

حیات اور کارنامے

ڈاکٹر طاہر تونسوی

○

مجلسِ ترقّیِ ادب
کلب روڈ ـــ لاہور

طبع اول : اپریل ۱۹۸۹ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
ناظم مجلسِ ترقیِ ادب ، لاہور

مطبع : زرین آرٹ پریس ، ۶۱ ریلوے روڈ ، لاہور

طابع : محمد زرین خان

قیمت : ۹۰ روپے

فہرس

''ادبستان'' لکھنؤ کے مکینوں

ڈاکٹر آفاق حسین رضوی

ڈاکٹر نیر مسعود رضوی

ڈاکٹر انور مسعود رضوی

جناب اظہر مسعود رضوی

کے نام

پیش لفظ

مسعود حسن رضوی کے نام سے میں زمانۂ طالب علمی سے واقف تھا۔ فروری ۱۹۷۷ء میں جب اپنے اساتذہ کے مشورے سے میں نے پی ایچ ۔ ڈی کے لیے مسعود حسن رضوی کی حیات اور کارناموں پر خاکہ بنانا شروع کیا تو ان کا تحقیقی و تنقیدی کام (جتنا پاکستان میں دستیاب تھا) اور پھر اس پر معاصر تنقید دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ اُن کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے ۔ اس بات کا تذکرہ مظفر علی سید ''نقوش'' اگست ۱۹۶۰ء کے شمارے میں پہلے ہی کر چکے تھے ۔ اس اعتبار سے مجھے ایک طرح اس کھلی بے انصافی پر خاصا دکھ ہوا اور فطری طور پر مجھے اپنے موضوع سے دلچسپی ہوئی اور یہ دلچسپی ہمدردی میں تبدیل ہو گئی ۔ خاکے کی منظوری کے بعد میں نے جم کر کام کرنا شروع کیا ۔ پاکستان بھر کی مختلف لائبریریوں کے علاوہ ذاتی کتب خانے بھی دیکھے ۔ مقالے کے سلسلے میں میں نے بھارت کا سفر بھی اختیار کیا ۔ چنانچہ ۱۹ ۔ اپریل ۱۹۷۹ء سے ۱۵ جون ۱۹۷۹ء تک میں نے وہاں قیام کیا اور ادیبوں ، شاعروں دانشوروں ، مسعود حسن رضوی کے دوستوں ، مداحوں ، شاگردوں اور جاننے والوں سے ملاقاتیں کیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض اہم شخصیات سے انٹرویوز بھی کیے ۔ بھارت میں لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری ، رضا لائبریری رامپور ، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری دہلی ، کتب خانہ انجمن ترقیٔ اُردو (اُردو گھر) نئی دہلی ، ذاکر حسین لائبریری جامعۂ ملیہ نئی دہلی کے علاوہ مسعود حسن رضوی کا ذاتی کتب خانہ بھی کھنگال ڈالا ۔

اس مقالے میں چھ[1] ابواب ہیں ۔ پہلا باب حالاتِ زندگی پر مشتمل

۱۔ مقالہ سات ابواب پر مشتمل تھا ۔ اس میں ''مسعود حسن رضوی کے ادبی معرکے'' والا باب شامل نہیں ۔ یہ میرے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''رجحانات'' میں موجود ہے ۔

ہے جس میں مسعود حسن رضوی کی پیدائش ، بچپن ، تعلیم ، ملازمتوں ، مشاہیر سے تعلقات ، عادات و خصائل ، سیرت و کردار اور وفات تک کے حالات پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اس سلسلے میں ان کے اپنی بیگم کے نام خطوط پہلی بار سامنے آ رہے ہیں جن میں ایک اور مسعود حسن سے ملاقات ہوتی ہے جو نقاد و محقق اور پروفیسر مسعود حسن رضوی سے قطعی طور پر مختلف ہے ۔ ملازمتوں کے سلسلے میں بھی ان کی بطور لیکچرر پرشین تقرری پر اخبارات میں جو ہنگامہ آرائی ہوئی اس کی تفصیل اُس وقت کے اخبارات و رسائل کی روشنی میں پہلی بار ضبطِ تحریر میں آئی ہے ۔ مشاہیر سے تعلقات کے سلسلے میں جوش ملیح آبادی سے تعلقات اور غزل پر ان سے گفتگو کے علاوہ جوش کے بارے میں نادر معلومات بھی پہلی بار سامنے آئی ہیں (لطف کی بات یہ ہے کہ جوش ملیح آبادی نے ''یادوں کی برات'' میں کہیں بھی مسعود حسن رضوی کا تذکرہ نہیں کیا) ۔ اسی طرح علامہ اقبال سے ان کی ملاقات کا ذکر بھی پہلی بار آیا ہے ۔ سیرت و کردار کے عنوان سے مسعود حسن رضوی کی روزمرہ زندگی کے ہمہ جہت پہلوؤں کی تفصیل پیش کی گئی ہے ۔ انھوں نے عراق اور ایران کا جو سفر کیا تھا اس کے بارے میں ان کی ڈائری میں درج شدہ تفصیلات کو بھی پہلی بار سامنے لایا گیا ہے ۔

دوسرے باب میں مسعود حسن رضوی سے پہلے اور اُن کے عہد کے ادبی و شعری محرکات کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے ۔

تیسرے باب میں بحیثیت نقاد ان کی تصانیف کے حوالے سے ان کی ادبی خدمات کا تنقیدی نظریات اور عملی تنقید کے تناظر میں تجزیہ کیا گیا ہے ۔ ''ہماری شاعری'' کو خود مسعود حسن رضوی نے حالی کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' کا تتمہ قرار دیا ہے مگر ایسا نہیں ۔ دلائل اور شواہد کی روشنی میں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ ''ہماری شاعری'' ''مقدمہ شعر و شاعری'' کے جواب میں لکھی گئی ہے ۔ اسی طرح نظریاتی تنقید کے حوالے سے بطور نقاد ان کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

چوتھے باب میں بحیثیت محقق ان کے محققانہ کارناموں پر تفصیل سے لکھنے کے بعد ان کے محققانہ اسلوب ، تحقیق کار اور عملی تحقیق کے تناظر

میں اُنھیں تعمیری تحقیق کے دبستان کا نمائندہ قرار دیا گیا ہے - اس میں اُردو ڈرامے ، مرثیے ، تذکرے اور بحیثیت مرتب متن کے علاوہ یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ الیس کی از سرِ نو دریافت کا سہرا ان کے سر ہے -

پانچواں باب ''ادبی شخصیت کا تنوع'' پر مشتمل ہے - اس میں مسعود حسن رضوی کی ادبی شخصیت کا بھرپور تجزیاتی مطالعہ بطور اُستاد ، ماہرِ قواعدِ زبان ، دیباچہ نگار و تبصرہ نگار، مراسلہ نگار ، شاعر ، مترجم ، انگریزی مضمون نگار اور مدیر کے کیا گیا ہے - غیر مطبوعہ مواد کے ذریعے ان کی ادبی شخصیت کی کئی پرتیں کھولی گئی ہیں - بعض ایسے خطوط بھی سامنے لائے گئے ہیں جو کبھی بھی شائع نہ ہو سکتے تھے - اس طرح اُن کی لکھی ہوئی بعض تحریریں پہلی بار سامنے آئی ہیں -

چھٹے باب میں مسعود حسن رضوی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور معاصر تنقید کے حوالے سے ان کے ادبی کام کو پیشِ نظر رکھ کر اردو ادب میں ان کا مقام و مرتبہ متعین کیا گیا ہے -

مسعود حسن رضوی کے سلسلے میں جس بے انصافی کا تذکرہ میں نے شروع کیا ہے ، کام کرنے کے دوران میرا گمان یقین میں بدلتا گیا - میں یہ تو نہیں کہتا کہ اس مقالے میں ان کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کا ازالہ ہو گیا ہے ، تاہم میں نے بساط بھر کوشش کی ہے کہ ان کے ادبی مقام و مرتبے کا صحیح تعین کر دیا جائے -

اس مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں بہت سے اساتذہ ، بزرگوں اور دوستوں نے میری مدد اور رہنمائی کی ہے - پاکستان میں ڈاکٹر وحید قریشی ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری ، مشفق خواجہ ، ڈاکٹر اختر مسعود رضوی ، محمد طفیل نقوش ، سید قدرت نقوی ، ڈاکٹر سلیم اختر ، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ، محمد افضل قرشی ، لیاز احمد ، جمیل النبی اور ہندوستان میں ڈاکٹر آفاق حسین ، اظہر مسعود رضوی ، مالک رام اور رام لعل کے نام قابلِ ذکر ہیں - میں ان تمام اصحاب کا شکر گزار ہوں -

ڈاکٹر نیر مسعود رضوی کا ، جو صحیح معنوں میں تحقیق و تنقید کے حوالے سے مسعود حسن رضوی کے جانشین ہیں ، خاص طور ممنونِ احسان ہوں کہ انھوں نے نہ صرف مجھے لکھنؤ میں اپنے ہاں ٹھہرایا بلکہ مسعود حسن

رضوی کا سارا ادبی اثاثہ بھی میرے حوالے کر دیا اور یوں مجھے اس اثاثے سے ایسا نادر و نایاب مواد ملا کہ جس سے اس مقالے کی قدر و قیمت بڑھ گئی اور حقیقت یہ ہے کہ اگر میں بھارت نہ جاتا تو یہ کام کبھی بھی مکمل نہ کہلایا جا سکتا ۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ میں پہلا طالب علم ہوں جو صرف تحقیق کے سلسلے میں بھارت گیا ۔ بھارت میں بھی بہت سے دوستوں نے مجھے سہولتیں بہم پہنچائیں ۔ ان میں جناب سرور تونسوی کا نام سرِ فہرست ہے ۔ اور پھر بھارت میں میری ملاقات اپنے ہم وطن ادیب ، مزاح نگار ، طنز نگار اور کالم نگار جناب فکر تونسوی سے ہوئی اور میں نے ایک ہفتہ ان کے گھر میں قیام کیا ۔

آخر میں سب سے بڑھ کر میں اپنے اُستاد اور نگران جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا احسان مند ہوں کہ جنھوں نے خاکے کی تیاری اور منظوری سے لے کر اس کی تکمیل تک کے ہر مرحلے اور ہر مقام پر میری رہنمائی کی اور میری ہمت بڑھائی ۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ ناراض ہو کر مجھ سے بولنا نہ چھوڑ دیتے تو یہ مقالہ کبھی بھی وقت پر ختم نہ ہوتا ۔ میں ان کے احسانات کا بدلہ کبھی بھی نہیں اُتار سکتا ۔ اس ضمن میں مجھے جناب عرش صدیقی کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے کہ اگر وہ مجھ پر کچھ عرصے کے لیے اپنے گھر کے دروازے بند نہ کرتے تو میں مقررہ تاریخ تک مقالہ جمع کرانے میں کامیاب نہ ہو سکتا ۔ یوں میرے بزرگوں ، دوستوں اور کرم فرماؤں کی مہربانیوں کے طفیل یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا ۔ میں خدائے بزرگ و برتر کا احسان مند ہوں کہ اُس نے مجھے توفیق دی کہ میں یہ کام اپنی قوت اور طاقت کے مطابق سرانجام دے سکوں ۔ مقامِ شکر ہے کہ نومبر ۱۹۸۳ء میں مجھے اُس مقالے پر پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری ملی ۔ میں جناب احمد ندیم قاسمی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجلسِ ترقیٔ ادب کی طرف سے مقالے کو شائع کرنے کی حامی بھری ۔ جناب احمد رضا صاحب میرے خاص شکریے کے مستحق ہیں کہ جنھوں نے ذاتی دلچسپی لے کر اس کی جلد اشاعت کو ممکن بنایا ۔

اب جب کہ یہ مقالہ کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے، میں دعویٰ تو نہیں کرتا مگر اتنا کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں کہ میں نے اس مقالے میں مسعود حسن رضوی کا وہ حق اور جائز مقام انھیں دینے اور دلانے کی کوشش کی ہے کہ جس سے انھیں محروم رکھا گیا تھا۔

طاہر تونسوی

پرنسپل گورنمنٹ ولایت حسین
اسلامیہ کالج ملتان

۳ - اپریل ۱۹۸۹ء

خاندان

مسعود حسن رضوی کے خاندان کا پتہ اس مختصر آپ بیتی سے چلتا ہے جو انھوں نے اپنی کتاب "ہماری شاعری" کے آخر میں لکھی ہے اور یہی آپ بیتی بعد میں مختلف رسائل اور کتب میں شائع ہوتی رہی ہے - "ہماری شاعری" کے چوتھے ایڈیشن سے لے کر آٹھویں ایڈیشن تک اس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور وہ خود اس میں حک و اضافہ کرتے رہے ہیں - خاندان[1] کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں :

"میرا نسبی تعلق سادات کے ایک قدیم خاندان سے ہے جس کے مورثِ اعلٰی ایران کے مشہور شہر نیشاپور سے آ کر ہندوستان میں آباد ہو گئے تھے - میرے اجداد ذی عزت اور خوش حال تھے - کچھ سرکاری کاغذات میرے پاس ہیں جن میں میرے دادا کے دادا سید عزیز علی ولد سید عبدالمطلب کی جاگیر کی ایک تفصیل درج ہے جو مضافاتِ لکھنؤ میں واقع تھی - یہی کاغذ بتاتے ہیں کہ سید عزیز علی کے دادا سید سیف اللہ ولد سید محمود "بند ہائے چوکی خاص" میں سے تھے اور دو صدی ذات کے منصب پر فائز تھے - اور والد سید عبدالمطلب "منصب دار چوکی خاص" تھے اور پانصدی ذات کا منصب ، پچاس روپے نقدی اور ایک لاکھ چھہتر ہزار دام کی جاگیر پرگنہ ملیح آباد وغیرہ میں ان کی تنخواہ قدیم سے مقرر تھی -"[2]

---

۱ - خاندان اور حالاتِ زندگی کے لیے "ہماری شاعری" کا آٹھواں ایڈیشن پیشِ نظر رکھا گیا ہے -

۲ - ہماری شاعری ، ص ۲۷۹-۸۱ - مسعود حسن رضوی ادیب — ذات و

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اس بیان ہی سے ان کے شجرۂ نسب پر بھی روشنی پڑتی ہے اور ان کا پورا شجرۂ نسب یوں بنتا ہے :

سید محمود

سید سیف اللہ

سید عبدالمطلب

سید عزیز علی

سید فیض علی

سید امام علی

(حکیم) سید مرتضیٰ حسین

آفاق حسین رضوی — سید مسعود حسن رضوی — سیدہ بیگم

(۱) ارجمند بانو
(۲) اختر مسعود
(۳) برجیس بانو
(۴) انیس بانو
(۵) اکبر مسعود
(۶) انور مسعود
(۷) اظہر مسعود

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۸ -

بوستانِ قلم ، مرتبہ محمد عبداللہ خان خویشگی ، ص ۹۹ - مسعود حسن رضوی ادیب — حیات و خدمات، از مرزا جعفر حسین ، ص ۱۹ - مشاہیر کے خطوط ، از عبداللطیف اعظمی ، ص ۲۱۷ -

مسعود حسن رضوی کے والد سید مرتضیٰ حسین ایک ذی علم بزرگ اور حاذق حکیم تھے۔ اودھ کے ضلع اناؤ میں نیوتنی کا قصبہ ان کا وطن تھا مگر علم کا شوق انھیں لکھنؤ کھینچ کر لے گیا اور آب و دانہ کی کشش نے بہرائچ پہنچا دیا۔

پیدائش :

مسعود حسن رضوی کی پیدائش سے قبل ان کے دو بھائی مجتبیٰ حسین اور مقتدیٰ حسین بالترتیب اڑھائی سال اور ایک سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہوگئے تھے[1]۔ ظاہر ہے دونوں بیٹوں کی وفات سے والدین کو گہرا صدمہ پہنچا ہوگا اور اس غم کے ان کے دل پر گہرے داغ ہوں گے۔ چنانچہ مسعود حسن رضوی کے پیدا ہونے کی انھیں بڑی خوشی ہوئی ہوگی۔ مسعود حسن رضوی بہرائچ ہی میں ۱۵ محرم الحرام ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء کو پیدا ہوئے[2]۔ نقوش[3] کے آپ بیتی نمبر میں تاریخ ولادت ۲۲ جولائی درج ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے "مختصر تاریخ ادبِ اردو"[4] میں ۱۵ جولائی ۱۸۹۳ء لکھی ہے۔ خود مسعود حسن رضوی نے عبداللطیف اعظمی کو ایک خط[5] میں ۲۸/۲۹ جولائی تحریر کی ہے۔ "ہماری شاعری" کا حوالہ چونکہ مستند حوالہ ہے اس لیے مسعود حسن رضوی کی تاریخ پیدائش ۲۹ جولائی ہی درست ہے۔ ان کا نام محمد مسعود رکھا گیا اور عرفیت ننھے قرار پائی۔

رسمِ بسم اللہ اور بچپن :

محمد مسعود جب چار برس چار مہینے اور چار دن کے ہوئے، (یعنی عمر کے پانچویں سال) تو ان کی بسم اللہ کی رسم ادا کی گئی اور عربی و فارسی کی تعلیم

---

۱ - مسعود حسن رضوی ادیب — ذات و صفات، مرتبہ مالک رام، ص ۳۲ -

۲ - ہماری شاعری، ص ۲۸۱ -

۳ - نقوش، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم، ص ۱۱۶۷ -

۴ - مختصر تاریخِ ادب اردو، از ڈاکٹر اعجاز حسین، ص ۳۹۶ -

۵ - مشاہیر کے خطوط، از عبداللطیف اعظمی، ص ۲۲۳ -

شروع ہوئی مولوی لیاقت علی نے انھیں فارسی پڑھانا شروع کی مگر بہت جلد انہیں الگ کر دیا گیا بقول ڈاکٹر نیر مسعود ''مسعود کی زندگی میں مولوی لیاقت علی کے فیض کا باب کھلا اور بند ہوگیا''[1] ۔

ترک سکونت ، والد کی بیماری اور انتقال :

محمد مسعود جب چھ سات سال کے تھے تو یک بارگی حکیم مرتضیٰ حسین کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور انھوں نے اچانک بہرائچ کی سکونت ترک کر کے اپنے وطن نیوتنی رہنے کا فیصلہ کر لیا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نیوتنی آ گئے ۔ مگر ان کی آشفتگی بڑھتی گئی ۔ اس وقت محمد مسعود کے بعد ان کے ہاں ایک لڑکی سیدہ بیگم (ولادت ۱۸۹۶ء) اور ایک لڑکے آفاق حسین (ولادت ۱۹۰۱ء) کی پیدائش ہو چکی تھی ۔ حکیم صاحب زیارات کے لیے ایران و عراق چلے گئے مگر طبیعت نہ سنبھلی اور واپس لوٹے تو چالیس برس کی عمر میں ۸ شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۲۸ دسمبر ۱۹۰۳ء کو ان کا انتقال ہوگیا ۔ اس وقت محمد مسعود کی عمر دس سال تھی اور یوں وہ اوائلِ عمر ہی میں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے ۔

تعلیم :

محمد مسعود کے والد انھیں اپنے نقشِ قدم پر چلانا اور طبِ یونانی و علوم اسلامی کا ماہر بنانا چاہتے تھے مگر خدا کو شاید کچھ اور منظور تھا ۔ والد کی وفات (۱۹۰۳ء) کے بعد تعلیم کا رخ بدل گیا ۔ ان کے عزیزوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا کہ تعلیمی مصارف کا بوجھ اٹھاتا اور اس مشکل وقت میں ان کی مدد کرتا اور سہارا بنتا ۔ مسعود حسن رضوی خود لکھتے ہیں :

''مالی اعانت کا کیا ذکر ، خالی مشورہ بھی کسی سے نہ مل سکا''[2]

محمد مسعود کی والدہ ہاشمی بیگم نے مردانہ ہمت کا مظاہرہ کیا اور بیوگی کے صدمے اور اس کے بعد پیش آنے والی مشکلات کو خاموشی سے برداشت کیا اور کسی کی امداد قبول نہ کی ۔

نیوتنی آنے کے بعد مسعود حسن رضوی کچھ دن تک وہاں کے لوئر پرائمری سکول میں پڑھتے رہے مگر ان کا نام داخل نہ تھا ۔ نیوتنی میں انھوں

---

۱ ۔ مسعود حسن رضوی ادیب — ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ۲۵-۴۳ ۔

۲ ۔ ہماری شاعری ، ص ۲۸۱ ۔

نے صدر اعلیٰ مولوی محمد حسن سے تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد وہ اپنی نانی اماں کے پاس آناؤ بھیج دیئے گئے جہاں انھوں نے اردو فارسی کے علاوہ عربی کی بھی تعلیم حاصل کی اور یہاں چودھری محمد ماہ ان کے استاد تھے ۔ اس کا تذکرہ انھوں نے خود بھی کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

"چودھری سید محمد ماہ صاحب ، اعلی اللہ مقامہ ، تعلقدار آناؤ ایک فرشتہ صورت اور فرشتہ سیرت بزرگ تھے . . . مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ کم عمری میں میں نے ایسے بزرگ سے فیض حاصل کیا اور کچھ دن فقہ امامیہ کی مشہور و مقبول کتاب "جامع عباسی" کا درس لینے کے لیے جناب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا ۔"[1]

مسعود حسن رضوی اردو میں شروع ہی سے تیز تھے۔ ان کی نانی کے بھائی مولوی میر عبدالعلی نے انھیں حساب بھی سکھانا شروع کیا۔ یہ بزرگ چوتھائی ، نصف ، پون ، سوا ، ڈیڑھ ، پونے دو اور ڈھائی وغیرہ کے بیسیوں پہاڑے رٹواتے تو مسعود بہت الجھتے کہ کوئی ہمیں دکان رکھنا ہے جو یہ پہاڑے یاد کریں ۔ میر عبدالعلی ہی نے مسعود کو مرثیہ خوانی بھی سکھائی[2] ۔ اناؤ میں صرف ایک ہائی سکول تھا جس میں داخلے کے لیے انگریزی کی واقفیت لازمی تھی ، اس لیے اناؤ سے تین میل کے فاصلے پر کرون نام کے ایک گاؤں میں اپر پرائمری سکول کے چوتھے درجے میں مسعود کا نام لکھوا دیا گیا جہاں سے مسعود حسن رضوی نے چوتھے درجے کا امتحان پاس کر لیا ۔ انھوں نے یہ امتحان ۲۶ فروری ۱۹۰۶ع کو پاس کیا اور اس وقت ان کی عمر ۹ سال ۷ ماہ تھی[3] ۔ مسعود حسن رضوی نے وظیفے کا امتحان بھی بڑے امتیاز سے پاس کیا جس کی بنا پر انھیں تین روپے ماہانہ وظیفہ بھی ملنے لگا ۔ اپر پرائمری

---

۱ ۔ گلستان سعید ، مرتبہ چودھری سید ابوالقاسم زیدی ، ص ۴ ۔

۲ ۔ مسعود حسن رضوی ادیب — ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۳۰۔۳۱ ۔

۳ ۔ مسعود حسن رضوی کی عمر تاریخ پیدائش کے اعتبار سے اس وقت ۹ سال ۶ ماہ ۲۷ دن بنتی ہے ۔ داخلے کے وقت شاید تاریخ ۲۶ جولائی ۱۸۹۶ع درج کی گئی ہوگی ۔

کا امتحان پاس کرنے کے بعد کرون سے تعلیمی سلسلہ ختم ہوگیا کیونکہ اس دوران اناؤ میں ورنا کیولر فائینل سکول قائم ہو چکا تھا ، اس لیے مسعود حسن رضوی وہاں داخل کر دیے گئے اور انھوں نے وہاں سے پانچویں اور چھٹی کا امتحان ۱۹۰۸ء میں فسٹ ڈویژن میں پاس کیا ۔ اس وقت ان کی عمر ۱۳ سال ۵ ماہ تھی ۔ پانچویں درجے سے ہی مسعود حسن رضوی کو شعر و شاعری کا ذوق ہوا ، خاص طور پر بیت بازی کا ۔ چنانچہ انھوں نے ایک کاپی برائے بیت بازی بنا رکھی تھی جس کا ٹائیٹل یہ تھا :

"اشعار برائے بیت بازی

محمد مسعود طالب علم درجہ پنجم مڈل سکول اناؤ

۱۵ جنوری ۱۹۰۷ء"

ڈاکٹر نیر مسعود اس بارے میں لکھتے ہیں :

"مسعود حسن اس وقت بیت بازی کے چمپئن تھے اور پوری پوری جماعتوں کو تنہا ہرا دیا کرتے تھے ۔ مشق کے لیے ایک چھوٹی سی بیاض پر اشعار لکھتے اور فرصت میں انھیں یاد کر لیا کرتے تھے۔"[۱]

اناؤ میں مسعود حسن رضوی کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا گیا تاکہ وہ دل جمعی سے تعلیم حاصل کرسکیں ۔ چنانچہ انھوں نے پانچواں اور چھٹا یعنی فائنل درجہ فسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور اب وہ گویا مڈل پاس تھے ۔ مزید تعلیم کے لیے مسعود حسن رضوی کا لکھنؤ جانا لازمی تھا مگر گھر کی مالی حالت اس قابل نہ تھی کہ انھیں لکھنؤ بھیج دیا جاتا ۔ اس آڑے وقت میں بھی ان کی والدہ ہاشمی بیگم نے ہمت نہ ہاری اور مسعود حسن کو لکھنؤ بھیجنے کا فیصلہ کیا ۔ مسعود حسن اپنی نانی کے بھائی میر عبدالعلی ، جن سے مسعود حسن نے حساب اور مرثیہ خوانی سیکھی تھی ، کے ساتھ لکھنؤ آ گئے ۔ طے یہ پایا تھا کہ مسعود حسن رضوی کسی مسجد کے حجرے میں قیام کریں گے مگر خوش قسمتی سے میر عبدالعلی کی ایک رشتہ دار خاتون سکینہ بیگم کے ہاں انھیں رہنے کی جگہ مل گئی ۔ لکھنؤ میں مسعود حسن نے حسین آباد ہائی سکول میں داخلہ لیا ۔ مسعود حسن اس سکول میں پانچ سال تک رہے اور اپنی محنت

---

۱ ۔ مسعود حسن رضوی ادیب — ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۲۰۔

اور لگن سے بہت جلد ان کا شمار سکول کے بہترین طالب علموں میں ہونے لگا۔ ڈاکٹر نیر مسعود سکول کے اس پانچ سالہ قیام کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"مڈل پاس طلبہ کو ہائی سکول کرنے کے لیے پہلے دو درجے اسپشل اے (ہائی سکول کے تیسرے ، چوتھے اور پانچویں درجے کے برابر) اور اسپیشل بی (ہائی سکول کے چھٹے ، ساتویں درجے کے برابر) پاس کرنا ہوتے تھے۔ اس کے بعد آٹھواں ، نواں اور دسواں درجہ پاس کر کے ہائی سکول سرٹیفکیٹ ملتا تھا ۔"[1]

گویا مسعود حسن رضوی کو ، جو اُردو پاس تھے، انگریزی کی کلاسیں پھر سے پاس کرنا پڑیں - ۱۹۰۸ء میں داخلے کے بعد مسعود حسن رضوی نے یہ سب درجے امتیازی حیثیت سے پاس کیے ۔ اس کا اندازہ اس تفصیل سے بھی لگایا جا سکتا ہے ۔ مارچ ۱۹۱۱ء میں جب مسعود حسن آٹھویں درجے میں تھے تو ایک انگریز انسپکٹر آف سکولز مسٹر ای ۔ اے رچرڈسن سکول کے معائنے کے لیے آئے اور آٹھویں جماعت کو انھوں نے ایک اقتباس انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لیے دیا ۔ انھوں نے جو رپورٹ لکھی وہ یوں تھی :

I tested class VIII B in a piece of unseen translation from Urdu into English ...... only one boy, S. Mohd Masud, showed a really satisfactory command of correct and Idiomatic English." (4-5-11)

یہ رپورٹ ڈاکٹر نیر مسعود کے بقول :

"۴۔ اپریل کو اسکول کے ہیڈ ماسٹر مرزا حبیب حسین نے اپنے دستخط کے ساتھ مسعود کو دے کر کہا کہ اس کو احتیاط سے رکھنا ۔ اس سے بہتر سرٹیفیکٹ تمھیں نہیں مل سکتا ۔"[2]

جیسا کہ سرٹیفکیٹ سے ظاہر ہوتا ہے ہیڈ ماسٹر نے مسعود حسن رضوی کو یہ سرٹیفکیٹ ۴۔ مئی کو جاری کیا ۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے ۴ ۔ اپریل کی تاریخ بھول کر درج کی ہے ۔

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب — ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۳۸۔

۲۔ ایضاً ۔

اپریل میں مسعود حسن کے سر کے اندر ایک قیامت برپا ہو گئی اور ان پر دردِ سر کا شدید حملہ ہؤا اور بقول خود :

''مشیتِ ایزدی نے میرے قوائے ذہنی کی ڈاک گاڑی میں دردِ سر کا ''بریک'' لگا دیا ۔''[1]

اس صورتِ حال میں مسعود حسن کے لیے تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا چنانچہ انھوں نے اس یقین کے باوجود کہ ان کا ایک سال ضائع ہو جائے گا ، ۸۔ اپریل ۱۹۱۱ء کو چھٹی کی درخواست دے دی ۔ اس کا جواب ہیڈ ماسٹر نے ۱۳۔ اپریل ۱۹۱۱ء کو دیا اور مسعود حسن کی درخواست منظور کرتے ہوئے لکھا :

"His record showing that he secured marks of 1st division, he is exempted from appearing in the examination and will be noted as passed creditably and promoted to the higher class."

یوں مسعود حسن کو ان کی سابقہ کارکردگی اور اعلیٰ تعلیمی قابلیت کی بنا پر اگلی جماعت میں بغیر امتحان کے ترقی دے دی گئی ۔ ہائی سکول میں ان کے مضامین انگریزی ، حساب ، تاریخ ، جغرافیہ ، فارسی ، عربی اور اردو تھے ۔ اردو کے علاوہ انھیں فارسی سے خاصی رغبت تھی اور انھوں نے فارسی میں بے پناہ قابلیت حاصل کرلی تھی ۔ اس کا ثبوت ان کے اُستاد سید ابوالحسن پرشین ٹیچر کے اس سرٹیفکیٹ سے ملتا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں :

'' اس کی فارسیت کے متعلق صرف یہ کہنا کہ مسلسل پانچ سال تک اپنے کلاس میں اول رہا ، اس کی واقعی قابلیت کے اظہار سے صریحاً چشم پوشی ہوگی ، جب کہ فارسیت میں اس نے ایک خاص مذاق اور مہارت حاصل کرلی ہو ، البتہ یہ مجاز ایک حد تک بے حقیقت نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ اس نے فارسی کو اپنی زبان بنا لیا تھا ۔''

حسین آباد ہائی سکول سے مسعود حسن رضوی نے ۱۹۱۷ء میں میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا ۔ اس وقت ان کی عمر ۱۸ سال ۹ ماہ تھی ۔ اس سرٹیفکیٹ میں خاص بات یہ ہے کہ مسعود حسن رضوی کا نام محمد مسعود کی

۱۔ ہماری شاعری ، ص ۲۸۱-۲۸۲ ۔

بجائے سید مسعود حسن لکھا ہوا ہے۔ اور یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ میٹرک کے امتحان کا فارم پُر کرتے وقت انھوں نے خود ہی یہ تبدیلی کر دی تھی۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے بھی اس کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے:

"دراصل ان کو اپنا نام شروع سے ہی ناپسند تھا۔ ان کے والد، چچا اور دوسرے بزرگوں کے نام "حسن" یا "حسین" پر تھے۔ ان ناموں کے بیچ محمد مسعود انھیں بے جوڑ لگتا تھا۔ اس پر وہ کئی بار ماں سے الجھ چکے تھے کہ ان کا نام محمد مسعود کیوں رکھا گیا۔ آخرکار انھوں نے اپنا نام بدل ہی لیا اور ہائی اسکول کا امتحان اسی نئے نام سے دیا۔"[۱]

مسعود حسن رضوی میٹرک پاس کرنے کے بعد اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتے تھے مگر خانگی حالات خاص طور پر اقتصادی حالت ایسی نہ تھی کہ تعلیم کا سلسلہ جاری رہ سکتا۔ چنانچہ وہ ملازمت کے لیے تیار ہوگئے، مگر ہاشمی بیگم کسی طرح بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہ ہوئیں اور بالآخر مسعود حسن نے کیننگ کالج لکھنؤ میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لے لیا۔ ان کے مضامین انگریزی ادبیات، منطقِ استخراجیہ، فنِ تعلیم، فزیالوجی، فارسی اور جدید تاریخ تھے۔ انھوں نے ۱۹۱۵ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور پھر اسی کالج میں بی۔ اے میں داخلہ لے لیا، اور شیعہ بورڈنگ ہاؤس میں رہائش پذیر ہوگئے جہاں علی عباس حسینی پہلے سے قیام پذیر تھے۔ بی۔ اے میں انگریزی، فلسفہ اور فارسی ان کے مضامین تھے۔ ۱۹۱۷ء میں انھوں نے بی۔ اے کا امتحان بھی سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ سکول کی طرح کالج میں بھی ان کا شمار ہونہار اور ذہین طلبہ میں ہوتا تھا۔ کالج کے پرنسپل مسٹر کیمرن کے عطا کردہ سرٹیفکیٹ سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

"He won Canning College scholarship and in every single terminal examination he acquitted himself well in each subjects. His success in all, more creditable to him......I recommend him as an mondustrious student usually intelligent and well qualified in his subjects of study.

(14.2.1917)

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب — ذات و صفات، مرتبہ مالک رام، ص ۵۳۔

بی - اے کرنے کے بعد مسعود حسن نے ایم - اے کرنے کا فیصلہ کیا - اس مرحلے پر انھیں فارسی اور انگریزی میں سے کسی ایک مضمون کا انتخاب کرنا تھا - چونکہ فارسی کے ساتھ ساتھ ان کی انگریزی شروع سے قابلِ رشک تھی اس لیے انھوں نے ایم - اے انگریزی کے لیے سالِ اول میں داخلہ لے لیا - ایک سال تک انگریزی ادبیات کی تعلیم حاصل کرتے رہے مگر ہیضے کے حملے کی بنا پر امتحان میں شرکت نہ کی - خود لکھتے ہیں :

"بیماری نے ضعف و نقاہت کی تصویر بنا کر رکھ دیا اور اب اتنا دم نہ تھا کہ محنت کر کے امتیازی کامیابی حاصل کر سکوں - نہ یہ گوارا تھا کہ تیسرے درجے میں پاس ہو کر چلتے چلاتے اپنی طالب علمانہ نیک نامی کو داغ لگاؤں -"[۱]

یہ بات واقعی درست بھی تھی - جس طرح پروفیسر کیمرن کے سرٹیفکیٹ سے پتہ چلتا ہے اسی طرح ان کے ایک استاد پروفیسر سی - ایف - براؤن نے بھی ان کی انگریزی کی قابلیت کو سراہا ہے - وہ لکھتے ہیں :

"He writes and speaks English fluently and has a very good knowledge of the language."

(14.12.1917)

مسعود حسن کو اگرچہ رول نمبر مل چکا تھا مگر وہ امتحان میں شریک نہ ہوئے - یہ ۱۹۱۸ع کی بات ہے - خانگی حالات کی بنا پر انھیں ملازمت[۲] کرنا پڑی مگر چونکہ تعلیم کا شوق تھا اس لیے وہاں سے ساڑھے نو مہینے کی رخصت لے کر ۱۹۲۲ع میں ال ٹی کی سند ٹیچرس ٹریننگ کالج الہ آباد میں داخل ہو کر حاصل کی - مرزا جعفر حسین اور ڈاکٹر نیر مسعود دونوں نے سند حاصل کرنے کا سنہ ۱۹۲۱ع لکھا ہے مگر سرٹیفکیٹ پر ۱۹۲۲ع درج ہے اور یہی صحیح ہے - مسعود حسن نے چونکہ بی - اے کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیا تھا اس لیے انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے رجسٹرڈ گریجویٹس کا اجازت نامہ حاصل کیا اور اس طرح الہ آباد یونیورسٹی سے لکھنؤ یونیورسٹی مائیگریشن

---

۰۱ ہماری شاعری ، ص ۲۸۲ -

۰۲ ملازمت کا ذکر تفصیل سے آگے آئے گا -

کرا لی اور یہاں سے ۱۹۲۵ء میں ایم ۔ اے فارسی کا امتحان اول درجے میں پاس کیا اور یونیورسٹی بھر میں اول آنے پر گولڈ میڈل حاصل کیا ۔ یہ آخری ڈگری مسعود حسن نے ۳۲ سال کی عمر میں حاصل کی ۔

ملازمتیں :

مالی مشکلات کی وجہ سے مسعود حسن کو دورانِ تعلیم ملازمت کرنا پڑی اور انھوں نے ملازمت کے دوران ہی تعلیم مکمل کی ۔ میٹرک کا امتحان دینے کے بعد چند ماہ کی چھٹی تھی ، چنانچہ مسعود حسن کو حصولِ معاش کی فکر تھی ۔ ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں :

" افیون کے محکمے میں ایک اسامی خالی تھی ۔ ایک کرم فرما نے وہاں ملازم رکھوا دیا ۔ پندرہ روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی ۔ یہ لکھنؤ کے اوپیم ایجنٹ کا دفتر تھا جہاں حکومت کی طرف سے افیون کی خریداری ہوتی تھی ۔ مسعود اور دوسرے اہل کار رجسٹر پر اندراج کرتے جاتے ۔ کاشتکار کے نام ، افیون کے وزن اور قیمت وغیرہ کا بھی اندراج ہوتا ۔ مسعود کا کام دوسروں کے مقابلے میں ہلکا تھا اور ان کو جلدی چھٹی ہو جاتی تھی ۔ لیکن انھیں ایجنٹ کے بالکل قریب بیٹھنا اور اس سے براہِ راست رابطہ رکھنا ہوتا تھا ۔ اس محکمے میں مسعود نے چوبیس دن ملازمت کر کے بارہ روپے کمائے ۔ اس کے بعد اس سے دگنی تنخواہ پر یعنی ۳۰ روپے ماہوار پر (لکھنؤ) کچہری میں ملازمت مل گئی ۔ یہ انگریزی نقل نویس کی اسامی تھی ۔"[1]

کالج میں داخلہ لینے کے لیے مسعود حسن نے یہ ملازمت چھوڑ دی ۔ یہ ۱۹۱۳ء کی بات ہے ۔ ۱۹۱۸ء میں جب ہیضے کے حملے کی وجہ سے مسعود حسن ایم ۔ اے انگریزی سالِ اول کا امتحان نہیں دے سکے تھے اور بڑے مایوس اور افسردہ تھے تو اسی دوران محکمۂ تعلیم کی طرف سے ایک نئی جگہ نکلی ۔ یہ محکمے کے کیٹیلاگ ڈیپارٹمنٹ میں مبصر (Reviewer) کی جگہ تھی ۔ مسعود حسن رضوی کے اپنے قول کے مطابق :

"جس کا کام یہ تھا کہ ہر سہ ماہی میں اس صوبے میں جتنی کتابیں چھپیں اس کی فہرست تمام ضروری تفصیلوں کے ساتھ مرتب کر کے صوبے کے

۱- مسعود حسن رضوی ادیب — ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۵۳-۵۴ ۔

سرکاری اخبار ''یو ۔ پی گورنمنٹ گزٹ'' میں شائع کی جائے ۔ اور جمہور کے خیالات کا رجحان دریافت کرنے کی غرض سے کتابوں پر تبصرے لکھ لکھ کر اس رپورٹ کے لیے سامان فراہم کیا جائے جو سررشتۂ تعلیم کے ڈائریکٹر کو ہر سال گورنمنٹ کے پاس بھیجنا پڑتی ہے ۔''[۱]

مسعود حسن نے بھی درخواست دے دی اور ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن سے ملے جو انگریز تھا ۔ ڈاکٹر نیر مسعود اس کی تفصیل لکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں :

" اس نے کہا کہ آپ کو یہاں پڑھنا بہت پڑے گا ۔ مسعود نے کہا مجھے مطالعے سے زیادہ کوئی شے محبوب نہیں ۔ میں تو انگریزی ادب میں ایم ۔ اے کرنے والا تھا ۔ دراصل اس ملازمت میں میرے لیے سب سے بڑی کشش مطالعے ہی کی ہے ۔ ڈائریکٹر نے پوچھا کیا آپ یہاں جم کر کام بھی کر سکیں گے ۔ مسعود نے جواب دیا اس کا اندازہ تو کچھ دن کام کرنے کے بعد ہی ہو سکے گا ۔ ڈائریکٹر بولا "A good answer" ۔''[۲]

اس ملاقات کے بعد ہی، جو ایک طرح کا انٹرویو تھا ، اپریل ۱۹۱۸ء میں مسعود حسن کا تقرر ہوگیا ۔ ساڑھے تین سال تک اس اسامی پر کام کرنے کے دوران ہی انہوں نے ۱۹۲۲ء میں ال ٹی کی سند حاصل کی اور جولائی ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ ہائی سکول فتح گڑھ میں ان کا تقرر ہوگیا ۔ اسی اثنا میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے جونیر لیکچرر کی اسامی نکلی تو انہوں نے بھی درخواست دے دی اور انٹرویو کے لیے بھی پیش ہوئے ۔ ڈاکٹر نیر مسعود اس بارے میں لکھتے ہیں :

" یونیورسٹی کے ایک ذمہ دار نے ان سے سوال کیا ۔ کیا آپ شاعر ہیں ؟ مسعود نے جواب دیا اگرچہ میں نے کبھی کبھار ایک آدھ شعر موزوں کر لیا ہے تاہم میں باقاعدہ شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا ۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اردو ادب کے معلم کے لیے اچھا شاعر ہونا اتنا ضروری نہیں

۱- ہماری شاعری ، ص ۲۸۴ ۔

۲- مسعود حسن رضوی ادیب — ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۶۳-۶۵ ۔

جتنا شاعری کا اچھا نقاد ہوتا ۔ اور وہ میں ہوں" ...... اس زمانے میں اردو صرف ہائی سکول تک کے نصاب میں شامل تھی ، اس وجہ سے اردو لیکچرر کے لیے ملازمت کے کوئی باضابطہ مقرر شدہ شرائط نہ تھے اس لیے اس جگہ تین سو کے قریب اُمیدواروں نے درخواستیں دی تھیں جن میں مولانا عبدالحلیم شرر اور مولانا صفی لکھنوی کے علاوہ لکھنؤ اور بیرون جات کے متعدد اساتذۂ فن بھی شامل تھے ۔"[۱]

جونیر لیکچرر کی اس اسامی پر مسعود حسن کا سلیکشن اور تقرر ہو گیا حالانکہ ٹیچری میں ان کا مستقبل خاصا روشن تھا اور جس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں :

" اُس وقت صوبہ متحدہ کے سرکاری ہائی سکولوں میں کوئی مسلمان ٹیچر تنخواہ کے اعتبار سے مجھ سے سینئر نہ تھا اس لیے ہیڈ ماسٹری آنکھوں کے سامنے تھی جس کا گریڈ اس وقت ۲۵۰-۲۵-۸۰۰ تھا اور اس کے بعد بھی سررشتۂ تعلیم ہی میں ترقی کے دوسرے راستے کھلے ہوئے تھے ۔"[۲]

لیکن مسعود حسن نے لکھنؤ اور اردو سے دلچسپی کی بنا پر ایثار کرتے ہوئے فتح گڑھ ہائی سکول میں صرف چالیس دن نوکری کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں جونیر اردو لیکچرر کے طور پر کام شروع کر دیا ۔

یقینی بات ہے کہ اساتذۂ فن کے مقابلے میں ایک ناتجربہ کار نوجوان کی تقرری بزرگوں کو ناگوار گذری ہوگی اور اس پر اخبارات میں احتجاج بھی ہوا ہوگا اور یونیورسٹی کے کارپردازان کو مراسلے بھی لکھے گئے ہوں گے ۔ اس سلسلے میں مجھے کوئی دستاویز نہیں مل سکی البتہ ڈاکٹر نیر مسعود نے اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے :

" اس تقرری کے خلاف خاصا احتجاج ہوا ۔ اخبارات میں مراسلے شائع ہوئے اور یونیورسٹی کو شکایت نامے ارسال کیے گئے کہ اکابر ادب کو چھوڑ کر ایک گمنام نوجوان کو یونیورسٹی میں لیکچرر بنا دیا گیا ہے ۔

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب — ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۶۴ - ۶۵ ، ۷۲-۷۳ ۔

۲ ہماری شاعری ، ص ۲۸۳ ۔

ایگزیکٹو کونسل میں جب اس تقرری کی توثیق کا مسئلہ آیا تو وائس چانسلر نے برملا کہا کہ ہم نے یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوشی کی عمر پار کرنے والے حضرات کی بجائے ایک حوصلہ مند اور باصلاحیت نوجوان کو منتخب کیا ہے جس سے ہم کو بہت توقعات ہیں۔"۱

یوں مسعود حسن رضوی نے ۲۹ سال کی عمر میں یونیورسٹی میں درس و تدریس کا کام شروع کردیا۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں :

"۲۵-۱۹۲۴ء میں کوئی ڈیڑھ برس فارسی کے سینئر لیکچرر کی قائم مقامی کی اور اسی زمانے میں ایم۔ اے فارسی کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ لیکن جب فارسی کے لیکچرر کی جگہ میری مستقلی کا مسئلہ پیش ہوا تو خود درخواست دے کر میں اپنی پہلی جگہ پر واپس آ گیا۔ جونیر لیکچرر کا گریڈ ۲۰۰-۲۵-۳۵۰ اور سینئر لیکچرر کا گریڈ ۲۵۰-۲۵-۵۰۰ تھا۔ لیکن مقصدِ زندگی تو اُردو کی خدمت تھا اس لیے ایک دفعہ پھر مستقل مالی نقصان برداشت کر لیا۔ یونیورسٹی کی ملازمت کو ابھی صرف چار سال ہوئے تھے کہ اکتوبر ۱۹۲۶ء سے حسنِ خدمت کے صلے میں مجھ کو تنخواہ کے علاوہ پچیس روپے ماہوار بھتہ (پرسنل الاؤنس) ملنے لگا۔ اگست ۱۹۲۷ء میں اردو کے سینئر لیکچرر کی ایک نئی جگہ نکلی اور اس جگہ پر میرا تقرر ہوگیا۔ اس کے تین سال بعد فارسی کے ریڈر اور شعبۂ فارسی و اردو کے صدر کی جگہ خالی ہوگئی جس کا گریڈ ۵۰۰-۵۰-۸۰۰ تھا اور اگست ۱۹۳۰ء میں اس جگہ پر میرا تقرر عمل میں آیا۔"۲

مسعود حسن رضوی کے اس تقرر پر اخبارات میں بہت کچھ مخالفانہ انداز میں لکھا گیا اور پوسٹر بھی شائع کیے گئے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ مسعود حسن رضوی کے رفقائے کار میں ایک صاحب پروفیسر عبدالقوی فانی تھے جو ریڈرشپ اور صدارتِ شعبہ کے امیدوار تھے مگر اس کے لیے مسعود حسن رضوی کا انتخاب کیا گیا۔ چنانچہ اس انتخاب کے حوالے سے مسعود حسن

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب — ذات و صفات، مرتبہ مالک رام، ص ۴۲۔

۲۔ ہماری شاعری، ص ۸۵-۳۸۴۔

رضوی کے خلاف اور عبدالقوی فانی کے حق میں بہت کچھ لکھا گیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے روزنامہ "ہمت"[1] لکھنؤ کی ۲۳- مارچ ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں ایک صاحب سید مشیرالدین سابق منیجر "ہمدم" کا ایک طویل مضمون صفحہ ۲ اور ۷ پر شائع ہوا جس کا عنوان تھا "لکھنؤ یونیورسٹی میں حق تلفیاں" اس مضمون میں تقرری کے سلسلے میں اردو اور فارسی کے لیکچرر اور ریڈر کے بارے میں کی گئی حق تلفیوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ یہاں صرف وہ حصے نقل کیے جاتے ہیں جو ہمارے موضوع سے متعلق ہیں۔ مضمون نگار لکھتا ہے:

"ریڈر ان پرشین کے انتخاب کی حقیقت:

ریڈر ان پرشین کا انتخاب گذشتہ اگست میں ہوا مگر جون ہی کے مہینے سے سننے میں آتا تھا کہ فانی صاحب کو باوجود اپنے ۱۶-۱۷ سال تعلیمی تجربے کے، جس میں وہ بی۔ اے، ایم۔ اے اور ریسرچ کے فارسی درجوں کو تعلیم دیتے رہے، یہ جگہ نہ ملے گی۔ بلکہ اردو لیکچرر کا اس پر تقرر ہوگا جو فانی صاحب سے جونیر ہیں اور جن کی پشت پناہی پر باثر ہستیاں ہیں۔ ہمیں تعجب ہے کہ وائس چانسلر صاحب نے زیادہ قابل اور زیادہ تجربہ کار لوگوں کو کیسے نظرانداز کیا؟ اگر فانی صاحب اس قابل نہ تھے کہ وہ اس جگہ پر مقرر کیے جائیں تو کیا ڈاکٹر زبید احمد و سعید احمد صاحبان بھی جو ایم۔ اے سے کہیں زیادہ بلند پایہ ڈگری، یعنی پی ایچ۔ ڈی وغیرہ کی سند رکھتے تھے، اس جگہ کے قابل نہ تھے؟ آخر یہ کیوں نظرانداز کیے گئے۔

پرشین ڈیپارٹمنٹ کے لئے ریڈر مسٹر رضوی کی قابلیت اور فانی صاحب کی نااہلیت:

اس سے پیشتر جو صاحب ریڈر ان پرشین تھے وہ علاوہ پی ایچ۔ ڈی ہونے کے عربی اور فارسی دونوں میں ماہر تھے اور ان کی وجہ سے ڈیپارٹمنٹ کا بڑا اعزاز تھا۔ ممکن ہے کہا جائے کہ نئے ریڈر مسعود حسن صاحب رضوی جو کل تک اردو کے لیکچرر تھے اور اردو صرف بی۔ اے تک پڑھاتے تھے،

۱- متعلقہ مضمون موجود ہے۔

۱۹۲۹ء[1] میں پرائیویٹ فارسی کا ایم۔اے لکھنؤ یونیورسٹی سے اول درجے میں پاس کیا ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا فانی صاحب کا ۱۶-۲۰ سالہ تعلیمی تجربہ، جس میں وہ بی اے، ایم اے اور ریسرچ سکالرس کو تعلیم دیتے رہے (مارس کالج ناگپور میں عربی کی تعلیم بھی انھی سے متعلق تھی) اور ان کی دوسری قابلیتیں اس قابل نہ تھیں کہ اس اول درجے کے مساوی قرار پاتیں؟ ہم یہ جانتے ہیں کہ فانی صاحب کے پاس اول درجے کی ڈگری نہیں ہے۔ آپ نے اس زمانے میں ڈگری لی ہے جب کہ اس صوبے میں صرف ایک یونیورسٹی الہ آباد کی تھی جو اپنے امتحان کی سختیوں میں ایک عالمگیر شہرت رکھتی تھی اور اول و دوم درجہ عنقا کا حکم رکھتا تھا۔ آج کل کی سی آسانیاں نہ تھیں کہ ہر سال اس صوبے کی ۵ یونیورسٹیوں سے درجنوں اول نمبر اور ہزاروں دوم نمبر پاس ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اتنی مدت میں فانی صاحب نے نہ معلوم فارسی کے موجودہ ریڈر ایسے اپنے کتنے شاگرد اول درجے کے ایم اے بنا کر نکال دیے ہیں۔ فانی صاحب کے اتنے وسیع تجربے، ان کی مسلمہ قابلیت اور سن کا لحاظ کرتے ہوئے اب ان کے مقابلے میں اول درجے کے نوسکھیا ایم اے کو لانا اور مولانا صاحب پر ترجیح دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ ڈاکٹر چکرورتی سابق وائس چانسلر نے فانی صاحب کا تجربہ اور وسیع علمی قابلیت دیکھ کر آپ کا انتخاب کیا تھا، نہ کہ آپ کی ڈگری کا درجہ دیکھ کر۔ ہمیں معلوم ہے کہ بعض دوسری یونیورسٹیوں نے آپ کی خدمات سے مستفید ہونا چاہا تھا مگر وہ لکھنؤ وطن ہونے کی وجہ سے یہاں کی موہوم امیدوں پر پڑے رہے۔ مسٹر ہرونوگ نے بھی انھیں کئی بار بلایا تھا۔ برخلاف اس کے مسعود صاحب نے جامعہ عثمانیہ میں اردو پروفیسری کے لیے سرتوڑ کوششیں کیں۔ خود بنفس نفیس حیدرآباد تشریف بھی لے گئے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر مسلم یونیورسٹی میں اردو ریڈری کے لیے انتہائی زور لگایا مگر وہ جگہ بھی نہ ملی۔ خدا کی دین ہے اردو پڑھاتے پڑھاتے گھر بیٹھے فارسی کی ریڈری مل گئی۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے

۱- مسعود حسن رضوی نے ایم۔ اے فارسی کا امتحان ۱۹۲۵ء میں پاس کیا۔

خدا سب کو ایسا ہی خوش نصیب کرے - جس کو دوسری جگہ اردو کی ریڈری نہ ملتی ہو وہ لکھنؤ میں فارسی کا ریڈر ہو جائے اور جو عمر بھر فارسی کا ہو رہے اسے کوئی نہ پوچھے -"

آخر میں "ایک واجبی درخواست" کے عنوان سے لیجسلیٹو کونسل کے ممبران سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ ان سوالات کو کونسل کے اجلاس میں پیش کریں جن میں سے ایک سوال یہ تھا :

"کیا یہ صحیح ہے کہ موجودہ ریڈر فارسی اگست ۱۹۳۰ء تک محض اردو لیکچرر تھا اور بی اے تک اردو پڑھاتا تھا اور اس نے بحیثیت جونیر لیکچرار کے ملازمت شروع کی تھی اور ۱۹۲۷ء میں وہ لیکچرار ہوا تھا ؟"

الٰہی محمد مشیر الدین نے انگریزی میں "A clarion call from the Lucknow University" کے نام سے ۹ فل سکیپ صفحات پر مشتمل ایک سائیکلوسٹائل پمفلٹ[۱] بھی شائع کیا جس پر "Go Back Simon—To Pre Morley Days" کے الفاظ بھی درج ہیں - اس پمفلٹ میں تقریباً وہی باتیں لکھی گئی ہیں جو "ہمت" لکھنؤ کی ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں تھیں -

اسی سلسلے میں "الناظر" لکھنؤ جلد ۲، ماہ جنوری ۱۹۱۹ء، ص ۴۸-۵۵ کے مندرجات کو، جس کا عنوان ہے "سید علی ظہیر صاحب اُمیدوار انتخاب کونسل یو - پی کے والد بزرگوار جسٹس وزیر حسن بالقابہ سابق سیکرٹری مسلم لیگ کے نام نہاد عظیم الشان قومی کارناموں کی حقیقت" دوبارہ اشتہار کی صورت میں چھاپا گیا ہے اور اس کی پشت پر "کیا یہ تعصب نہیں ہے؟" کے عنوان سے ایک خط[۲] شائع ہوا ہے جو پہلے صفحے سے متعلق ہے مگر اس میں ریڈران پرشین کی تقرری کے سلسلے میں بھی لکھا گیا ہے - یہ ایک خط کی صورت میں ہے - اس کے متعلق اقتباسات درج کیے جاتے ہیں :

"(۱) لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک سب سے بڑا عہدہ ریڈر ان پرشین (مدرس اعلیٰ فارسی) کا ہے - اس عہدے پر ڈاکٹر بذل الرحمٰن ایم اے، پی ایچ ڈی،

---

۱ - پمفلٹ موجود ہے -

۲ - اشتہار موجود ہے -

ایم - آر - اے ایس فائنز تھے - ان کے اسلامیہ کالج بمبئی کے پرنسپل مقرر ہونے کے بعد یہ جگہ خالی ہوئی تو حسبِ قاعدہ اشتہار دیا گیا - اشتہار کے جواب میں جو درخواستیں آئیں ، ان میں ڈاکٹر زبیدہ احمد ایم اے، پی ایچ ڈی ، منشی فاضل، ملا فاضل لیکچرار فارسی الہ آباد یونیورسٹی اور ڈاکٹر سعید ایم اے، پی ایچ ڈی کی درخواستیں بھی تھیں - مگر ان دونوں کی درخواستوں کو اس بنا پر نامنظور کر دیا گیا کہ یہ دونوں لکھنؤ یونیورسٹی کے سٹاف میں نہ تھے اور ریڈر کی جگہ سررشتہ کی ترقی کے قاعدے سے انھی لوگوں کو ملنا چاہیے تھی جو پہلے یونیورسٹی میں ملازم تھے- لیکن اس لحاظ سے اس جگہ کے مستحق مسٹر عبدالقوی فانی ایم اے لیکچرار فارسی لکھنؤ یونیورسٹی تھے - ان کے استحقاق کی وجہ یہ تھی کہ وہ ڈاکٹر بذل الرحمٰن صاحب کے جانے کے بعد ریڈر ان پرشین کا کام قائم مقام کی حیثیت سے انجام دے چکے تھے - فانی صاحب کی قابلیت، اعلیٰ سیرت ، عام ہمدردی اور علمی تحقیقات کے حقیقی شوق کا لکھنؤ یونیورسٹی میں ہر شخص قائل ہے - اس لیے یہ قطعی یقین کیا جاتا تھا کہ اگر سررشتہ کی ترقی کے اصول پر کسی لکھنؤ یونیورسٹی کے ملازم ہی کو ریڈران پرشین مقرر کیا گیا تو یہ عہدہ فانی صاحب کو مستقل دیا جائے گا - لیکن جسٹس وزیر حسن صاحب کی نوازش سے ڈاکٹر زبید احمد ، ڈاکٹر سعید اور فانی صاحب تینوں کے بدلے لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک شعبۂ اردو لیکچرار ریڈران پرشین بنائے گئے"۔

اسی طرح ۹- اپریل ۱۹۳۱ء کے "اودھ اخبار"[1] میں "لکھنؤ یونیورسٹی میں خونِ ناحق" کے عنوان سے عبدالقدیر قدیر مہونوی نادان محل لکھنؤ کا ایک مراسلہ شائع ہوا - مراسلہ نگار لکھتے ہیں :

"جناب ڈاکٹر بذل الرحمٰن صاحب ہیڈ پرشین ڈیپارٹمنٹ یونیورسٹی لکھنؤ کا تبادلہ بعہدۂ پرنسپل ہونے پر خیال تھا کہ ان کی جگہ پر مولانا عبدالقوی صاحب فانی ایم اے علیگ لیکچرار پرشین ڈیپارٹمنٹ یونیورسٹی لکھنؤ کا تبادلہ ہوگا - مگر یہ معلوم ہوکر نہایت تعجب، حیرت اور افسوس ہوا کہ بجائے مولانا موصوف کے مولانا مسعود صاحب ایم اے لیکچرر

---

۱ - موجود ہے -

اردو ڈیپارٹمنٹ کا تقرر عمل میں آیا ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ انتخاب کہاں تک حق بجانب ہے ۔"

اس کے بعد عبدالقوی فانی کے اسبابِ استحقاق کے طور پر پانچ پوائنٹ درج ہیں اور آخر میں مراسلہ نگار نے لکھا ہے :

"پس ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بجائے مولانا عبدالقوی فانی صاحب کے مولانا مسعود صاحب کا بعہدہ ہیڈ پرشین ڈیپارٹمنٹ تقرر لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک بے گناہ کا خونِ ناحق ہے" ۔

یہ سب مضمون ، پمفلٹ ، خط اور مراسلے مسعود حسن کی تقرری کے خلاف لکھے گئے ۔ ان سب کے جواب میں مرزا محمد جعفر حسین تمکین ایڈوکیٹ کا ایک طویل مضمون "سرفراز"[۱] لکھنؤ کی ۹ جون ۱۹۳۱ع کی اشاعت میں شائع ہوا جس کا عنوان تھا "لکھنؤ یونیورسٹی میں انصاف" اس مضمون میں ترتیب وار مسعود حسن پر لگائے گئے الزامات اور عبدالقوی فانی کے استحقاقیہ دعووں کا جواب دیا گیا ہے ۔ اس میں سے چند اقتباسات یہاں درج کیے جاتے ہیں ۔ عبدالقوی فانی کی قابلیت و اہلیت کا جو ذکر کیا گیا تھا ، مضمون نگار نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے :

"فارسی زبان و ادب کے متعلق فانی صاحب کے خدمات کیا ہیں ؟ ذرا ہم بھی تو سنیں ۔ لے دے کے قانی پر ایک مضمون لکھا تھا ۔ جب ریڈری کے لیے رضوی صاحب سے مقابلہ کرنا پڑا اور ان کے کثیر التعداد مضامین و تالیفات کے مقابلے میں اپنے یہاں سناٹا دکھائی دیا تو اسی ایک مضمون کے ستر ٹکڑے کر کے جلدی جلدی ہندوستان بھر کے اردو رسائل میں بانٹ دیئے ۔ یہ مضمون بھی پڑھے لکھوں کی جماعت میں قابلِ التفات نہیں سمجھا گیا بلکہ اس نے فانی صاحب کی قابلیت کی اور بھی قلعی کھول کر رکھ دی ۔ رضوی صاحب کا ذوقِ تحقیق البتہ مسلم ہے" ۔

جسٹس سید وزیر حسن کی جس شیعہ نوازی کا ذکر مخالفین نے کیا تھا

---

۱ ۔ موجود ہے ۔

اس کا جواب مضمون نگار نے یوں دیا ہے :

"اگر آپ کہیں کہ جسٹس بشیشر ناتھ صاحب اور جسٹس سید وزیر حسن صاحب ، جو بقول آپ کے یونیورسٹی کے اصل حکمران ہیں اور شیعہ نوازی کے جوش میں ایمان و انصاف کا خون کرنے کے عادی ہیں ، ان کی حمایت سے رضوی صاحب کا تقرر صرف شیعہ ہونے کی بنا پر ہوگیا ، تو یہ سفید جھوٹ ہوگا ۔ میں نے اس معاملے میں خوب تحقیق کی ہے ۔ حقیقتِ حال مجھ سے سنیے، جسٹس بشیشر ناتھ صاحب، ریڈر کا انتخاب کرنے والی کمیٹی کے ممبر ہی نہیں ۔ جسٹس سید وزیر حسن صاحب بھی کمیٹی کی اس میٹنگ میں شریک نہ تھے جس میں ریڈر فارسی کا انتخاب ہوا تھا" ۔

عثمانیہ یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی میں مسعود حسن کی ناکامی کے الزامات کا جواب دیتے ہوئے مضمون نگار لکھتا ہے :

"رضوی صاحب کا ان دونوں جگہوں کے لیے درخواست دینا صحیح ہے مگر انتہائی کوششیں کرنا صحیح نہیں ۔ یہ سچ ہے کہ وہ حیدر آباد تشریف لے گئے تھے مگر کب ؟ جب وہاں کی سلیکشن کمیٹی نے انٹرویو (ملاقات) کے لیے طلب کیا ۔ ملحوظ رہے کہ تمام امیدواروں میں صرف رضوی صاحب ہی اس موقع پر بلائے گئے تھے اور اگر ان کا تقرر نہیں ہوا تو کسی دوسرے امیدوار کا بھی تقرر نہیں ہوا بلکہ خود سلیکشن کمیٹی کے ایک نہایت ممتاز معمر اور ذی اثر ممبر مولوی عبدالحق صاحب سابق پرنسپل اورنگ آباد کالج کو یہ جگہ دی گئی ۔ انصاف سے دیکھیے تو رضوی صاحب کی یہ ناکامی بھی ایک طرح کی کامیابی تھی ۔ مسلم یونیورسٹی میں ابھی تک کسی کا تقرر نہیں ہوا لہذا یہ کہنا غلط ہے کہ رضوی صاحب کو وہاں بھی کامیابی نہیں ہوئی اور اب تو وہ اس جگہ کے امیدوار نہ ہوں گے" ۔

اسی طرح ۱۰ سوالوں کے جوابات دیئے گئے ہیں اور مسعود کی حمایت میں دلائل بھی دیئے گئے ہیں ۔ آخر میں مضمون نگار پمفلٹ نگار کو ایک طرح دھمکی دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"امید ہے اب پمفلٹ نگار کو فانی صاحب کے معاملے میں کوئی شکایت باقی نہ رہے گی اور آئندہ کسی کے کہنے میں آکر ایسے کمزور مقدموں میں

ہاتھ نہ ڈالیں گے ، اور اپنے دوست مولوی فانی کو سمجھا دیں گے کہ شیشے کے مکان میں رہ کر دوسروں کے گھروں میں ڈھیلے پھینکنا عقلمندی سے بہت دور ہے ۔ ہماری معلومات آن کی پبلک اور خانگی زندگی کے متعلق بہت وسیع ہیں ۔ ابھی تک تو ہم نے صرف ان کے حملوں کا ردکیا ہے ، لیکن اگر مجبور ہوکر ہمیں بھی ان کے خلاف قلم اٹھانا پڑا تو وہ خود سمجھ لیں کہ نتیجہ کیا ہوگا" ۔

دونوں طرف سے جو کچھ لکھا گیا اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وقت نے ثابت کر دیا کہ مسعود حسن بہتر امیدوار تھے ۔ ایک بات البتہ یہ ہوئی کہ مسعود حسن رضوی اور عبدالقوی فانی کی کبھی بھی نہ بن سکی ۔ اس سلسلے میں مسعود حسن ہمیشہ ضابطے کی پابندی کرتے تھے اس کا اندازہ اس تفصیل سے لگایا جا سکتا ہے ۔

عبدالقوی فانی نے ایک مرتبہ اپنی کسی کتاب کی اشاعت کی اجازت مانگی اور اس کے لیے درخواست دی ۔ عبدالقوی فانی کا خیال یہ تھا کہ مسعود حسن اجازت دے دیں گے مگر مسعود حسن نے انھیں ۳۔ دسمبر ۱۹۳۷ء کو خط[1] لکھا کہ میں خود اجازت نہیں دے سکتا مگر مجھے اس درخواست کو ڈین کے پاس بھیجنے میں کوئی اعتراض نہیں ۔ یہ خط عبدالقوی فانی کی غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے لکھا گیا تھا اس لیے کہ فانی کا خیال تھا کہ مسعود حسن خود ٹال مٹول کر رہے ہیں ۔ اس کے جواب میں اسی دن یعنی ۳۔ دسمبر ۱۹۳۷ء کو عبدالقوی فانی نے مسعود حسن کو ایک خط[2] تحریر کیا جس میں مسعود حسن کی طرف سے پیدا ہونے والی بدگمانی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور درخواست واپس دینے کی درخواست بھی تھی ۔ اس خط کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا ۔

ان حالات میں مسعود حسن یونیورسٹی کی ملازمت کرتے رہے ۔ ان کی محنت ، لیاقت اور خدمات کے صلے میں انھیں ترقی دے دی گئی ۔ وہ خود اس بارے میں لکھتے ہیں :

۱۔ خط موجود ہے ۔

۲۔ خط موجود ہے ۔

"۱۹۴۵ء میں یونیورسٹی کی مجلس عاملہ نے یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ مجھ کو فارسی اور اردو کے پروفیسر کا درجہ دیا جائے لیکن اس کے تھوڑے ہی دن بعد سیاسی ہنگاموں کا وہ زور ہوا جس کے نتیجے میں ملک تقسیم ہوگیا اور فرقہ وارانہ تعصبات نے یہ غلط فہمی پھیلا دی کہ ملک کی تقسیم کے ساتھ زبانیں اور ادبی ذوق بھی تقسیم ہوکر اردو اور فارسی زبانیں پاکستان کے حصے میں چلی گئیں - جب ہنگامے فرو ہوئے اور تعصبات کی شدت کم ہوئی تو مسلسل آٹھ سال میری حق تلفی کرنے کے بعد ۱۹۴۵ء کی منظور کی ہوئی تجویز پر عمل کیا گیا اور میں مئی ۱۹۵۲ء میں ۸۰۰-۵۰-۱۲۵۰ کے گریڈ میں ہزار روپے ماہوار پر فارسی اور اردو کا پروفیسر مقرر ہوا ۔"[۱]

ریٹائرمنٹ :

۱۵- جون ۱۹۵۴ء کو مسعود حسن کی سرکاری حساب سے عمر ساٹھ سال کی ہوگئی جو یونیورسٹی کے قواعد کی رو سے ملازمت کی حد تھی، چنانچہ وہ اسی تاریخ کو بتیس سال لکھنؤ یونیورسٹی کی خدمت اور ۲۳ برس اس کے شعبۂ فارسی و اردو کے صدر کی حیثیت سے کام کر کے ریٹائر ہوگئے ۔

مسعود حسن اپنی تاریخ پیدائش ۲۹- جولائی ۱۸۹۳ء کے مطابق ۱۵- جون ۱۹۵۴ء کو ساٹھ سال کی عمر میں نہیں بلکہ ساٹھ سال ۱۰ ماہ اور ۱۶ دن کی عمر میں ریٹائر ہوئے ، البتہ وہ ۱۹۲۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ملازم ہوئے تھے اور پورے ۳۲ سال ، یعنی ۱۹۵۴ء تک ، ملازم رہے - یونیورسٹی میں مسعود حسن رضوی کا سروس ریکارڈ محفوظ نہیں رہا - وہاں کے سرکاری اور یونیورسٹی کے حلقوں کے کہنے کے مطابق ریکارڈ روم کو طلبہ نے نذر آتش کر دیا تھا جس کی وجہ سے تمام فائلیں جل گئیں - البتہ ایک رجسٹر ملا ہے جس میں مسعود حسن رضوی کا نام تیرھویں نمبر پر درج ہے - حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ اپنے طور پر بھی سروس ریکارڈ کی ذاتی فائل انھوں نے تیار نہیں کی تھی - اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے-

والدہ کی بیماری اور انتقال :

مسعود حسن رضوی کی والدہ ہاشمی بیگم نے ، جو بڑی حوصلہ مند خاتون

۱- ہماری شاعری ، ص ۲۸۵ ۔

تھیں ، مسعود حسن رضوی کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ۔حالانکہ جب وہ دس سال کے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا ۔ ان کے علاوہ ایک چھوٹی بہن سیدہ بیگم اور ایک بھائی آفاق حسین بھی تھے ۔ مسعود حسن رضوی اپریل ۱۹۱۸ء میں جب سررشتۂ تعلیم میں ملازم ہوئے تو ملازمت کے چند مہینے بعد محرم کے موقع پر لیوتنی آئے ۔ لیوتنی میں انفلوئنزا پھیلا ہوا تھا اور اس نے وبائی صورت اختیار کرلی تھی ۔ مسعود حسن بھی انفلوئنزا کا شکار ہوگئے اور خود ہاشمی بیگم بھی اپنے بیٹے کی تیارداری کرتے کرتے بیمار پڑ گئیں ۔ چھٹی ختم ہونے پر مسعود حسن رضوی بیماری کی حالت میں الہ آباد واپس چلے گئے ۔ وہاں جا کر ان کی طبیعت تو بحال ہونے لگی مگر ہاشمی بیگم کی حالت رفتہ رفتہ بگڑنے لگی اور اکتوبر ۱۹۱۸ء کو وہ انتقال کرگئیں ۔ مسعود حسن رضوی الہ آباد سے لیوتنی پہنچے اور والدہ کو دفن کرنے کے بعد واپس الہ آباد چلے گئے ۔

بیماریاں :

مسعود حسن رضوی اپنی زندگی میں بہت سی بیماریوں کا شکار رہے ۔ زمانۂ طالب علمی میں انہیں دردِ سر کی شکایت پیدا ہوئی جو آخر دم تک ساتھ رہی ۔ اس کے علاوہ کچھ عرصے بعد تبخیر نے شدت اختیار کر لی ۔ پھر ۱۹۰۷ء میں ان پر ہیضے کا حملہ ہوا جس کی بنا پر وہ امتحان بھی نہیں دے سکے تھے ۔ اس کے بعد وہ انفلوئینزا کا شکار رہے ۔ ان کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے پتہ چلتا ہے کہ وہ زیادہ صحت مند نہ تھے اور انہیں کئی امراض اور عوارض لاحق تھے جن کا ذکر انھوں نے خود ایک چٹ[1] میں کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے :

(۱) جسم سے چنگاریاں نکلنا ۔

(۲) جسم کا جلد سن ہو جانا ۔

(۳) دھوپ میں نہ ٹھہر سکنا ۔

(۴) دھوپ کی طرف دیکھنے سے آنکھوں پر دیر تک اثر رہنا ۔

(۵) دماغ کا بہت جلد تھک جانا ۔

(۶) زیادہ دیر تک گفتگو نہ کر سکنا ۔

۱- موجود ہے ۔

(۷) دماغ کے تھکنے کی حالت میں تنگ کالر سے سخت تکلیف اور متلی ہونا۔

(۸) کبھی کبھی سر میں درد ہونا۔

(۹) کسی جلسے میں بیٹھنے سے سر میں درد ہونا۔

(۱۰) کھانسی آنا۔ جاڑوں میں کھانسی کا بڑھ جانا۔

(۱۱) کھانسنے میں بائیں طرف درد ہونا۔

(۱۲) پیشاب جلد جلد ہونا۔

(۱۳) پیشاب کے ساتھ کسی سفید چیز اور کبھی کبھی چکنی چیز کا خارج ہونا۔

(۱۴) پخانے کے بعد ذرا دیر میں پھر پیشاب کی ضرورت ہونا۔

(۱۵) صبح کو تین دفعہ پخانے جانا۔

(۱۶) تبخیر رہنا۔

(۱۷) میٹھی چیزوں کا نقصان اور کھٹی کا فائدہ کرنا۔

(۱۸) پخانہ ہونے میں کبھی کبھی درد ہونا۔

(۱۹) مقویات، میوہ جات اور فواکہات کا فائدہ نہ کرنا۔

(۲۰) پان نہ کھانے سے منہ کا بالکل خشک ہونا۔

(۲۱) کشمیری چائے کا نقصان کرنا۔

(۲۲) کبھی کبھی مسوڑوں میں درد ہونا۔

(۲۳) سوکر اٹھتے وقت دماغ کا بھاری ہونا۔

(۲۴) کچا لیس دار بلغم نکلتا رہنا۔

مسعود حسن رضوی ان بیماریوں اور ان عارضوں کی وجہ سے دماغی کام بہت کم کر سکتے تھے۔ انھوں نے اکثر اپنے خطوں اور دوسری تحریروں میں اپنی بیماری کا تذکرہ کیا ہے۔ اپنی بیگم کو لکھتے ہیں:

"میری طبیعت ابھی تک بالکل درست نہیں ہوئی ہے۔ جسمانی ضعف میں کمی ضرور ہے لیکن دماغی کمزوری، سینے کا درد، حلق کی تکلیف ابھی باقی ہے۔"
(لکھنؤ ۲۵- اکتوبر ۱۹۲۹ع)

اپنے چھوٹے بھائی سید آفاق حسین رضوی کو کوئٹہ سے لکھتے ہیں :

"اس رات کو پیٹ میں نہایت شدید درد شروع ہوا ۔ ساری رات چیختے تڑپتے گذری ۔ رات بھر میں پانچ دست آئے ۔ ایک قے ہوئی ۔ کل شام تک پیٹ میں درد باقی تھا ۔ آج بھی خفیف سی خلش ہے ۔"

(یکم جولائی ۱۹۳۲ء)

امیر حسن نورانی کو لکھتے ہیں :

"پیروں میں اکوتے کی تکلیف بڑھ جانے کی وجہ سے کھڑاویں پہن کر جانا پڑا ۔ آج وہ تکلیف اور بڑھ گئی ۔"

(۱۷- جون ۱۹۵۷ء)

ڈاکٹر صفدر آہ کو کئی خطوں میں اپنی بیماریوں کا تذکرہ کیا ہے ۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"میں چند روز پیچش اور بخار میں مبتلا رہ کر بہت کمزور ہوگیا تھا ۔ اب کمزوری بہت کچھ دور ہوگئی تھی لیکن رات سے مرض کے عود کر آنے کے آثار پیدا ہوگئے ہیں ۔"

(۲۱- اگست ۱۹۶۳ء)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"سب سے خاص سبب میرا الہ آباد جانا اور واپسی پر شدید نزلے میں مبتلا ہو جانا ہے جس سے آج تک پورے طور پر نجات نہیں مل سکی ۔"

(۲۹- مارچ ۱۹۶۶ء)

یوں ساری عمر مسعود حسن کسی نہ کسی بیماری کا شکار ہوتے رہے اور اس وجہ سے ان کی صحت روز بروز گرتی رہی ۔

شادی :

مسعود حسن رضوی کی شادی محلہ ٹپکاپور کانپور کے حکیم سید محمد اصغر نعمت الٰہی معروف بہ حکیم پیارے صاحب کی صاحبزادی حسن جہاں بیگم عرف حسینہ بیگم کے ساتھ ۲۹- رجب ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۳- فروری ۱۹۲۶ء کو ہوئی اور یکم مارچ ۱۹۲۶ء کو رخصتی عمل میں آئی ۔ مسعود حسن کے وکیل مولوی سید ابن علی تھے اور خاتون کے وکیل مولوی السید حسین صاحب تھے ۔

مسعود حسن کو ایک اچھی شریکِ حیات کی تلاش تھی ۔ انھیں مال و دولت اور شان و شوکت کی نہیں بلکہ شرافت کی خواہش تھی ۔ انھوں نے بہت سے رشتے ٹھکرا دیے اور اپنے معیار کے مطابق اپنی شریکِ حیات کا انتخاب خود کیا ، کیونکہ اس وقت ان کے خاندان میں کوئی بزرگ موجود نہ تھا اور جو رشتہ دار تھے وہ بھی التفات نہیں برتتے تھے ۔

علی عباس حسینی نے ان کے رشتے کے لیے بات کی ۔ اس سلسلے میں وہ مسعود حسن رضوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

" کل مولوی کلبِ عباس صاحب سے آپ کی شادی کے متعلق گفتگو ہوئی ۔ انھوں نے مجھ سے خاص طور پر ارشاد فرمایا کہ میں آپ کو باقر حسین صاحب سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفیسر صاحب کی صاحبزادی کے متعلق لکھوں ۔ لڑکی تعلیم یافتہ ، شریف ، باسلیقہ اور نیک ہے ۔ سید زادی ہے . . . . میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یقینی آپ کو منظور کر لینا چاہیے کہ اس لڑکی میں کوئی خرابی نہیں ہے اور وہ آپ کو کافی طور سے آپ کے علمی کاموں میں مدد دے گی ۔" [1]

مگر مسعود حسن رضوی نے اس جانب دھیان ہی نہ دیا کیونکہ شادی کے معاملے میں وہ ایک معیار رکھتے تھے اس بارے میں مرزا محمد عسکری لکھتے ہیں :

" آپ کا ایک جملہ ازدواج کے متعلق آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے ۔ آدمی ایسی جگہ شادی کرے کہ لوگ سسرے کو دیکھ کر کہیں کہ یہ فلاں کے سسر ہیں ، نہ کہ داماد کو دیکھ کر کہ یہ فلاں کے داماد ہیں یا کسی بیوی کو اس کے شوہر کے نام سے بتائیں ، نہ کسی شوہر کو اس کی بیوی کے پتے سے موسوم کریں ۔" [2]

مسعود حسن رضوی جس طرح عام زندگی میں خود داری کا مظاہرہ کرتے تھے اسی طرح شادی کے معاملے میں بھی خود داری کا ثبوت دیا ۔ علی عباس حسینی رقم طراز ہیں :

۱۔ علی عباس حسینی بنام مسعود حسن رضوی ادیب ، ۲۵ جنوری ۱۹۲۲ء ۔
۲۔ ن کیستم مرزا محمد عسکری ، ص ۴۲ ۔

"اسی خود داری نے انھیں شادی کے بازار میں بکنے سے بار بار روک لیا۔ میٹرک پاس کرتے ہی ایک نواب صاحب کی طرف سے فرزندی میں لینے کی خواہش کی گئی ۔ مکان و اثاثہ ، گاڑی گھوڑا سب ہی کچھ مل رہا تھا مگر انھوں نے کہا "الفقر فخری" ۔ اسسٹنٹ ماسٹری کے زمانے میں ایک مشہور و مقتدر تعلقدار کے ہاں سے اس طرح کی خواہش کی گئی اور بہت سے سبز باغ دکھائے گئے مگر انھوں نے کہا "شادی کے معاملے میں میں اس کا قائل ہوں کہ لوگ یہ کہیں کہ فلاں صاحب مسعود صاحب کے سسرے ہیں ، نہ یہ کہ مسعود صاحب فلاں صاحب کے داماد ہیں"۔ یعنی دامادی ذریعہ عزت و ترقی نہ بنے بلکہ اپنی ذاتی صلاحیت و قابلیت ۔" ۱

مسعود حسن ذاتی طور پر بڑے شریف اور با اخلاق شخص تھے اور کسی برائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور جس طرح شادی سے پہلے اور شادی کے بعد شریفانہ زندگی انھوں نے بسر کی اس کی مثال خال خال ہی ملتی ہے ۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اور پھر بڑھاپے میں کوئی ایسی بات دانستہ یا غیر دانستہ ان سے سرزد نہیں ہوئی جس پر انھیں نادم ہونا پڑتا ۔ ان کے ہم عصروں ، ہم عمروں ، ان کے ہم جماعتوں ، ان کے دوستوں اور تعلق داروں نے اس کی تصدیق کی ہے ۔ مرزا جعفر حسین نے اس سلسلے میں اور ان کی شادی کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

"اپنی ملازمت کے دوران اور اس کے برسوں بعد تک وہ لاکتخدا بلکہ صحیح معنوں میں مجرد رہے تھے۔ دوستوں کے اصرار پر ، بالخصوص میرے اور حسینی مرحوم کے اصرار پر ، کبھی کبھی رضامندی کا اظہار کر دیتے تھے ، مگر پھر بھی شادی کرنے میں ہچکچاہٹ تھی ۔ پہلی بار میری شادی کے موقع پر ان میں اس طرف قدم بڑھانے کی ہمت پڑی تھی ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز وہ تقریباً اٹھارہ گھنٹوں تک میرے ساتھ رہے تھے ۔ بارات میں شمولیت ، نکاح میں شرکت اور تمام رسوم و رواج کے اختتام تک وہ موجود رہے تھے ۔ دوسرے روز مجھ سے ان تمام واردات کی تفصیلات ہنس ہنس کر اور لطف لے لے کر دریافت کی تھیں ۔ خود ان کی کتخدائی کا وقت آیا تو ہم نے یہ محسوس کیا کہ ان کو اپنے لیے اس

---

۱ ۔ مسعود حسن رضوی ادیب ـــ ذات و صفات، مرتبہ مالک رام، ص ۲۶-۲۵۔

موقع پر ایک "ولی" کی ضرورت تھی جو حفاظت و صوالت کے فرائض سرانجام دے اور فرائض شوہری کی تکمیل میں ان کو بے تکلفی سے مشورہ دے سکے ۔ اس کام کے لیے ان کے دوستوں میں راقم اور حسینی صاحب ہی موزوں تھے ۔ بالآخر میں ان کے ہمراہ گیا اور یہ فریضہ ان کی سسرال واقع ٹپکاپور ، کانپور میں انجام دیا ۔ پہلا مرحلہ مہر کا تھا ۔ قانون کے مطابق تمام مقررہ مہر ادا کرنا ضروری تھا ۔ مسعود صاحب خود بھی متشرع تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ اتنا ہی مہر باندھا جائے جو وہ ادا کر سکیں اور ادا کر دیں ۔ یہ معاملہ تو بخیر و خوبی طے ہو گیا مگر نکاح کے وقت ریت رسم کی منزل بہت سخت تھی ۔ مسعود صاحب چاہتے تھے کہ جلد از جلد رخصتی ہو جائے اور وہ فی الفور دلہن کو لے کر لکھنؤ واپس چلے جائیں ۔ سسرال والے پوری طاقت سے یہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسی رسم نہ رہ جائے جو ادا نہ ہو ۔ میرے لیے یہ وقت بہت سخت تھا ۔ کبھی مسعود صاحب کو سمجھاتا تھا تو کبھی ان کی سسرال والوں کی خدمت میں التجا کرتا ۔ کافی وقت اس مناقشے کو فرو کرنے میں صرف ہو گیا ۔ بالآخر مسعود صاحب ہی کو میں ہموار کر سکا ، مگر انھوں نے بھرائی ہوئی آواز اور مایوس لہجے میں یہ کہا کہ کم سے کم یہ تو ہو جائے کہ وہ فقرہ جو آرسی مصحف کے وقت کہنا پڑتا ہے ، مجھے نہ کہنا پڑے ۔ اس کے بعد فوراً ذرا سخت لہجے میں کہا کہ وہ فقرہ میں ہرگز زبان سے نہیں نکالوں گا ۔ رسم و رواج کے مطابق وہ فقرہ ہے "بیوی آنکھیں کھولو ، میں تمھارا غلام ہوں" ، بہرحال اس سلسلے میں میری گذارش ان کی سسرال والوں نے قبول کر لی ۔ یہ رسم ادھوری رہ گئی اور باقی تمام رسوم و رواج کی سختیاں جھیل کر مسعود صاحب اپنی دلہن کو ہمراہ لے کر لکھنؤ واپس ہوئے"[۱] ۔

بیوی اور اُس سے تعلقات :

مسعود حسن رضوی کی پوری زندگی کے مطالعے سے جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے ان کی بیوی حسن جہاں بیگم عرف حسینہ بیگم نے اپنے آپ کو شوہر کے

---

۱ ۔ ادبیات و شخصیات ، از مرزا جعفر حسین، ص ۲۱۱-۱۲ ۔ آج کل، نئی دہلی، فروری ۱۹۷۶ء ، ص ۳۰ ۔

ولگ میں ڈھال لیا تھا۔ دونوں میں بے مثال یگانگت تھی۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ حسینہ بیگم نے اپنی مرضی کو شوہر کی مرضی پر ترجیح دی اور ان کی ہر بات کو برداشت کیا اور کبھی بدمزگی پیدا نہیں ہونے دی اور گھریلو زندگی کو خوشگوار بنائے رکھا۔ اس سے پہلے کہ تفصیل میں جایا جائے، ضروری ہو جاتا ہے کہ حسینہ بیگم کے بارے میں بھی کچھ جان لیا جائے۔ مسعود حسن رضوی کی اہلیہ حسینہ بیگم خاصی پڑھی لکھی خاتون تھیں اور ان کا خاصا ادبی ذوق تھا۔ مالک رام لکھتے ہیں:

"بیگم مسعود کو علم سے شغف اپنے والد سے ملا تھا۔ وہ انگریزی بھی جانتی تھیں۔ اردو میں شعر کہتی تھیں اور حزیں تخلص تھا۔ انیس کی عاشق تھیں بلکہ حافظ بھی۔ ان کا انیس کا مطالعہ کس درجے کا تھا اس کا کچھ اندازہ اس سے لگائیے کہ جب بھی مسعود صاحب کو انیس کے کسی بند کے بارے میں معلوم کرنا ہوتا کہ وہ کس مرثیے میں ہے تو وہ ان سے دریافت کرتے۔ مرحومہ نہ صرف نشاندہی کرتیں بلکہ متعلقہ جلد لا کر پیش کر دیتیں۔ موت سے کچھ پہلے وہ اردو ضرب الامثال جمع کر رہی تھیں لیکن یہ کام نامکمل رہ گیا"[1]۔

اسی طرح مرزا جعفر حسین نے بھی بیگم مسعود کی انیس شناسی کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"محترمہ کو ادب کا ذوق اور ادبی خدمت کا شوق بھی تھا۔ ان کا ایک قابل ذکر کارنامہ یہ ہے کہ اردو کی تقریباً سات سو مثلیں جمع کر لیں مگر افسوس ہے کہ ان کے معانی و مطالب لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ . . . اپنے شوہر کی طرح انیس کی شیدائی تھیں اور ان کے مراثی کے سینکڑوں بند یاد تھے بلکہ حافظے میں محفوظ تھا کہ فلاں مرثیہ فلاں جلد میں ہے اور فلاں بند فلاں مرثیے میں ہے۔ ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے ادیب بارہا مراثیٔ انیس کی ضخیم جلدوں کی ورق گردانی سے بچ گئے"[2]۔

۱۔ وفیات، از مالک رام، تحریر، نئی دہلی، ص ۹۵۔

۲۔ مسعود حسن رضوی ادیب — حیات و خدمات، از مرزا جعفر حسین، ص ۶۱-۶۲۔

مسعود حسن بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے اور اپنی کسی بات کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ اپنی بیوی سے عشق و محبت کا اظہار کھلے بندوں نہیں کرتے تھے اور اس کی ان کی بیگم کو بھی شکایت رہتی تھی ، حالانکہ وہ ان سے بے حد محبت کرتے تھے ، جیسا ان کے بیگم کے نام خطوط سے ظاہر ہوتا ہے ۔ ان کی بیگم بعض اوقات ان کی کسی بات کو محسوس کرتیں اور اپنی کیفیتِ ناراضی کا اظہار خط میں کرتیں تو مسعود حسن بڑی ملائمت کے انداز میں سمجھاتے اور ان کی غلط فہمیوں کو دور کرتے ۔ ایسے خطوں سے مسعود حسن کے بیوی کے بارے میں نظریات اور ، بطور شوہر کے ، رویوں کا پتہ چلتا ہے ۔

جن دنوں مسعود حسن جوہری محلہ لکھنؤ میں قیام پذیر تھے اور ان کی بیگم اپنے میکے گئی ہوئی تھیں ان کے کسی ناراضی کے خط کے جواب میں وہ لکھتے ہیں :

"میری غیرت شعار نازک حسینہ !

تمہارا خط پڑھ کر مجھے ہنسی آئی ۔ رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے بھی دنیا میں ہیں مگر میں ستم ظریف نہیں ہوں کہ کسی کا دل دکھا کر اپنا دل خوش کروں ۔ پھر تمہارے خط پر مجھے ہنسی کیوں آئی ؟ سبب سوچتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا ۔ نہ معلوم تمہاری سادگی پر مجھے ہنسی آئی ، نہ معلوم تمہاری نازک مزاجی پر ہنسی آئی ۔ میرے خط کا مقصد اس کے سوا کچھ بھی نہ تھا کہ میں اپنی طبیعت اور اپنے مزاج کے سمجھنے میں تم کو مدد دوں تاکہ میری طبیعت کے غلط اندازے کی وجہ سے آئندہ کوئی ایسی بات واقع نہ ہونے پائے جو خدا نخواستہ باہمی خوشگوار تعلقات میں رخنہ ڈال سکے ۔ اگر تم نے سوتے سے اٹھ کر فوراً خط نہ پڑھا ہوتا ۔ ذرا حواس درست ہونے کے بعد پڑھا ہوتا تو شاید تمہارے دل پر وہ اثر نہ ہوتا جو ہوا ۔ تم نے میرے بعض جملوں کا مطلب بھی غلط سمجھا ۔ مثلاً میں نے یہ کہیں نہیں لکھا تھا کہ اگر مجھے فرصت ہوئی اور تمہاری طبیعت درست ہوئی تو میں تمہارے خط کا جواب سخت الفاظ میں لکھتا ۔ میں نے صرف یہی تو لکھا تھا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ میں تمہارے وعظ کے جواب میں ایک دفتر لکھ ڈالوں ۔ ظاہر ہے اس دفتر میں گالیاں نہ ہوتیں ۔ کوسنے نہ ہوتے ۔ پھر کیا ہوتا ؟ مذہب و عبادت کے متعلق میرے خیالات ، زن و شو کے تعلقات کی نزاکت ، مردانہ طبیعت

کے خصوصیات بالعموم — اپنے مزاج کی خصوصیات بالخصوص — یہ چند باتیں تھیں جن پر تفصیل سے اظہار خیال کرنا چاہتا تھا . . . . سنسکرت میں بیوی کو ''آردھ آنگنی'' یعنی نصف جسم والی کہتے ہیں اور انگریزی میں کچھ اور ترق دے کر "Better Half" کہتے ہیں - یہ دونوں فقرے اس خیال پر مبنی ہیں کہ شوہر و زوجہ مل کر ایک ہستی ہو جاتے ہیں - ایسی حالت میں کوئی شریف شوہر ایسا نہیں ہو سکتا جو اپنی زوجہ کی عزت کو اپنی عزت اور اس کی ذلت کو اپنی ذلت نہ سمجھے۔ بات یہ ہے کہ ذکی الحس آدمیوں کے لیے نازک مزاج ہونا ضروری ہے - میں ذکی الحس ہوں - نازک مزاج بھی ہوں - مجھے حضرت آتش کا یہ شعر اپنے اور تمھارے حسب حال معلوم ہوتا ہے :

اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیونکر بنے
دل سوا شیشے سے نازک ، دل سے نازک خوئے دوست

نیاز پرست

مسعود حسن رضوی''
(۱۱ اگست ۱۹۲۶ء)

مسعود حسن کا یہ خط رخصتی کے پانچ مہینے دس دن کے بعد کا ہے - اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی بیوی کتنی نازک مزاج ہوں گی اور کس طرح وہ نفسیاتی طور پر انھیں اپنے مزاج کے مطابق ڈھال رہے ہیں - اس تناظر میں محبت ، پیار اور ہمدردی کا جو جذبہ جھلکتا دکھائی دیتا ہے اسے محسوس کیا جا سکتا ہے - وہ اپنی بیگم کے بارے میں کس حد تک متفکر رہتے تھے اس کا اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے :

''افسوس ہے کہ تمھاری آنکھیں آج کل خراب ہو رہی ہیں - میں تم سے آنکھوں کی حفاظت اور علاج کی برابر تاکید کیا کرتا ہوں -''

(۲۵- اکتوبر ۱۹۲۹ء)

''تم نے یہ نہیں لکھا کہ مجھے تمھارے علاج کے لیے کتنی رقم بھیجنا چاہیے - اگر والدہ معظمہ نے مصارف علاج کا بار خود اٹھا لیا ہے تو یہ محض ان کی محبت ہے ورنہ اب اس طرح کے اخراجات ان پر اخلاقاً فرض

ہوں تو ہوں، شرعاً و عرفاً یہ فرائض میری طرف منتقل ہو گئے ہیں اور ان فرائض کا ادا کرنا اب مجھ پر واجب ہے۔" (۱۸ دسمبر ۱۹۲۶ء)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :

"کفایت کے خیال سے ضروری مصارف میں مطلق کمی نہ کرنا۔ روپے کی جس وقت ضرورت ہو بے تکلف لکھنا، میں فوراً روانہ کر دوں گا۔"

(۱۵ نومبر ۱۹۲۷ء)

مسعود حسن کبھی کبھار ان خطوط میں عشق و محبت کی باتیں بھی کر جاتے ہیں اور انھیں بیگم کی کمی (جب وہ میکے گئی ہوئی ہوں) بری طرح کھٹکتی ہے اور وہ ان سے واپس آنے کا تقاضا بھی کرتے ہیں۔ بہت سے خطوط میں ایسے جذبات و کیفیات کا برملا اظہار ملتا ہے۔ ایک خط کا آغاز یوں ہوتا ہے :

"مرے دردِ دل کی دوا ہو تم، مرے زنگِ دل کی جلا ہو تم
مرے سازِ دل کی صدا ہو تم، مری زندگی کی بہار ہو

یہ شعر ابھی ابھی خاص تمھارے لیے کہا ہے . . . . . . میں نے تو صاف صاف لکھ دیا تھا کہ تمھاری موجودگی میرے لیے مسرت کا باعث ہوتی ہے اور تمھارا الگ رہنا میرے دلی رنج کا سبب ہوگا۔ لیکن اگر تمھاری خوشی وہاں کے مستقل قیام پر منحصر ہو تو میں تمھاری خاطر سے اس بات کو گوارا کر سکتا ہوں۔ بہرحال میں تم کو اپنے گھر کی آبادی اور اپنی محفل کی رونق سمجھتا رہا ہوں اور اب بھی سمجھتا ہوں۔ جو شعر میں نے اوپر لکھا ہے، میرے خیالات کا آئینہ ہے۔ مجھے تمھاری دلجوئی، مزاج داری، ناز برداری میں بھی لطف ملتا ہے، اس لیے کہ مجھ کو تم سے محبت ہے اور میں جانتا ہوں کہ تم بدمغز اور بے شعور عورتوں کی طرح ان باتوں سے اترا جانے والی نہیں۔ میں اپنے خیال میں تمھارے خوش رکھنے سے کوتاہی نہیں کرتا۔" (۲۵ اکتوبر ۱۹۲۹ء)

اسی طرح ۱۸ دسمبر ۱۹۲۶ء اور ۱۵ نومبر ۱۹۲۷ء کے خطوں میں اپنی بیوی کو "رونقِ خانہ و آبادیٔ کاشانۂ دل" سے خطاب کیا ہے۔

اسی طرح ۳۰ - اکتوبر ۱۹۲۹ع کے ایک خط میں "زاد عصتمکم و شرفکم" کے خطاب سے شروع کر کے اپنا ایک شعر لکھتے ہیں :

گل باغِ صدق و صفا ہو تم ، دل و جانِ مہر و وفا ہو تم
تمھیں کچھ خبر بھی ہے کیا ہو تم ، دلِ مضطرب کا قرار ہو

مسعود حسن اپنی بیوی کی واپسی کا شدت سے انتظار کرتے رہتے ہیں اور کئی حوالوں سے اپنے خطوں میں اس کا اظہار کرتے ہیں ۔

۱۸ دسمبر ۱۹۲۶ع کے خط میں لکھتے ہیں :

"تمھارے کانپور کے قیام کی مدت اب ختم ہو گئی ہے اور یہاں ہر شخص تمھارے انتظار میں چشم براہ ہے ۔"

۱۵ نومبر ۱۹۲۸ع کے خط میں یوں اظہار ہوتا ہے :

"تمھارے چلے جانے سے گھر میں حد کا سناٹا ہوگیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ تم کو گئے ہوئے بڑی مدت ہوگئی ہے ۔ یہاں ہر شخص دست بدعا ہے کہ تم بخیر و خوبی صحت و سلامتی کے ساتھ بھری پری ایک سے دو ہو کر خوش خوش آؤ ۔ میں بھی اس دعا میں سب کے ساتھ شریک ہوں ۔"

ایک اور خط میں جو ۲۵ جنوری ۱۹۶۱ع کا لکھا ہوا ہے ۔ بیگم کو لکھتے ہیں :

"اظہر سلمہ کی طبیعت بھی بہت خراب ہے ۔ نزلہ کھانسی بخار میں مبتلا ہے ۔ بہت دبلا اور کمزور ہو گیا ہے ۔ تم کو برابر یاد کیا کرتا ہے ۔ سیدہ اس کا بہت خیال رکھتی ہے لیکن دنیا کی کوئی چیز ماں کی محبت کا بدل کہاں ہو سکتی ہے ۔ ان سب حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اب تم بلا تاخیر واپس آ جاؤ ۔"

مسعود حسن اور ان کی بیگم کی محبت اور تعلقات کے بارے میں ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں :

"مسعود حسن کے لیے ان کی ذات بہت بڑا سہارا تھی اور وہ سخت ترین مصروفیات کے عالم میں اپنے تھکے ہوئے ذہن کو سکون دینے کے لیے کچھ وقت ان سے باتوں اور ہنسی مذاق میں ضرور گزارتے ۔ دن میں ایک آدھ

بار لکھنا پڑھنا چھوڑ کر وہ گھر کے اندر آتے اور پکارتے "ارے بھئی کہاں ہو ؟"

اور جب وہ کبھی کچھ دن کے لیے شہر سے باہر کسی مہمانی میں چلی جاتیں تو مسعود پر عجیب مسکینی سی طاری ہو جاتی اور وہ گھر بھر سے بے تعلق ہو جاتے ۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں وہ دو تین ہفتے کے لیے اپنی بڑی بیٹی کے پاس الہ آباد چلی گئیں ۔ جب وہ واپس آئیں تو مسعود نے ان سے اتنے دن تک باہر رہنے کی بڑی شکایت کی اور آخر میں تقریباً روہانسے ہو کر کہا :

"اب ہمیں اتنے اتنے دن کے لیے چھوڑ کر نہ جایا کرو ۔"[1]

ڈاکٹر قمر جہاں لیکچرر شعبۂ اردو ہندو یونیورسٹی بنارس ، جنھیں مسعود حسن نے بیٹی بنا لیا تھا ، ان سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں :

"موصوفہ سے مل کر مجھے بے حد مسرت ہوئی ۔ انتہائی خوش شکل ، خوش سلیقہ ، خوش گفتار اور بامروت خاتون تھیں . . . اماں صحیح معنوں میں ان کی شریکِ حیات تھیں ۔ جوانی اور ضعیفی کے دلوں میں بچوں کی طرح ان کی ضروریات کا خیال رکھتی تھیں اور مطالعے کے لیے زیادہ سے زیادہ آرام و سکون پہنچاتی تھیں ۔ خرچ کے لیے روپیہ دینے کے سوا وہ گھر کی ہر ذمہ داری سے بے نیاز تھے ۔"[2]

ڈاکٹر نیر مسعود سے ایک طویل انٹرویو میں میں نے ان کی والدہ یعنی بیگم مسعود کے بارے میں کئی سوال پوچھے جن کے انھوں نے بڑے دلچسپ جواب دیے جن سے مسعود حسن اور ان کی بیگم کے کئی روپوں کا پتہ چلتا ہے ۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے بتایا :

"شادی کی داستان بڑی دلچسپ ہے ۔ والدہ بتاتی تھیں ، انھوں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت علیؓ سے ان کی شادی ہو گئی ہے ۔ اس کی تعبیر یوں بتائی گئی کہ ہونے والا شوہر اقبال مند شخص ہوگا ۔ ابا کا نام

---

۱ ۔ نیا دور، لکھنؤ ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ ۔ اپریل ۱۹۷۷ء ، ص ۳۱ ۔

۲ ۔ نیا دور لکھنؤ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۴۳، ۴۸ ۔

مسعود تھا ۔ اس زمانے میں والدہ منشی فیاض علی کے ناول "انور" اور "شمیم" اور ظفر عمر کے جاسوسی ناول پڑھتی تھیں ۔ ان میں سے ایک ناول کا کردار مسعود تھا جو بہت تیز و طرار تھا ۔ والدہ کو یہی خیال تھا کہ یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں ۔ فیشن ایبل ہوں گے اور بڑی شخصیت کے مالک ہوں گے ۔ مگر جب شادی ہوئی تو ابا کی داڑھی تھی اور بہت دبلے پتلے تھے ۔ مریض بھی ایسے کہ کھانسی آ رہی ہے ۔ شروع میں بہت روئیں ۔ کہتی تھیں لب ِگور ہیں ، بیوہ چھوڑ کے ختم ہو جائیں گے ۔ ہمارے نانا حکیم تھے۔ وہ کہتے تھے اس طرح کے Structure کے آدمی بڑی عمر کے ہوتے ہیں ۔ ہماری والدہ شاعری بھی کرتی تھیں ۔ افسانے بھی لکھتی اور شروع میں ابا کو انگریزی میں خط لکھتی تھیں مگر ابا نے منع کر دیا ۔ ایک ناول بھی لکھنا شروع کیا مگر حوصلہ افزائی نہ ہوئی ۔ مسودہ دیکھنے اور نظر ِثانی کے لیے ابا کو دیا تو تیس برس تک نظر ِثانی کی نوبت نہ آئی ۔"

بیوی کا انتقال :

بیگم مسعود کا انتقال ۲۳ ۔ اکتوبر ۱۹۶۹ع کو دل کا دورہ پڑنے سے ہوا۔ بیوی کے انتقال کا انھیں اتنا صدمہ پہنچا کہ ان کی یادداشت کمزور ہوگئی ۔ زندہ دلی تقریباً رخصت ہو گئی اور جارحانہ انداز ختم ہو گیا ۔ اس وجہ سے بھی کہ وہ اب بچوں کے رحم کرم پر تھے ۔ بیگم مسعود کے انتقال کے بارے میں مرزا جعفر حسین رقم طراز ہیں :

"یہ نیک طینت بی‌بی تینتالیس سال سات مہینے بائیس دن تک شوہر کی شریک ِزندگی رہیں ۔ ۲۲ ۔ اکتوبر ۱۹۶۹ع کو دن گزار کر ۲۳ ۔ اکتوبر کی رات کو ساڑھے بارہ بجے قلبی دورے میں اچانک انتقال کر گئیں اور ۲۳ ۔ اکتوبر ہی کو ۴ بجے سہ پہر منشی فضل حسین خاں کی کربلا میں سپرد ِخاک کی گئیں ۔" حسب ِذیل کتبہ مرحومہ کے مزار کی نشاندہی کرتا ہے :

"حسن جہاں بیگم جعفری بنت حکیم سید محمد اصغر مرحوم نعمت اللہی اہلیہ سید مسعود حسن رضوی ادیب ۔

تاریخ وفات ۱۰ شعبان ۱۳۸۹ھ مطابق ۲۳ - اکتوبر ۱۹۶۹ء۱۔"

مسعود حسن کو کتنا صدمہ پہنچا اور کس غم و اندوہ کے عالم میں مرحومہ کی آخری رسومات ہوئیں اس بات کا اندازہ مسعود حسن کے اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنی چھوٹی بیٹی الیس بالو کو لکھا ۔ وہ لکھتے ہیں :

"افسوس ہزار افسوس ! پیاری بیٹی کی پیاری اماں ۲۲ اور ۲۳ اکتوبر کی درمیانی رات کو ساڑھے بارہ بجے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئیں . . . . گھر کی رونق تو تمھاری اماں کے ساتھ گئی ۔ مگر لوگ تعزیت کے لیے آتے رہے ۔ ہمدردوں کے تعزیتی تار آتے رہے اور ظاہری چہل پہل ہوتی رہی ، لیکن دل کی ویرانی کم نہ ہوئی ۔ سوئم کی مجلس قصرِ حسینی میں مولوی شبیہ الحسن نونہروی نے پڑھی ۔ گھر میں تیجے اور دسویں کا فاتحہ ہو چکا ہے ۔ پرسوں جمعرات کو بیسویں کا ہوگا ۔ چالیسواں ۳۰ نومبر کو ہوگا ۔ مولانا علی نقی صاحب قبلہ مجلس پڑھیں گے ۔ مجلسِ چہلم کے بعد ہماری دنیا بالکل اندھیر ہو جائے گی ۔

ع : گھر سونا ہے ان سونا ہے

دنیا میں رنج و راحت ، شادی و غم کا ساتھ ہے ۔"

مسعود حسن کے غم کا اندازہ ایک اور خط سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے ایک دوست کے تعزیتی خط کے جواب میں لکھا ۔ وہ لکھتے ہیں :

"اب تو اپنی محبوب ترین شریکِ حیات کی دائمی مفارقت کے جاں فرسا سانحے کے بعد میری حالت یہ ہے :

دل جو مردہ خلد میں جانے سے کیا ہو جائے گا
ہم جہاں ہوں گے وہ گھر ماتم سرا ہو جائے گا

اس وقت شہر شہر سے آئے ہوئے عزیز سوگواروں سے گھر بھرا ہوا ہے لیکن چند روز میں یہ عارضی آبادی ویرانی میں تبدیل ہو جائے گی :

---

۱ - مسعود حسن رضوی ادیب — جہات و خدمات ، از مرزا جعفر حسین ، ص ۶۲ ۔

آئی بہار گلشن گل سے بھرا ہے لیکن
ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بلبل

کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں
آج بلبل نہیں گلستاں میں

زندگی کی گاڑی جو دو پہیوں پر بڑی ہموار رفتار سے چلی جا رہی تھی اس کا ایک پہیہ نکل گیا۔ اب اسی حالت میں اس کو کھینچ کر آخری منزل تک پہنچانا ہے![۱]"

مسعود حسن کی عادت تھی کہ وہ روزانہ ڈائری لکھتے تھے۔ ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو انھوں نے لکھا :

"آج رات ساڑھے بارہ بجے میری عزیز ترین رفیقۂ حیات کا سولہ برس کا ساتھ چھوٹ گیا۔"

اسی طرح ۲۷۔ اکتوبر کی ڈائری میں لکھا :

"آج شبِ برات کا دن ہے۔ تینتالیس برس ہونے یہی شعبان کی چودھویں تاریخ اور شبِ برات کا دن تھا جب ہم مرحومہ کو بیاہنے کانپور گئے تھے اور ۱۵ شعبان کی صبح کو رخصت کرا لائے تھے۔ آج پانچواں دن ہے کہ وہ ہمارے گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئیں۔"

بیگم کے انتقال کے بعد مسعود حسن پژمردہ رہنے لگے۔ ڈاکٹر قمر جہاں لکھتی ہیں :

"اماں کے انتقال کے بعد وہ اور زیادہ کمزور ہو گئے تھے۔ تنہائی اور گہری اداسی نے انھیں گھیر لیا تھا۔ مرحومہ کا ذکر آتے ہی بے چین ہو جاتے تھے۔ ان کی ایک ایک خوبی کا ذکر کرتے جاتے اور روتے جاتے تھے۔[۲]"

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب — حیات و خدمات، از مرزا جعفر حسین، ص ۶۲ - ۶۳۔

۲۔ نیا دور، لکھنؤ، مسعود حسن رضوی نمبر، مارچ۔ اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۴۸۔

مسعود حسن مرنے والے کے آخری دیدار سے گھبراتے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ آخری دیدار سے زندگی بھر وہی مردہ چہرہ نظر کے سامنے رہتا ہے ۔ یادوں کو زندہ اور تازہ رکھنا ہو تو آخری دیدار کبھی نہیں کرنا چاہیے ۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنی بیگم کا آخری دیدار بھی نہیں کیا تھا ۔

اخلاف :

مسعود حسن کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں اور سب اللہ کے فضل و کرم سے زندہ اور سلامت ہیں ۔ ان کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے :

(۱) ارجمند بانو بیگم : ۲۸ نومبر ۱۹۲۶ع کو پیدا ہوئیں ۔ ان کی شادی ڈاکٹر مسیح الزماں سے ہوئی جن کا انتقال ۸ فروری ۱۹۷۵ع کو ہوا ۔ اپنے بچوں کے ساتھ الہ آباد میں مقیم ہیں ۔

(۲) اختر مسعود رضوی : ۲۵ جولائی ۱۹۲۹ع کو پیدا ہوئے ۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم ۔ اے اور پی ایچ ۔ ڈی کیا ۔ ان کے مقالے کا موضوع تھا : ”مرزا غازی بیگ اور اس کا دربارِ علم و فن ۔“ آج کل پشاور یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر ہیں ۔

(۳) پرجیس بانو : ۱۷ ستمبر ۱۹۳۱ع کو پیدا ہوئیں ۔ سلطان پور کے رئیس سید غلام مہدی صاحب کے فرزند سید آباد حسین سے شادی ہوئی اور ان کے ساتھ کراچی میں مقیم ہیں ۔

(۴) الیس بانو : ۲۰ مارچ ۱۹۳۳ع کو پیدا ہوئیں ۔ اپنے خاندان ہی میں سید حبیب حسین سے شادی ہوئی ۔ آج کل اپنے شوہر کے ساتھ کیلی فورنیا میں ہیں جو بحیثیت انجینئر وہاں متعین ہیں ۔

(۵) نیر مسعود : ۱۶ نومبر ۱۹۳۶ع کو پیدا ہوئے ۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں فرسٹ کلاس ایم ۔ اے کرکے الہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں ڈی فل کیا ۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری لی ۔ آج کل لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی میں ریڈر ہیں ۔ ان کا اردو مقالہ ”رجب علی بیگ سرور“ اپنے موضوع کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے ۔

(۶) انور مسعود : ۵ جولائی ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے - نیشنل ہومیو پیتھک کالج لکھنؤ سے پانچ سال کا کورس پاس کیا - موہن ہومیو کالج لکھنؤ میں پڑھاتے ہیں اور ذاتی پریکٹس بھی کرتے ہیں -

(۷) اظہر مسعود : ۲۱ دسمبر ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے - لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم - اے کیا - آج کل اردو اکادمی لکھنؤ میں ریسرچ آفیسر ہیں -

بچوں سے تعلقات :

مسعود حسن نے اپنے بچوں کی طرف وہ توجہ نہیں کی جو بحیثیت ایک باپ کے انھیں کرنی چاہیے تھی - دراصل انھیں مطالعے اور تحقیقی کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ اس جانب توجہ کر سکیں - چنانچہ بچوں کی تربیت ان کی والدہ نے کی اور خاص طور پر مسعود حسن کے چھوٹے بھائی سید آفاق حسین نے بچوں کی پرورش اور نگہداشت کے لیے اپنی زندگی وقف کردی اور انھوں نے آج تک شادی نہیں کی -

آفاق حسین بتاتے ہیں "بھائی جان کو پڑھنے لکھنے سے فرصت ہی نہ تھی- انھیں کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے - بھابھی گھر کا سارا انتظام سنبھالے ہوئے تھیں - میں بچوں کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لیتا تھا اور بچے بھی میرے قریب رہتے تھے"[1]-

اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر آفاق حسین لکھتے ہیں "برادر معظم علمی مشاغل میں اتنا منہمک رہتے تھے کہ اپنے کسی بچے کو پڑھانا لکھانا کیا ، بیاری دکھ میں بھی کسی انہاک سے کام نہیں لیتے تھے- مگر یہ خدا کی عنایت ہے کہ سب بچے پڑھ لکھ گئے اور نیک معاش رہے - سب بچے مجھی سے مانوس رہے ہیں اس لیے ہر بچے کی مزاجی کیفیت سے میں خوب واقف ہوں - بے دھڑک کہہ سکتا ہوں کہ میرے بھائی کا کوئی بچہ کسی اخلاقی عیب میں مبتلا نہیں ہے - اس کو بھائی صاحب کے مزاج کا ایک پرتو کہہ سکتے ہیں"[2]-

---

۱ - ڈاکٹر آفاق حسین سے گفتگو (ریکارڈنگ)، لکھنؤ ، ۵ جون ۱۹۷۹ء -

۲ - آج کل، نئی دہلی ، فروری ۱۹۷۶ء ، ص ۳۹-

ڈاکٹر نیر مسعود نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ ابا نے ہماری پڑھائی میں بہت زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی اور یہ کام ہمارے چچا ہی دیکھتے تھے۔ البتہ کبھی کبھار پوچھ لیتے تھے کہ کیا پڑھا ہے۔ جب میں نے نیر مسعود سے مسعود حسن کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا ''عجیب بات ہے کہ بچے کو ماں پہلے یاد آتی ہے مگر یادوں کے سلسلے میں ماں کے برعکس مجھے ابا یاد ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ میں سب سے بدصورت بچہ تھا۔ دبلا اور کالا۔ والدہ غصے کا اظہار کرتی تھیں اور ننھیالی عزیزوں کا بھی یہی رویہ تھا۔ ایک دفعہ میں بیمار ہوا تو سب نے کہا کہ اسے تو مر جانا چاہیے۔ مگر ابا کہتے کہ اس سے کوئی محبت نہیں کرتا تو ہم محبت کریں گے۔ چنانچہ مجھے گود میں لے کر ٹہلایا کرتے تھے''۔[1]

مسعود حسن جب تک گھر میں موجود رہتے ایک طرح خاموشی رہتی۔ بچے حتی الوسع ان سے کترانے کی کوشش کرتے تھے۔ اگرچہ بقول ڈاکٹر نیر مسعود ''وہ بچوں کے پیچھے نہیں پڑتے تھے اور نہ ہی بہت زیادہ ڈانٹتے تھے بلکہ اکثر اوقات مطلب ہی نہیں رکھتے تھے، مگر نہ معلوم کیا بات تھی کہ ان کے گھر میں ہونے سے ایک طرح کی ہیبت طاری رہتی تھی''۔[2]

ان تفصیلات سے ایک بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اگرچہ مسعود حسن پورے انہماک اور توجہ کے ساتھ اپنے بچوں کو نہ دیکھ سکے مگر اس کے باوجود وہ ان سے غافل نہیں رہے اور ہر طرح کی اونچ نیچ کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔ اور پھر انھیں اطمینان بھی تھا کہ ان کی بیگم اور چھوٹے بھائی آفاق حسین یہ فرائض بطریق احسن نبھا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سارے بچے شریف، ملنسار اور با اخلاق ہیں اور ان کا نام روشن کیے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر ڈاکٹر نیر مسعود تحقیق و تنقید کے حوالے سے اپنے باپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

آخری علالت اور وفات :

مسعود حسن بچپن ہی سے مختلف بیماریوں کا شکار ہوتے رہے۔ گذشتہ اوراق میں بیماریوں کے ذیل میں ان کا تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے۔ ان بیماریوں نے

۱۔ ڈاکٹر نیر مسعود سے گفتگو (ریکارڈنگ)، لکھنو، ۲ جون ۱۹۷۹ء۔
۲۔ ایضاً۔

آہستہ آہستہ انھیں کمزور اور ضعیف کر دیا تھا ۔ بیگم کے انتقال (۲۳ اکتوبر ۱۹۶۹ء) اور بڑے داماد ڈاکٹر مسیح الزماں کی وفات (۸ فروری ۱۹۷۵ء) کے صدمات نے انھیں قریب المرگ بنا دیا ۔ چنانچہ غم و آلام کی اس یورش کی وجہ سے وہ ۲۹ جولائی ۱۹۷۵ کو پلنگ ہی سے لگ گئے اور کھانے پینے بلکہ بولنے سے بھی انکار کرنے لگے ۔ ان حالات میں ان کی یادداشت اور حافظہ بالکل جواب دے چکا تھا ۔ ڈاکٹر قمر جہاں نے ان کی علالت کے آخری دنوں کی تفصیلات لکھی ہیں ۔ وہ لکھتی ہیں :

”لیٹ جاتے تو اٹھ بیٹھنے کی طاقت نہ تھی اور بٹھا دیا جاتا تو خود سے لیٹ نہ سکتے تھے . . . زندگی سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے . . . انھیں ایک عجیب طرح کی بے چینی تھی جو بیان نہیں ہو پاتی تھی ۔ انھیں یہ احساس شدت سے تھا کہ ان کی زندگی کسی کام کی نہیں رہ گئی ۔ گھر والوں کو ان کی شدید بیماری سے زحمت ہوتی ہے اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ انھیں دنیا چھوڑ دینا چاہیے ۔ گراں گوشی کا ہلکا سا اثر تھا اور موتیابند کی وجہ سے دور کی چیز صاف نظر نہیں آتی تھی ۔ میں نے کھانے کے لیے پوچھا تو کہنے لگے یاد نہیں کیا کھایا ہے لیکن شاید کھا چکا ہوں ۔ گھر کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ انھوں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا . . . انھوں نے ایک بار بھی اپنی بیماری یا کسی تکلیف کا ذکر نہیں کیا ۔ میں نے خود پوچھا تو بولے بس اتنی تکلیف ہے کہ لیٹ جاتا ہوں تو خود سے اٹھ نہیں سکتا اور کوئی بٹھا دیتا ہے تو خود سے لیٹ نہیں سکتا ۔ یہ تکلیف ختم ہو جائے تو چلنے پھرنے لگ جاؤں“[1] ۔

مسعود حسن کے چھوٹے بیٹے اظہر مسعود رضوی نے میرے کہنے پر مسعود حسن کے آخری دنوں پر ایک مضمون[2] لکھا جس کا عنوان ہے ”ابا کے ساتھ آخری دو دن“ اس میں جو تفصیلات درج ہیں اس کے کچھ حصے یہاں دیے جاتے ہیں ۔ اظہر مسعود رضوی لکھتے ہیں :

”۲۸ نومبر ۱۹۷۵ء کی صبح کے وقت جب ادبستان کے صحن میں دھوپ اتر کر آئی تو میں نے ان کا پلنگ پکڑ کر کمرے سے باہر نکالا . . . انھانے

---

۱ ۔ نیا دور، لکھنؤ، مسعود حسن رضوی نمبر، مارچ اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۷۹-۸۰ ۔
۲ ۔ غیر مطبوعہ مضمون موجود ہے ۔

بغیر جسم کا جتنا حصہ صاف ہو سکتا تھا ، پہلے صاف کر دیا ۔ اس کے بعد اُٹھا کر بٹھا دیا ، کپڑے اتارے ، پیٹھ اور کمر میں جو بیڈسورس ہوگئے تھے ان کی صفائی نیم گرم پانی میں جراثیم کش دوائیں ڈال کر اسپنج کے ذریعے کی ۔ ۔ ۔ ڈاکٹروں کی ہدایت تھی کہ گھٹنوں کے کنٹریکچر کو ختم کرنے کے لیے دن بھر کئی دفعہ ٹانگوں کو دھیرے دھیرے سیدھا کرنے کی کوشش کی جائے ۔ صفائی کے بعد ان کو وہیں دھوپ میں لٹا کر ایک ایک پاؤں کے گھٹنے کو ایک ہاتھ سے دبا کر دوسرے ہاتھ سے پیر کا پنجہ پکڑ کر ہلکے سے سیدھا کرنا چاہا تو وہ درد کی شدت سے چیخنے لگے ۔

"ارے گھٹنے ٹوٹے ، گھٹنے ، ارے ظالم چھوڑو"

میں دل پر جبر کرتا ، آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتا ہوا ان کے گھٹنوں کو چلاتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سہ پہر کے قریب جب دھوپ گھر کی مشرقی دیوار پر چڑھنے لگی تو ان کا پلنگ پکڑا کر کمرے میں لے گئے ، شام ہوئی ۔ کئی دن سے ٹھوس غذا کھانے میں دقت ہو رہی تھی اس وجہ سے رقیق چیزیں دی جا رہی تھیں ، مگر آج انھیں نگلنے میں بھی دشواری ہو رہی تھی ۔ بڑی کوششوں اور منت سماجت کے بعد کچھ ذرا سا پیا ۔ چند دن سے پیاس بہت بڑھ گئی تھی ۔ فیڈر یا چمچے سے پانی پلایا جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۸ کی ساری رات سوتے جاگتے گئی ۔ سوتے تو چپ رہتے جاگتے تو کراہنے لگتے ۔ ۔ ۔ ۲۹ نومبر کی صبح نمودار ہوئی ۔ ہم لوگ ان کا پلنگ دھوپ کے ساتھ کمرے سے نکال لائے ۔ برائے نام اُبلا ہوا انڈا کھلانے کی کوشش کی گئی، نہیں کھا سکے، منہ میں لیے رہے ۔ دودھ پلانے کی کوشش کی ۔ بڑی مشکل سے ایک ایک چمچہ کرکے پیا ۔ منہ کھولنے میں دقت ہو رہی تھی ۔ اعصاب ساتھ چھوڑ رہے تھے ۔ ڈاکٹر کی ہدایت پر پانی میں Electral پاؤڈر گھول کر دینا شروع کیا ۔ دو تین چمچے پینے کے بعد اچھو ہونے لگا ۔ روک دیا ۔ پھر دو چمچے دیے ۔ تیسرے چمچے پر پھر اچھو ہو گیا ۔ کھانسی آنے لگی ۔

دوپہر کو ڈاکٹر نے معائنہ کیا ۔ انجکشن ، مکسچر اور گولیاں لکھ دیں اور جاتے جاتے کہہ گیا "ان کی حالت بے حد تشویش ناک ہے ۔ دل کی رفتار بہت سست ہے ۔ آلے کی مدد سے بھی بمشکل سنائی دے رہی ہے ۔ یہ جو انجکشن اور دوائیاں میں نے لکھ دی ہیں اگر ان سے فائدہ نہیں ہوتا تو شام تک ۔ ۔ ۔"

انجکشن لگا دوائیں دی گئیں مگر سب بیکار ۔ حالت بگڑتی چلی گئی . . . شام ہوئی، منجھلے بھائی ڈاکٹر انور مسعود رضوی چار ڈاکٹروں کی ایک ٹیم لے آئے ۔ سب نے معائنہ کیا ۔ کسی کے چہرے پر امید کی روشنی نظر نہیں آئی ۔ ڈاکٹروں کی موجودگی میں حالت اور بگڑی ۔ سینے پر بلغم جمع ہونے کی وجہ سے سانس لینے میں دشواری ہونے لگی ۔ بلغم اتارنے کے لیے سہارا دے کر بٹھایا گیا تو اس قدر تکان ہوا کہ سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی ۔ بٹھانے کے عمل سے بلغم تو نیچے اتر گیا ، سینے کے اندر ہونے والی کھڑکھڑاہٹ بھی بند ہو گئی مگر سانس کی رفتار معتدل نہیں ہوئی . . . انھوں نے پانی مانگا ، ہم نے الکٹرال ملا ہوا پانی چمچے میں دیا . . . . پیاس اتنی شدید تھی کہ ایک چمچہ دینے کے بعد دوسرا چمچہ منہ تک پہنچنے سے پہلے پانی مانگتے تھے ۔ میں جلدی جلدی پانی پلاتا رہا ۔ جب اچھی خاصی مقدار میں پانی پہنچ گیا تو میں ان کا سینہ سہلانے لگا ۔ اس سے ان کو سکون ہوتا محسوس ہوا ۔ ذرا دیر قبل جو کرب کے آثار نمایاں تھے ختم ہونے لگے ۔ چہرہ نارمل ہو گیا ۔ سانس بھی کسی حد تک درست ہو گئی ۔ پپوٹے جھکنے لگے جیسے نیند آ رہی ہو ۔ میں نے پوچھا ”کیا آپ کو نیند آ رہی ہے“ جواب دیا ”ہاں“ اور یہ ہاں ان کے منہ سے نکلنے والا آخری لفظ بن گئی“۔ ڈاکٹر آفاق حسین ، مسعود حسن کے آخری لمحات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”وہ ۲۹ نومبر کی منحوس صبح تھی جب بھائی جان کی سانس قابو سے باہر ہو گئی تھی ۔ سانس کو اعتدال پر لانے کی متعدد ترکیبیں کی گئیں مگر سب رائیگاں گئیں ۔ دو دو ڈاکٹر ایک ساتھ آئے لیکن کچھ حاصل نہ ہوا ۔ ماتھا تو پہلے ہی ٹھنکا ہوا تھا، اب دل بھی دھڑکنے لگے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد زبان پر ”خدا خیر کرے“ کے الفاظ جاری ہونے لگے . . . . میں دو بجے ان کو دوا پلانے گیا تو بھائی جان نے کہا ”آفاق بیٹھو“۔ میں کافی دیر ان کے پاس پلنگ پر بیٹھا رہا ۔ اس جملے کے علاوہ اور کوئی بات انھوں نے نہیں کہی ۔ میں برابر ان کے پاس جا آ رہا تھا ۔ پانچ بجے شام کو جب پھر میں انھیں دوا پلانے گیا تو کہنے لگے ”آفاق ! تم کہاں چلے گئے تھے، بیٹھو“ تعمیل ارشاد میں میں بیٹھ گیا ۔ بھائی جان کی تقریباً چار ماہ کی علالت کے دوران میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے اس روز کی طرح اپنے پاس بیٹھنے کو بار بار کہا ہو . . . یوں تو آخری لمحے تک بھائی جان کے حواس باقی تھے لیکن ان کی ہر

لمحہ گرتی ہوئی حالت سے گھر کا ہر فرد مضطر و پریشان و ششدر تھا ۔ بالآخر وہ گھڑی بھی آ گئی جس کا دھڑکا تھا ۔ اچانک بھائی جان نے پینے کے لیے پانی مانگا ۔ دو گھونٹ پینے کے بعد کہا بس ، اور رخصت ہو گئے''[1]۔

مسعود حسن کا انتقال ۲۹ نومبر ۱۹۷۵ع کو پونے نو بجے شب ہوا اور دوسرے دن ۳۰ ۔ نومبر کو اپنی بیگم کے پہلو میں دفن کیے گئے ۔ ان کی نماز جنازہ سنی اور شیعہ حضرات نے الگ الگ پڑھی ۔ شیعہ حضرات نے مولانا علی نقی کی اقتداء میں اور سنیوں نے مولانا ہاشم میاں فرنگی محلی کی اقتداء میں نماز جنازہ پڑھی ۔

آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے اسی وقت یہ المناک خبر نشر کی گئی ۔ دوسرے دن صبح اخبارات میں بھی خبریں شائع ہوئیں ۔ شمیم متھراوی نے تاریخ وفات اس طرح نکالی :

سنہ پچھتر میں جدا ہو گئے ہم سے یہ لوگ
مسعود حسن رضوی کا ارتحال (۱۹۷۵ع)[2] ۔

''ہماری زبان'' دہلی میں چند قطعات تاریخ شائع ہوئے ۔ ان شعراء میں خیالی بہرائچی ، ڈاکٹر رفیق حسین رفیق لکھنوی ، ساغر لکھنوی اور حکیم عزیز قدوسی کاشوی شامل ہیں ۔ خیالی بہرائچی نے جو مادہ ہائے تاریخ نکالے وہ یہ تھے :

''بزرگ مرثیہ شناس'' (۱۳۹۵ھ) ۔

''اختتامِ داستانِ ادیب'' (۱۹۷۵ع) ۔

ادیبِ ہندوستان سید مسعود حسن رضوی (۱۹۷۵ع)[3]۔

شخصیت ، سیرت و کردار ، عادات و خصائل :

مسعود حسن رضوی کی زندگی کے مطالعے ، ان کے دوستوں ، شاگردوں ، رشتہ داروں اور دوسرے لوگوں کی آرا کی روشنی میں یہ بات کھل کر سامنے آتی

---

۱ - نیا دور، لکھنؤ، مسعود حسن رضوی نمبر، مارچ - اپریل ۱۹۷۵ع، ص ۸۱ -
۲ - قومی زبان کراچی ، مارچ ۱۹۷۶ع ، ص ۴۸ -
۳ - ہماری زبان دہلی ۲۲ دسمبر و یکم جنوری ۱۹۷۶ع ، ص ۷ -

ہے کہ وہ اعلی اخلاق کے حامل تھے ۔ بہت کم گو تھے ۔ بچپن میں خاصے جھینپو تھے۔ ان کا اپنا ایک مزاج تھا ، انداز تھا ، طرزِ گفتگو تھی ، طرز معاشرت تھی ۔ میل جول اور تعلقات کا ایک اپنا رنگ ڈھنگ تھا ۔ یہ اور اسی طرح کی دوسری باتیں اور عادتیں ان کی زندگی کا جزو تھیں اور اپنے لگے بندھے اصولوں سے وہ سرمو بھی انحراف نہیں کرتے تھے ۔ وہ لکیر کے فقیر بھی نہ تھے بلکہ ان میں ایک طرح کا رکھ رکھاؤ اور ایک طرح کی سادگی و شائستگی تھی جو انھیں ایک معزز ہستی بنا دیتی تھی اور دوسروں سے ممیز بھی کرتی تھی ۔ یہاں ان کے مزاج اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی جھلکیاں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ان کی شخصیت کا بھرپور عکس سامنے آ سکے ۔

حلیہ :

مسعود حسن نے مختلف اوقات میں مختلف وضع قطع اختیار کی ہے ۔ جوانی میں داڑھی نہ تھی ۔ پھر داڑھی رکھ لی ۔ اور اسی طرح کی باتیں جن کی وجہ سے ان کے بہت سے احباب نے اپنے طور پر ان کا حلیہ بیان کیا ہے ۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کے بقول :

"متوسط قد ، بلند پیشانی ، گیہواں رنگ جو کبھی کھلتا ہو گا ۔ چہرے پر خود اعتمادی کی جھلک"[1]۔

علی عباس حسینی لکھتے ہیں :

"رنگ نسبتاً زیادہ صاف تھا اور خشخشی داڑھی رکھتے تھے ۔ مگر ان کی بلند اور روشن پیشانی ان کے درخشاں مستقبل کی طرف اشارہ کرتی تھی"[2]

سید علی جواد زیدی نے جو حلیہ بیان کیا ہے اس میں لکھتے ہیں :

"داڑھی کے کبھی گنہکار نہیں ہوئے ۔ مونچھیں بھی آدھی ہی رکھیں ۔ معلوم نہیں ان مونچھوں کو خط بنانے والوں کی اصطلاح میں کیا کہتے ہیں ۔ کوئی مخصوص صفت معلوم نہ ہونے کی حالت میں ان ہلکی پھلکی

---

۱ ۔ فروغ اردو ، لکھنو ، جون ۱۹۵۴ع ۔

۲ ۔ مسعود حسن رضوی ادیب ـــــ ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۲۲ ۔

مونچھوں کو آپ تتلی مارا کہہ سکتے ہیں بشرطیکہ آپ کی نظروں میں
لمبی پرون والی تتلی ہو ۔ بال خوش سلیقہ ہیں ۔ پیچھے کی طرف ذرا بڑے
مگر پٹے سے بہت کم ۔ قد بلند ، جسم صحت مند ، ہونٹ پتلی مگر بے حد
متین مسکراہٹ پر ہمہ وقت آمادہ ۔''[۲]

مرزا محمد عسکری نے داڑھی منڈوانے کا ذکر کیا ہے ، وہ لکھتے ہیں :

''داڑھی منڈاتے ہیں ۔ سر کے بال بوضع اہل ایران پیچھے سے اٹھے اور
بل کھائے ہوئے ۔''[۳]

مرزا جعفر حسین نے البتہ ان کی داڑھی کا ذکر کیا ہے ۔ وہ ان کے حلیے
کے بارے میں لکھتے ہیں :

''۱۹۱۵ء میں جب پہلے پہل دیکھا ہے ، اس وقت عنفوان شباب میں
خشخشی فرنچ کٹ نما داڑھی موجود تھی اور مدت دراز تک موجود رہی ۔
ایران و عراق کے سفر سے واپس آنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں رخصت ہو گئی ۔
مونچھیں ہمیشہ برقرار رہیں لیکن ان کی وضع بدلتی رہی ۔ داڑھی کے ذکر
پر کبھی کبھی کہتے تھے کہ میری داڑھی کو یہ فخر حاصل ہے کہ جب
سے رخساروں پر روئیں ہوئے ہیں ۔ اس وقت سے اس میں استرا کبھی
نہیں لگا ۔''[۴]

مرزا جعفر حسین کے بیان میں ایک طرح کا تضاد بھی ہے اور ایران و
عراق کے سفر سے واپسی کے بعد داڑھی کے رخصت ہونے کا جو ذکر انھوں نے
کیا ہے اس میں انھیں مغالطہ ہوا ہے اس لیے کہ مسعود حسن کی جو تصویریں

---

۱ - مونچھوں کی توصیف مسعود حسن کو پسند نہیں آئی تھی ۔ اس کا تذکرہ
خود علی جواد زیدی نے اختر علی تلہری کے حوالے سے کیا ہے ۔
(نیا دور ، مارچ - اپریل ۱۹۷۵ء ، ص ۱۸)

۲ - آپ سے ملیے ، سید علی جواد زیدی ، ص ۸۶ ۔

۳ - من گہستم ، از مرزا محمد عسکری ، ص ۴۲ ۔

۴ - مسعود حسن رضوی ادیب — حیات و خدمات ، از مرزا جعفر حسین ،
ص ۲۳ - ۲۴ ۔

میری نظر سے گذری ہیں ، ان میں ان کی ہلکی داڑھی موجود ہے اور پھر مرزا جعفر حسین نے خود داڑھی کے بارے میں ان کا بیان نقل کیا ہے ۔

عرفان عباسی نے جو حلیہ بیان کیا ہے اس میں داڑھی کا ذکر نہیں ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

"چھریرا بدن ، لمبا قد ، رعب دار چہرہ ، گندمی رنگ ، ذہین اور مسکراتی آنکھیں ، چہرے پر متانت کے ساتھ عمر رفتہ کے نشان ، چوڑا سینہ ، باوقار شخصیت ، قرینے سے تراشی ہوئی گھنی اور سفید مونچھیں ، سر پر مختصر انگریزی تراش کے سفید بال ، آنکھوں پر خوبصورت فریم والی عینک ، کھڑی ناک" ۔[1]

امیر حسن نورانی نے انھیں ۱۹۳۸ء میں پہلی بار دیکھا تھا ۔ اس وقت کا حلیہ وہ اس طرح بیان کرتے ہیں :

"میانہ قد ، دہرا بدن ، کھلتا ہوا گندمی رنگ"۔[2]

ڈاکٹر سلام سندیلوی کی ۱۹۵۵ء میں مسعود حسن سے پہلی ملاقات ہوئی ۔ وہ مسعود حسن کے حلیے کے بارے میں لکھتے ہیں :

"رنگ گندمی ، بدن قدرے فربہ ، لمبا قد ، سینہ چوڑا ، چہرے پر سنجیدگی اور متانت ۔"[3]

ان تحریروں کی روشنی میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ مسعود حسن اگر وجیہ نہ تھے تو قبول صورت ضرور تھے اور ان کے چہرے مہرے میں ایک کشش ضرور تھی ۔ ان بیانات کو سامنے رکھ کر مسعود حسن کی جو تصویر سامنے آتی ہے اس کے مطابق ان کا حلیہ کچھ یوں تھا ۔

لمبا قد ، گندمی رنگ ، چوڑا چہرہ ، ہلکی داڑھی اور مونچھیں ، بال پیچھے کی طرف ذرا بڑے ، بڑی بڑی آنکھیں ، کھڑی ناک اور روشن پیشانی ، سنجیدگی اور متانت ٹپکتی ہوئی ـــــ اس حلیے سے ان کی شخصیت پروقار اور بارعب لگتی تھی ۔

---

۱ ۔ آپ ، از عرفان عباسی ، ص ۶۹ ۔
۲ ۔ نیا دور ، لکھنو ، مسعود حسن رضوی نمبر، مارچ اپریل ۱۹۷۷، ص ۳۷ ۔
۳ ۔ ایضاً ، ص ۵۵ ۔

لباس :

مسعود حسن رضوی لباس کے معاملے میں خاصے احتیاط پسند تھے ۔ ان کا لباس ہمیشہ جاذبِ نظر ہوتا تھا ۔ یونیورسٹی میں ہمیشہ وہ سوٹ پہن کر جایا کرتے تھے اور شہر کی تقاریب میں شیروانی پہنتے تھے اور اس معاملے میں وہ خاصی پابندی کرتے تھے۔ زمانہ طالب علمی میں بھی وہ لباس کی طرف بہت توجہ دیتے تھے ۔ مرزا جعفر حسین لکھتے ہیں :

”اس وقت بھی بہت صاف و شفاف کپڑے پہننے کا شوق تھا ۔ کرمچ کا جوتا پہنتے تھے مگر ہر دوسرے تیسرے دن مہندی ہو جانا لازمی تھا۱۔“

مرزا محمد عسکری لباس کے بارے میں رقم طراز ہیں :

” کپڑا اچھے سے اچھا اور نہایت عمدہ سلا ہؤا پہنتے ہیں ، جس سے جسم کا حسن ظاہر ہو ۔ نہ کہ آدمی بیجا لگنے لگے ۔۲“

مسعود حسن لباس کو اپنی شخصیت کا جزو سمجھتے تھے اس لیے ان کے مختلف وقتوں کے پہناووں میں کوئی فرق نہ آیا ۔

ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں :

”اگر یونیورسٹی سے واپسی ہوتی تو وہ عمدہ سلا ہوا سوٹ اور اونچی ایرانی ٹوپی پہنے ہوتے ورنہ علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ ، شیروانی اور اس کے ساتھ ٹوپی—اپنی سرکاری حیثیت میں مسعود ہمیشہ کوٹ اور ذاتی حیثیت میں ہمیشہ شیروانی پہنتے تھے ۔ تحقیقی کام کی دشواریوں کے ذکر میں کبھی کبھی وہ اپنے اس التزام کی مثال دیتے اور کہتے ہمارا یونیورسٹی کا کوئی ساتھی ہمارے بارے میں لکھ سکتا ہے کہ میں مسعود صاحب کو تیس برس سے قریب قریب روز دیکھ رہا ہوں ، وہ سوٹ کے سوا کوئی لباس نہیں پہنتے۔ اور شہر کا کوئی ملاقاتی لکھ سکتا ہے کہ میں مسعود حسن صاحب کو تیس سال سے مسلسل دیکھ رہا ہوں ، وہ ہمیشہ شیروانی پہنتے ہیں ۔۳“

---

۱ ۔ ادبیات و شخصیات ، از مرزا جعفر حسین ، ص ۲۰۵ ۔

۲ ۔ من کیستم ، از مرزا محمد عسکری ، ص ۱۷ ۔

۳ ۔ نیا دور ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ ۔ اپریل ۱۹۸۷ء ، ص ۲۹ ۔

ان سے ملنے والے مختلف موسموں میں ان سے ملاقات کرنے آتے تو وہ گھر پر یا یونیورسٹی میں جس لباس میں ہوتے اس کا ذکر بہت سے لوگوں نے اپنے مضامین میں کیا ہے ۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی جن کی ۱۹۴۵ء میں مسعود حسن سے پہلی ملاقات ہوئی تھی ، ان کے لباس کے بارے میں لکھتے ہیں :

پروفیسر صاحب جاڑوں میں یونیورسٹی زیادہ تر سوٹ پہن کر جاتے تھے مگر سر پر سیاہ ایرانی ٹوپی ہوتی تھی ۔ اس کے علاوہ جاڑوں میں سیاہ شیروانی بھی پہنتے تھے ۔ گرمیوں میں وہ عام طور پر سوتی شیروانی میں ملبوس نظر آتے تھے۔ گھر پر گرمیوں میں پتلی مُہری کا پاجامہ ، تن زیب کا کرتہ اور پاؤں میں سلیپر پہنتے تھے۔ جاڑوں میں سوتی قمیض پر سوئیٹر بھی ہوتا تھا[1]۔"

سید علی جواد زیدی نے مسعود حسن رضوی کا خاکہ لکھتے ہوئے اس میں لباس کا ذکر بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"آپ کوٹ بھی پہنتے ہیں اور شیرانی بھی لیکن ٹوپی کے معاملے میں وضع دار ہیں ۔ سیاہ بالدار ٹوپی جو پرانی کشتی نما ٹوپی اور پرانی ایرانی ٹوپی کے درمیان مصالحت کرا کے وجود میں لائی گئی ہے سوٹ کی رفیقۂ تنہائی ہے لیکن شیراونی کی شریکِ زندگی معمولی کشتی نما ٹوپی — ایسی ٹوپی سے آپ انھیں پہچان سکتے ہیں ۔[2]"

یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرکاری حیثیت میں انھیں سوٹ پسند تھا جس پر وہ ایرانی طرز کی ٹوپی پہنتے تھے مگر عام حیثیت میں وہ شیروانی ، کرتا پاجامہ پسند کرتے تھے ۔

طرزِ معاشرت :

مسعود حسن نے اپنی ابتدائی زندگی خاصی تنگدستی میں گزاری تھی ، لیکن جب وہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہوئے تو انھوں نے اپنا معیارِ زندگی اونچا کر لیا ۔ سواری کے لیے پہلے موٹر تھی ، پھر بعد میں تانگہ تھا ۔ وہ "ادبستان" نامی

---

۱ ۔ ایضاً ، ص ۵۵ ۔

۲ ۔ آپ سے ملیے ، از علی جواد زیدی ، ص ۸۶ ۔

عالی شان کوٹھی نما مکان میں رہائش پذیر تھے جو فن تعمیر کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے ۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے سادگی کو نہ چھوڑا اس لیے کہ وہ ظاہری تکلف کے قائل نہ تھے۔ ویسے وہ ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کرتے تھے ۔ مرزا محمد عسکری ، جن کا مسعود حسن کے ہاں آنا جانا تھا ان کی طرز معاشرت کے بارے میں لکھتے ہیں :

"آپ تمدن کے عناصر ثلثہ یعنی خوراک ، پوشاک اور مکان کے بہترین برتنے والے ہیں ۔ کھانا بہت اچھا کھاتے ہیں ۔ کپڑا اچھے سے اچھا اور نہایت عمدہ سلا ہوا پہنتے ہیں۔ . . . آپ کا مکان دین دیال روڈ پر عرش سے فرش تک یعنی چھت سے زمین تک آپ کی جودت طبع اور خوش مذاق کا بہترین ثبوت ہے ۔[1]"

مرزا محمد عسکری کے اس بیان کی تصدیق علی عباس حسینی نے بھی کی ہے ۔ مسعود حسن رضوی مکان کی سجاوٹ میں بھی خاصی دلچسپی لیتے تھے ۔ اس بارے میں ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں :

"ڈرائنگ روم وکٹوریائی صوفوں ، آبنوسی رنگ کی گدے دار کرسیوں اور ایرانی قالینوں سے آراستہ تھا لیکن ملاقاتیوں کے لیے شاذ و نادر کھولا جاتا ۔ ڈرائنگ روم کے سامنے والے برآمدے میں کرسیاں رہتیں تھی ۔ انھی میں ایک بڑی آرام کرسی تھی جس پر مسعود بیٹھتے تھے۔[2]"

مسعود حسن رضوی غذا کے معاملے میں بھی خاصے نفاست پسند تھے اور اچھے سے اچھا کھاتے تھے ۔ ڈاکٹر قمر جہاں غذا اور کھانے کے معمولات کے بارے میں لکھتی ہیں :

"بارہ بجے تک دوپہر کا کھانا کھاتے ۔ کم خوراک تھے مگر اچھا کھانا کھانا پسند کرتے تھے۔ مقررہ مقدار سے زیادہ کبھی نہ کھاتے تھے ۔ فصل کے کھانے اور پھل بہت پسند کرتے تھے۔ ہرے چنے کا ساگ ، لہسن کی چٹنی کے ساتھ ، دیسی گھی کے ساتھ ماش کے آٹے کی روٹی ، رگھونیے ، مونگچھیاں ، سینڈے اور بھنبوریاں وغیرہ بہت پسند کرتے تھے۔[3]"

---

۱ ۔ من کیستم ، از مرزا محمد عسکری ، ص ۸۱ ۔
۲ ۔ نیا دور ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ ۔ اپریل ۱۹۷۷ع ، ص ۳۹ ۔
۳ ۔ ایضاً ، ص ۴۷ ۔

ڈاکٹر آفاق حسین نے ان کی پسند کی چیزوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"فصل میں جوار ، باجرہ اور بیسن کی روٹیاں ضرور پکواتے تھے اور ان روٹیوں کی مناسبت سے کچنار کی کلیاں ، واہ واہ کی پھلیاں اور اسی قبیل کی ترکاریوں کا ہونا بھی ضروری تھا۔ بیسنی روٹی کے ساتھ چولائی کا ساگ ضرور پکواتے تھے اور لہسن مرچ کی چٹنی میں ہینگ خود اپنے ہاتھ سے ملاتے تھے . . . گمرقوں کی فصل میں گمرقوں کو ضرور منگواتے تھے۔ گیہوں کی فصل میں کچے اور پکے گیہوں کا کھٹا اور میٹھا کچلا ضرور بنواتے تھے . . . کھانے میں تاکیدیں وغیرہ تو بہت کرتے تھے مگر خود دو تین چپاتیوں سے زیادہ نہیں کھاتے تھے۔"[۱]

مسعود حسن کو اچار بنانے کا بھی بڑا شوق تھا اور اس کے لیے خاصا اہتمام کرتے تھے۔ مہمانوں کی آؤ بھگت بھی خاصی کرتے تھے مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ بڑے کفایت شعار تھے اور بار بار بیوی سے تاکید کرتے تھے کہ خرچ کا خیال رکھو۔ ریٹائرمنٹ کے بعد معیارِ زندگی بہت نیچا کر دیا۔ نوکر بھی کم کر دیے، تانگہ بھی الگ کر دیا۔ معمولی کھانے پر گزارا کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا محمد عسکری نے "من کیستم" میں اس خوبی کا برملا اظہار کیا ہے کہ ہم مسعود صاحب سے سیکھنا چاہیے کہ اپنی استطاعت کے لحاظ سے کس طرح رہنا چاہیے۔

طرزِ گفتگو :

مسعود حسن سنجیدگی اور متانت کا مجسمہ تھے اور نیکی و شرافت کا پیکر۔ ان کی گفتگو میں ایک طرح کا رکھ رکھاؤ اور ٹھہراؤ ہوتا تھا۔ وہ کم گو تھے مگر جب بولنے پہ آتے تھے تو لوگ گھنٹوں خاموشی سے سنتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی اس بارے میں رقم طراز ہیں :

"باتیں سنیے تو ایسی مزیدار اور پر معلومات کہ اگر آپ کو فرصت ہو تو گھنٹوں سنا کیجیے اور آپ کا جی نہ بھرے۔ زبان ایسی صاف ، شستہ اور ڈھلی ہوئی گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ان کے منہ سے ہر

۱۔ آج کل ، نئی دہلی ، فروری ۱۹۷۶ء ، ص ۳۸۔

لفظ جچا تلا نکلتا ہے ۔ ان کے منہ سے کوئی لفظ غلط یا محاورہ ٹکسال باہر آپ نہ سنیں گے ۔ تقریر نہایت مدلل ، مستحکم اور مفصل کرتے ہیں ۔ ایسی کہ بحث طلب مسئلے کا کوئی گوشہ حتی الوسع تشنہ نہیں رہتا ۔ یہ تقریریں اردو میں ہوں یا انگریزی میں ، ہندی میں ہوں یا فارسی میں ، نہایت روانی ، فصاحت اور شستہ زبان میں کل افشانیاں ہوتی ہیں ۔"[1]

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کے اس بیان کی تصدیق شوکت تھانوی کی اس تحریر سے ہوتی ہے ۔ مسعود حسن کی گفتگو پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ان کو اردو بولتا ہوا سن کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مزے لے لے کر مٹھائی کھا رہا ہو ۔ وہ ایک ایک لفظ سے ایسا مزہ لیں گے اور ان کے چہرے پر ایسا انبساط ہوگا کہ سننے والے کے منہ میں پانی بھر آئے ۔ ویسے بھی ان میں رہنے سہنے ، اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا بڑا سلیقہ ہے ۔"[2]

مرزا جعفر حسین الطاف احمد عباسی کا بیان نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :
"مسعود صاحب کی گفتگو میں خشکی نہیں ہوتی بلکہ ان کی باتوں میں ایک خاص ادبی لطافت اور شگفتگی ہوتی ہے ۔"[3]

ڈاکٹر اعجاز حسین نے ان کے طرزِ استدلال پر بات کرتے ہوئے لکھا ہے :
"مرکزی اور ٹھوس باتوں پر ایسے بے لاگ اور مطمئن انداز میں گفتگو کرتے ہیں کہ ان کے نقطۂ نظر سے مخالفت کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ آپ چاہیں تو ان کے خیال میں اضافہ کر سکتے ہیں لیکن ان کے طرزِ استدلال سے اثر نہ لینا آسان نہیں ۔"[4]

علی جواد زیدی نے مسعود حسن کی طرزِ گفتگو اور ان کی محفلوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

---

۱ ۔ فروغ اردو ، لکھنؤ ، جون ۱۹۵۳ع ۔

۲ ۔ نقوش ، شخصیات نمبر (حصہ اول) جنوری ۱۹۵۵ ، ص ۵۴۲ ۔

۳ ۔ مسعود حسن رضوی ادیب ۔ حیات و خدمات ، از مرزا جعفر حسین ، ص ۳۵ ۔

۴ ۔ مختصر تاریخ ادبِ اردو (گیارھواں ایڈیشن) از ڈاکٹر اعجاز حسین ، ص ۴۹۵ ۔

"ان کے ملاقاتیوں میں ان سے علمی اور مالی اعتبار سے بہت کم تر لوگ بھی ہیں لیکن کبھی کسی کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے سے بڑے سے بات کر رہا ہے۔ بات کرتے وقت مسعود صاحب یا تو مخاطب کو اپنی سطح پر لے آتے ہیں یا خود مخاطب کی سطح پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح معاشرت کی دیواریں گر جاتی ہیں اور یگانگت و مساوات کی ہلکی روشنی چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔"[1]

ڈاکٹر نیر مسعود نے اس سلسلے میں کافی تفصیلات بتائی ہیں۔ انداز گفتگو کے بارے میں اور ملنے جلنے کے انداز پر گفتگو کرتے ہوئے وہ بیان کرتے ہیں :

"معمر ہونے کے باوجود بھی بلند آواز تھی۔ ملنے والوں کو برآمدے میں بٹھایا جاتا تھا۔ گفتگو کا ایک ایک لفظ اندر سنائی دیتا تھا اور یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ شخص جس سے مسعود صاحب گفتگو کر رہے ہیں دنیاوی اعتبار سے کس پائے کا ہے۔ ہاں ذہنی اعتبار سے طالب علم ہے، عالم ہے یا مزدور سے بات کر رہے ہوتے تو پتہ لگ جاتا تھا۔ مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق موضوعات تبدیل ہوتے رہتے تھے مگر لہجے میں کبھیں بھی لجاجت نہیں آنے کی۔ راجہ صاحب محمود آباد جیسے رئیس آتے تھے تو ایسے انداز میں جیسے کہ گھر والوں سے بات کرتے، ان سے بھی گفتگو کرتے۔ یہ نہیں تھا کہ بڑا آدمی آئے تو تپاک سے ملیں اور معمولی آدمی سے تپاک نہ دکھائیں۔"[2]

یوں مسعود حسن بہت احتیاط سے گفتگو کرتے تھے۔ زائد جملے اور فقرے نہیں بولتے تھے اور نہ ہی غلط تلفظ ہوتا تھا۔ اس بارے میں ڈاکٹر محمد حسن کا یہ بیان خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"میں نے زندگی میں مسعود صاحب کے علاوہ دوسرا کوئی اردو دان نہیں دیکھا جو گفتگو میں اس قدر احتیاط برتتا ہو کہ اس کی زبان سے کوئی غلط لفظ، غلط تلفظ یا کوئی فقرہ غلط ترتیب سے نکلے۔"[3]

---

۱ - آپ سے ملیے، از علی جواد زیدی، ص ۸۵ - ۸۶ -
۲ - ڈاکٹر نیر مسعود سے گفتگو (ریکارڈنگ لکھنو، ۲ جون ۱۹۷۹ع -
۳ - آج کل، نئی دہلی، اپریل ۱۹۷۱ع، ص ۶ -

لفظ جچا تلا نکلتا ہے ۔ ان کے منہ سے کوئی لفظ غلط یا محاورہ ٹکسال باہر آپ نہ سنیں گے ۔ تقریر نہایت مدلل ، مستحکم اور مفصل کرتے ہیں ۔ ایسی کہ بحث طلب مسئلے کا کوئی گوشہ حتی الوسع تشنہ نہیں رہتا ۔ یہ تقریریں اردو میں ہوں یا انگریزی میں ، ہندی میں ہوں یا فارسی میں ، نہایت روانی ، فصاحت اور شستہ زبان میں گل افشانیاں ہوتی ہیں ۔"[1]

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کے اس بیان کی تصدیق شوکت تھانوی کی اس تحریر سے ہوتی ہے ۔ مسعود حسن کی گفتگو پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ان کو اردو بولتا ہوا سن کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مزے لے لے کر مٹھائی کھا رہا ہو ۔ وہ ایک ایک لفظ سے ایسا مزہ لیں گے اور ان کے چہرے پر ایسا انبساط ہوگا کہ سننے والے کے منہ میں پانی بھر آئے ۔ ویسے بھی ان میں رہنے سہنے ، اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا بڑا سلیقہ ہے ۔"[2]

مرزا جعفر حسین الہیں احمد عباسی کا بیان نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :
"مسعود صاحب کی گفتگو میں خشکی نہیں ہوتی بلکہ ان کی باتوں میں ایک خاص ادبی لطافت اور شگفتگی ہوتی ہے ۔"[3]

ڈاکٹر اعجاز حسین نے ان کے طرزِ استدلال پر بات کرتے ہوئے لکھا ہے :
"مرکزی اور ٹھوس باتوں پر ایسے بے لاگ اور مطمئن انداز میں گفتگو کرتے ہیں کہ ان کے نقطۂ نظر سے مخالفت کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ آپ چاہیں تو ان کے خیال میں اضافہ کر سکتے ہیں لیکن ان کے طرزِ استدلال سے اثر نہ لینا آسان نہیں ۔"[4]

علی جواد زیدی نے مسعود حسن کی طرزِ گفتگو اور ان کی محفلوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

---

۱ ۔ فروغ اردو ، لکھنؤ ، جون ۱۹۵۴ء ۔

۲ ۔ نقوش ، شخصیات نمبر (حصہ اول) جنوری ۱۹۵۵ء ، ص ۵۴۲ ۔

۳ ۔ مسعود حسن رضوی ادیب ۔ حیات و خدمات ، از مرزا جعفر حسین ، ص ۳۵ ۔

۴ ۔ مختصر تاریخ ادبِ اردو (گیارھواں ایڈیشن) از ڈاکٹر اعجاز حسین ، ص ۳۹۵ ۔

"ان کے ملاقاتیوں میں ان سے علمی اور مالی اعتبار سے بہت کم تر لوگ بھی ہیں لیکن کبھی کسی کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے سے بڑے سے بات کر رہا ہے۔ بات کرتے وقت مسعود صاحب یا تو مخاطب کو اپنی سطح پر لے آتے ہیں یا خود مخاطب کی سطح پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح معاشرت کی دیواریں گر جاتی ہیں اور یگانگت و مساوات کی ہلکی روشنی چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔"[1]

ڈاکٹر نیر مسعود نے اس سلسلے میں کافی تفصیلات بتائی ہیں۔ انداز گفتگو کے بارے میں اور ملنے جلنے کے انداز پر گفتگو کرتے ہوئے وہ بیان کرتے ہیں :

"معمر ہونے کے باوجود بھی بلند آواز تھی۔ ملنے والوں کو برآمدے میں بٹھایا جاتا تھا۔ گفتگو کا ایک ایک لفظ اندر سنائی دیتا تھا اور یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ شخص جس سے مسعود صاحب گفتگو کر رہے ہیں دنیاوی اعتبار سے کس پایے کا ہے۔ ہاں ذہنی اعتبار سے طالب علم سے، عالم سے یا مزدور سے بات کر رہے ہوتے تو پتہ لگ جاتا تھا۔ مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق موضوعات تبدیل ہوتے رہتے تھے مگر لہجے میں کہیں بھی لجاجت نہیں آنے کی۔ راجہ صاحب محمود آباد جیسے رئیس آتے تھے تو ایسے انداز میں جیسے کہ گھر والوں سے بات کرتے، ان سے بھی گفتگو کرتے۔ یہ نہیں تھا کہ بڑا آدمی آئے تو تپاک سے ملیں اور معمولی آدمی سے تپاک نہ دکھائیں۔"[2]

یوں مسعود حسن بہت احتیاط سے گفتگو کرتے تھے۔ زائد جملے اور فقرے نہیں بولتے تھے اور نہ ہی غلط تلفظ ہوتا تھا۔ اس بارے میں ڈاکٹر محمد حسن کا یہ بیان خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"میں نے زندگی میں مسعود صاحب کے علاوہ دوسرا کوئی اردو داں نہیں دیکھا جو گفتگو میں اس قدر احتیاط برتتا ہو کہ اس کی زبان سے کوئی غلط لفظ، غلط تلفظ یا کوئی فقرہ غلط ترتیب سے نکلے۔"[3]

---

۱ - آپ سے ملیے، از علی جواد زیدی، ص ۸۵ - ۸۳ -
۲ - ڈاکٹر نیر مسعود سے گفتگو (ریکارڈنگ) لکھنو، ۲ جون ۱۹۷۹ء -
۳ - آج کل، نئی دہلی، اپریل ۱۹۷۱ء، ص ۷ -

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسعود حسن کو بچپن ہی سے صحیح اُردو اور صحیح تلفظ بولنے کی تربیت دی گئی تھی۔ ان کی نانی خود اہلِ زبان تھیں اور اپنے نواسے کی زبان پر بڑی روک ٹوک رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسعود حسن تلفظ کی طرف خاص دھیان دیتے تھے۔ اور تلفظ کی غلطی ان کے ہاں ناقابل معافی ہوتی تھی، اور یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی غلط بولے اور مسعود حسن نہ پکڑیں۔ ڈاکٹر نیر مسعود بتاتے ہیں:

"تلفظ کی غلطی پر ڈانٹیں بھی کھائیں۔ بار بار صحیح صورت میں دہرواتے تھے۔"[1]

تلفظ کے بارے میں پروفیسر سید حسن اور امیر حسن نورانی نے بھی تصدیق کی ہے کہ وہ غلطیوں کی گرفت اور ان کی اصلاح پر آمادہ رہتے تھے۔

حافظہ اور نسیان:

مسعود حسن رضوی کا حافظہ بلند کا تھا۔ اگرچہ بچپن ہی سے دردِ سر کی تکلیف کا شکار ہوگئے تھے مگر خدا نے انھیں ایسا ملکہ عطا کیا تھا کہ انھیں ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے اور وہ بیت بازی میں پوری ٹیم کو ہرا دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر آفاق حسین اس بارے میں لکھتے ہیں:

"میرے بھائی کا حافظہ قابلِ رشک تھا۔ جو چیزیں انھوں نے نیچے کے درجوں میں پڑھی تھیں وہ بڑھاپے میں بھی انھیں یاد تھیں۔ ایک زمانے میں ان سے بیت بازی ہوا کرتی تھی۔ سارے گھر کے افراد اور جتنے دیوان گھر میں موجود ہوتے وہ سب ایک طرف اور بھائی جان تنہا ایک طرف ہوتے تھے۔ وہ کسی ایک حرف کو پکڑ لیتے تھے اور شروع سے آخر تک ہر شعر اس حرف پر ختم ہوا کرتا تھا۔ ہم لوگوں کا ہر طرح کا اسٹاک، ایمانداری اور بے ایمانی سب ختم ہو جاتا تھا۔"[2]

مسعود حسن رضوی کے حافظے کے بارے میں علی عباس حسینی کا بیان قابلِ توجہ ہے۔ لکھتے ہیں:

۱۔ ڈاکٹر نیر مسعود سے گفتگو (ریکارڈنگ) لکھنؤ، ۲ جون ۱۹۷۹ء۔

۲۔ آج کل، نئی دہلی، فروری ۱۹۷۶ء، ص ۳۹۔

"جس چیز کو دھیان دے کر دو تین بار پڑھ لیتے وہ حرف بہ حرف یاد ہو جاتی تھی ۔ شعرا تو بہت سے ایسے دکھائی دیے جنھیں اپنے کلام کے سینکڑوں شعر زبانی سنانے میں کوئی تامل نہیں ہوتا مگر سوائے مسعود صاحب کے کوئی صاحبِ طرز نثرنگار میری نظر سے نہیں گزرا جو اپنے مضامین کے صفحے کے صفحے زبانی سناتا چلا جائے[1] ۔"

اسی طرح مختار الدین احمد اپنی ایک ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ ان کا حافظہ بہت اچھا ہے ۔ واقعات کی جزئیات تک یاد ہیں ۔ بیس پچیس سال پہلے کی باتیں انھوں نے بقیدِ سنین سنائیں۔"[2]

ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر سلام سندیلوی نے بھی ان کے قابلِ رشک حافظے کی تعریف کی ہے ۔ ڈاکٹر قمر جہاں اس بارے میں لکھتی ہیں :

"ایک ایک کتاب کے مشتملات انھیں ایسے ازبر یاد تھے جیسے وہ زندگی بھر اسی کتاب کا مطالعہ کرتے رہے ہوں ۔ ہزاروں اشعار اور نثر کے اقتباسات بڑی روانی سے سناتے چلے جاتے تھے ۔ بات کرنے میں بھی واقعات کی ترتیب اور الفاظ کے انتخاب کا بہت خیال رکھتے تھے ۔ کئی واقعات بار بار ان کی زبان سے سنئے لیکن کسی واقعے کی ترتیب میں فرق نہ آتا تھا ۔ الفاظ کی نشست اور جملوں کی ساخت بھی نہیں بدلتی تھی ۔"[3]

اس بات کی تصدیق ڈاکٹر صفدر آہ نے بھی کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

"آج سے تیس پینتیس سال پہلے جو بات انھوں نے بیان کی تھی اگر آج بھی وہ اسے دہراتے ہیں تو بلا کم و کاست وہی لفظ وہی بات بلکہ جملوں اور لفظوں کے ادا کرنے کا لہجہ بھی وہی ہوتا ہے جو اس وقت تھا ۔ یہ ان کے تحقیقی مزاج ، سلامتیٔ طبع اور حافظے کی ایسی خصوصیت ہے جو شاذو نادر ہی کہیں مل سکے گی ۔"[4]

---

۱ ۔ مسعود حسن رضوی ادیب — ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۲۶ ۔
۲ ۔ ایضاً ، ص ۸۷ ۔
۳ ۔ نیا دور ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ ۔ اپریل ۱۹۷۷ء ، ص ۵۶ ۔
۴ ۔ مسعود حسن رضوی ادیب — حیات و خدمات ، از مرزا جعفر حسین ، ص ۳۲ ۔ ۳۳ ۔

جہاں مسعود حسن کا حافظہ بلند کا تھا وہاں آخری عمر میں وہ نسیان کے مریض ہو گئے تھے ۔ بیماری کے زمانے میں وہ اکثر بھول جاتے تھے کہ انھوں نے کھانا کھایا ہے یا نہیں ۔ ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں :

''بیماری اور خاص طور پر آخری بیماری کے دلوں میں ان کا حافظہ ایسا متاثر ہوا کہ ان کے ذہن میں ادبستان کا نقشہ محو ہو گیا ۔ چار مہینے کے مرض الموت میں کئی مرتبہ انھوں نے ادبستان کی تصویر منگوا کر اس کے نیچے اور اوپر کے کمروں کی تفصیل پوچھی اور اسے ذہن نشین کرنے کی ناکام کوشش کی ۔''[۱]

خوش مزاجی :

مسعود حسن اگرچہ متانت اور سنجیدگی کا نمونہ تھے اور کسی طرح اس کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے اور عام طور پر قہقہہ بھی نہیں لگاتے تھے، بلکہ زیر لب مسکراہٹ ہوتی تھی ، مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں خوش مذاق کا عنصر موجود تھا ۔ علی جواد زیدی نے درست لکھا ہے :

''ایسا نہیں کہ ان کی روزمرہ زندگی میں تبسموں اور قہقہوں کی یا ہلکے پھلکے لمحوں کی کمی ہے ۔ نہیں یہ سب انھیں بے حد مرغوب ہیں ۔ نہ تو وہ زاہد خشک ہیں اور نہ عالم متقطع ۔''[۲]

علی عباس حسینی ان کے زمانۂ طالب علمی کا ذکر کرتے ہوئے تفصیل سے بتاتے ہیں جب وہ ، مسعود حسن اور مرزا حامد حسین امامیہ بورڈنگ ہاؤس میں مقیم تھے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''مرزا جی شرارتوں کے منبع تھے ۔ مرزا نے تحریک پیش کی کہ چونکہ قہقہہ اور ہنسی زندگی بڑھاتی ہے اس لیے حفظانِ صحت کے اصول کے تحت ایک قہقہہ کلب قائم کیا جائے جس کا مخصوص کام یہ ہوگا کہ ہم بالائی حصے کے طلبا ہر روز سہ پہر کو ایک جگہ جمع ہو کر ہنسنے اور قہقہہ لگانے کی ورزش کریں گے ۔ مسعود صاحب کی ظاہری متانت نے ایک

---

۱ ۔ نیا دور ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ ۔ اپریل ۱۹۷۷ء ، ص ۳۲ ۔
۲ ۔ آپ سے ملیے، از علی جواد زیدی ، ص ۸۵ ۔

دو دن بس و پیش کرنے پر مجبور کیا مگر فطری ظرافت غالب آئی اور وہ بھی انجمن قہقہہ بازاں کے رکن رکین بن گئے۔[1]"

مسعود حسن میں فطری طور پر ظرافت کا مادہ تھا ۔ بعض اوقات وہ دلچسپ اور ہنسانے والی باتیں کیا کرتے تھے ۔ خاص طور پر انھیں نقلیں آتارنے میں ملکہ حاصل تھا ۔ ڈاکٹر نیر مسعود اس بارے میں لکھتے ہیں :

"وہ لوگوں کے ہکلانے ، باریک اور موٹی آوازوں میں بولنے ، دیہاتی لہجوں ، مختلف طبقوں کی عورتوں کی بولیوں اور ہم عصر شاعروں کے تحت اللفظ اور ترنم سے پڑھنے کی اس قدر عمدہ نقلیں آتارتے تھے کہ کچھ دیر کے لیے ان کی اپنی شخصیت کہیں غائب ہو جاتی تھی ۔ ہم لوگ کہتے "ابا وہ حقے والے صاحب کی نقل کیجیے"۔ اور وہ ایک عجوب سی مسکراہٹ کے ساتھ بتانا شروع کرتے کہ کس طرح ان صاحب نے ہکلا ہکلا کر ایک لفظ حقہ ادا کیا ۔"

"ح - - - - ح - - - - - حُو - - - - حو - - - - حوق - - - - - حوق - - - - حوئے - - - - حوئے - - - - حوئے - - - - یہاں تک پہنچتے پہنچتے مسعود کی آنکھیں باہر نکل آتیں ۔ وہ زور زور سے سینہ پیٹنے لگتے اور ان کی آواز اتنی بلند ہو جاتی کہ دروازوں کے پٹ جھنجھنانے لگتے ۔ دیر تک ادبستان کے بام و در ہلتے رہتے۔ پھر ایک دم رک کر بڑے سکون سے کہتے "حقہ"۔ ایک بار اس نقل کے عین بیچ ان کی سسرال کی کچھ سواریاں اتریں ۔ ان میں سے دو خواتین کو ڈیوڑھی سے صحن تک آتے آتے اختلاج کے دورے پڑ گئے۔[2]"

مذہب سے وابستگی :

مسعود حسن رضوی کٹر قسم کے مذہبی آدمی تھے ۔ عقیدے کے اعتبار سے شیعہ تھے ، مگر ان میں کسی قسم کا تعصب نہ تھا ۔ مگر وہ عقیدے کو پسند یا ناپسند کا معیار بننے نہیں دیتے تھے۔ وہ اپنے اور دوسرے کے مذہبی عقائد کے بارے میں کبھی بھی گفتگو نہیں کرتے تھے اور مذہبی رواداری کے قائل تھے ۔

---

۱ - مسعود حسن رضوی ادیب — ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۲۳ ۔

۲ - نیا دور، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ - اپریل ۱۹۷۷ع ، ص ۳۰ ۔

مذہبی ہونے کی وجہ سے انھوں نے ''انگارے'' کی اشاعت پر بڑی نا رضامندی کا اظہار کیا تھا ، لیکن کسی سے تعلقات خراب نہ کیے ۔ انھوں نے تمام زندگی مذہب کو مسئلہ نہیں بنایا ۔ البتہ اپنے معتقدات پر سختی سے کار بند رہے ۔ علی جواد زیدی لکھتے ہیں :

''مسعود صاحب کا شمار ثقہ لوگوں میں تھا ۔ وہ اوامر و نواہی پر سختی سے عامل رہا کیے ہیں ۔ روزوں کا حال معلوم نہیں لیکن نمازیں پابندی سے پڑھتے تھے[۱]۔''

مولانا علی نقی عرف مولانا نقن صاحب شیعہ مکتب فکر کے معروف عالم ہیں ۔ ان سے مسعود حسن رضوی کے بارے میں اور خاص طور پر ان کے عقائد کے متعلق گفتگو ہوئی تو انھوں نے بتایا ۔ ''شروع شروع میں جب یونیورسٹی میں مسعود صاحب سے ملاقاتیں ہوتی تھیں تو ہم ان کو مذہب سے قدرے بیگانہ اور نماز وغیرہ سے بے تعلق سمجھتے تھے ۔ لیکن یہ غلط فہمی اس وقت دور ہوئی جب ایک بار ہم ان سے ملنے ان کے گھر گئے۔ وہ اس وقت یونیورسٹی سے واپس آئے تھے ۔ ان کو باہر آنے میں خلافِ معمول بڑی دیر لگی ، جس کی معذرت انھوں نے یوں کی کہ یونیورسٹی سے آکر وہ پہلے نہاتے ہیں اور پھر نماز پڑھتے ہیں ۔ اس سے جہاں ایک طرف ہماری غلط فہمی دور ہوگئی وہاں ہمیں افسوس بھی ہوا کہ ہم نے ایسا کیوں سوچا'' ۔ اس طرح ایک اور واقعہ بیان کرتے ہوئے مولانا موصوف نے فرمایا :

''ان کے بڑے داماد ڈاکٹر مسیح الزماں نے اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنی اہلیہ یعنی پروفیسر صاحب کی صاحبزادی کا پردہ ختم کرا دیا ۔ انھوں نے نہایت رنج کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میری بیٹی کا پردہ ختم کرانے کے لیے مسیح الزماں نے اپنے باپ کے مرنے کا تو انتظار کیا ، کاش اس کے باپ کے مرنے کا بھی انتظار کر لیتے ۔ ایک اور موقع پر انھوں نے فرمائش کی کہ ہم انھیں قرآن مجید کی وہ آیات لکھ دیں جو نئے ذہنوں کے لیے مؤثر ہوں تاکہ وہ اپنی اولاد کو وہ آیات پڑھائیں اور ان کے بچے قرآن مجید اور مذہب میں دلچسپی لیں[۲]''۔

---

۱ - نیا دور ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ - اپریل ۱۹۷۷ء ، ص ۱۸ -
۲ - مولانا علی نقی سے گفتگو (ریکارڈنگ) لکھنؤ ، ۲۷ مئی ۱۹۷۹ء -

بہر طور مسعود حسن رضوی اپنے عقیدے پر کاربند رہے اور اس طرح وہ ایک سچے اور پکے مسلمان تھے ۔

سیرت و کردار کے اس تفصیلی جائزے سے مسعود حسن رضوی کی جو تصویر ابھرتی ہے ، وہ ایک ایسے مکمل انسان کی ہے جس نے اپنی ساری زندگی نہایت شرافت ، پاک بازی ، وضع داری اور اقدار کی پاسداری سے گذاری ۔ انکساری کے باوجود انا اور خودداری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ۔ ان کی شخصیت مکمل طور پر ایسی پرکشش تھی کہ ہر شخص ان سے ملنے اور باتیں کرنے کو بے چین رہتا اور ان سے بہت کچھ سیکھتا ۔ ایسے لوگ کم ہی پیدا ہوتے ہیں ۔ چنانچہ وہ میر کے اس شعر کی زندہ مثال تھے :

مت سہل ہمیں جانو ، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ایران ، عراق کا سفر :

مسعود حسن رضوی کو ایران و عراق کے مقدس مقامات دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا ۔ چنانچہ وہ ۱۹۳۳ء میں ایران اور عراق کے لیے روانہ ہوئے ، مگر طبیعت کی خرابی کی بنا پر جلد واپس آگئے ۔ یوں وہ ۲۰ جون کو لکھنؤ سے روانہ ہوئے اور ۲۰ ستمبر کو واپس آئے ۔ اس طرح وہ تین مہینے سفر میں رہے ۔ اپنے اس اشتیاق اور روانگی کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

"جب فارسی ادب اور اس کی تاریخ کا خصوصی مطالعہ فرائض منصبی میں داخل ہوگیا تو اس دیرینہ اشتیاق نے ایک ضرورت کی شکل اختیار کر لی اور میں ایران کی سیاحت کے لیے روانہ ہوگیا "[1]

مسعود حسن رضوی کے اس سفر ایران و عراق کے کئی مقاصد تھے ۔ ایک تو مقدس مقامات کی زیارت اور دوسرا فارسی کتابیں جمع کرنا ۔ ڈاکٹر نذیر احمد اس سلسلے میں لکھتے ہیں ۔

"مسعود حسن رضوی کے سفر ایران کے دو تین مقاصد تھے ۔ اول وہ اس ملک کو جس کی تاریخ و تہذیب کا ایک مدت سے درس دے رہے تھے ، اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے ۔ دوسرا مقصد دور حاضر کی فارسی

---

۱ - ہماری شاعری ، ص ۲۸۵-۲۸۶ ۔

زبان کے بارے میں معلومات فراہم کرنا چاہتے تھے ۔ تیسرا مقصد قلمی اور مطبوعہ فارسی کتابوں کی تلاش[1] تھا"۔

مسعود حسن رضوی نے نہ معلوم کس بنا پر اس سفر کی روئداد تحریر نہیں کی ۔ ڈاکٹر نیر مسعود بتاتے ہیں کہ وہ اس سفر کی جزئی تفصیل بھی بتاتے تھے اور سفر کے تمام کوائف ان کے حافظے میں محفوظ تھے ۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ چونکہ اوائل ہی میں ایران و عراق چلے گئے اور شاید وہ اس کی کوئی روئداد لکھتے ، مگر وہ بعد میں اپنے علمی و ادبی مشاغل میں اس قدر مصروف ہوگئے کہ یہ بات ان کے حافظے سے غائب ہوگئی ۔ البتہ مختصر طور پر انھوں نے اپنے اس سفر اور جلد واپسی کا ذکر کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

"پنجاب ، سندھ اور بلوچستان کے راستے اس ارضِ مقدس ، ارضِ حسن و شعر میں داخل ہوا اور زاہدان ، برجند ، تربتِ حیدری، شہر مقدس، طوس ، نیشاپور ، سبزوار ، سمنان ، دامغان ، تہران ، شاہ عبدالعظیم ، قم ، اصفہان ، تخت جمشید کی سیر کرتا ہوا شیراز پہنچا ۔ ابھی سیاحتِ ایران کا نصف پروگرام بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ مسلسل سفر کی تکلیفوں سے تھک کر میں نے بوشہر کا رخ کیا اور وہاں سے جہاز میں سوار ہوکر بصرے پہنچا اور عراق عرب کے مشہور شہروں کی سیر اور وہاں کے عتباتِ عالیہ کی زیارت کرکے بحری راستے سے ہندوستان پہنچ گیا[2]"۔

مسعود حسن رضوی کے اس سفر کی تفصیلات ان خطوط سے ملتی ہیں جو وقتاً فوقتاً انھوں نے ایران و عراق کے مختلف شہروں سے لکھے ۔ یہ خطوط لاہور سے ۲۶ جون ، کوئٹہ سے یکم جولائی ، ۲ جولائی ، لوک گنڈی سے ۴ جولائی ، مشہد مقدس سے ۱۹ جولائی ، تہران سے ۲ اگست ، ۸ اگست ، بوشہر سے ۲۲ اگست اور کربلائے معلّی (عراق عرب) سے ۶ ستمبر کو لکھے گئے ۔ ان خطوط سے مسعود حسن کی وہاں مصروفیات اور سیر و تفریح کا حال کھلتا ہے ۔ شہر مقدس سے ۱۹ جولائی ۱۹۳۳ع کو لکھتے ہیں :

"شاید دو تین دن یہاں اور رہوں ۔ اس کے بعد نیشاپور ہوتا ہوا عمرخیام کی قبر پر فاتحہ پڑھتا ہوا انشاء اللہ تہران روانہ ہو جاؤں گا . . . کل میں

---

۱ - مسعود حسن رضوی ادیب ، ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۸۴ -

۲ - ہماری شاعری ، ص ۲۸۶ -

طوس گیا تھا جو یہاں سے چار فرسخ ہے ۔ ایک زمانے میں وہ ایک بہت بڑا شہر تھا ۔ اب انقلابِ زمانہ نے آبادی کا کوئی نشان بھی باقی نہیں رکھا ۔ صرف ایک شکستہ عمارت اور ایک قلعے کے کھنڈروں کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ ان عمارتوں کو بقعۂ ہارون اور ارگ ہارون کہتے ہیں ۔ یہ دونوں عمارتیں ہارون الرشید کی طرف منسوب ہیں . . . شرف حسین جو چھوٹی شہزادی کی ڈیوڑھی پر رہتے ہیں ، ان کے بھائی کے ہاتھ میں نے تین کتابیں بھیجی ہیں — دیوان عنصری ، جغرافیۂ ایران اور مجموعۂ لغز — امید ہے پہنچ گئی ہوں گی . . . سجاد علی نام ایک صاحب ڈالی گنج کے رہنے والے چار باغ اسٹیشن پر مال بابو ہیں . . . ان کے ہاتھ دو کتابیں اور تین قالین بھیج رہا ہوں . . . کتابوں کے نام یہ ہیں : مجالس المومنین ، تاریخ عالم آرائے عباسی ۔ قالینوں میں ایک برجندی ہے ، ایک شیرازی اور ایک مشہدی . . . کچھ فیروزے بھی خریدے ہیں ، وہ اپنے ہمراہ لاؤں گا . . . میں صوبہ خراسان کے گورنر سے ایک مرتبہ ملا ، بڑے خلیق آدمی ہیں ۔

طہران سے ۲۰ اگست ۱۹۲۲ء کے خط میں لکھتے ہیں :

”آج طہران پہنچے ہوئے مجھ کو چھ دن ہو چکے ہیں ۔ میرا قیام اب تک خاص طہران میں نہیں ہے بلکہ طہران کے قریب ایک قصبہ ہے جہاں امام رضا علیہ السلام کے بھائی شاہزادہ عبدالعظیم کا مزار ہے اور اس سبب سے یہ قصبہ خود شاہ عبدالعظیم کے نام سے موسوم ہو گیا ہے ۔ یہاں دو اور امام زادوں کے مزار بھی ہیں . . . طہران میں زیادہ وقت کتابوں اور مناظر ایران کی تصویروں کی خریداری میں گذرتا ہے . . . ایک پرانا محل بھی یہاں ہے جس کا نام قصر گلستان ہے ۔ اس میں تختِ طاؤس اور دوسرے نوادر موجود ہیں ۔ کوشش کر رہا ہوں کہ اس محل کو بھی دیکھ سکوں . . . مشہد سے ہندوستانی قافلے کا ساتھ چھوٹ گیا ۔ اب ہر وقت غیر ملکیوں میں رہنے سے وطن کی یاد ستاتی ہے . . . اب ایک ہفتے کے بعد یہاں سے قم ، اصفہان ، کاشان ، شیراز ، تختِ جمشید کی سیر کرتا ہوا بوشہر کی بندرگاہ پر پہنچوں گا اور وہاں سے جہاز پر بصرہ اور بصرہ سے کربلائے معلیٰ جاؤں گا اور عراق کی تمام زیارتوں سے فارغ ہو کر اکتوبر کی ابتدا میں انشاء اللہ لکھنو پہنچ جاؤں گا ۔“

طہران سے ۸ - اگست ۱۹۳۳ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"طہران میں میرا قیام بارہ دن رہا - زیادہ وقت کتابوں اور تصویروں کی خریداری میں صرف ہوا - یہاں کے بعض اہل علم اور اہل قلم حضرات سے ملاقات کا موقع ملا - بعض مدرسے اور کتب خانے بھی دیکھے - ابھی بہت سی چیزیں قابل دید باقی ہیں -"

بوشہر سے ۲۲ - اگست ۱۹۳۳ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"پرسوں شب کو شیراز سے بوشہر پہنچا . . . یہ ایران کی آخری سرحد ہے - یہاں سے سمندر شروع ہو جاتا ہے . . . بوشہر میں گرمی بہت ہوتی ہے . . . یہاں جہازوں کی آمد و رفت اور مال کی درآمد و برآمد کی وجہ سے قلیوں اور مزدوروں کی وہ کثرت ہے کہ چھوٹا سا کالھور معلوم ہوتا ہے - ایک بات میں یہ شہر لیوتنی شریف سے بھی مشابہ ہے ، یعنی یہاں کے میٹھے پانی میں وہاں کے کھارے پانی کی خاصیت ہے . . . اب یہ آخری خط ہے جو ایران کی سرحد سے بھیج رہا ہوں -"

کربلائے معلیٰ عراق عرب سے ۹ ستمبر ۱۹۳۳ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"گذشتہ چہار شنبہ کو میں کاظمین سے ایک خط بھیج چکا ہوں - یہاں سے مسیب اور نجف اور کوفے جاتا ہے - ان مقاموں کی زیارت سے فارغ ہو کر انشاء اللہ ۱۴ یا ۱۲ ستمبر کو یہاں سے بصرہ روانہ ہو جاؤں گا ، اور وہاں سے ۱۶ یا ۲۳ ستمبر کو جہاز پر سوار ہو جاؤں گا - ابھی صحیح تاریخ کی اطلاع اس لیے نہیں دے سکتا کہ کتابوں کا جو صندوق میں بوشہر چھوڑ آیا ہوں اس کے ملنے کی ابھی تک کوئی صورت طے نہیں ہوئی ہے -"

خطوں کی اس تھوڑی بہت تفصیل سے مسعود حسن رضوی کی مصروفیات کا اندازہ ہو جاتا ہے - ایران و عراق کے اس سفر سے ایک طرف ان کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی مگر دوسری طرف انھیں اس بات کا بھی شدید قلق رہا کہ وہ صحت کی خرابی اور سفر کی تھکان اور مشکلات کی وجہ سے پورے طور پر اس سیر کا لطف نہ اٹھا سکے - بہرحال وہ مقامات مقدسہ کی زیارات بھی کر آئے اور کتابوں کا بہت بڑا صندوق بھی ساتھ لائے اور کچھ کتابیں وہ پہلے ہی لکھنو بھیج چکے تھے - وہ جو مقاصد لے کر گئے تھے، بہر کیف پورے ہوئے - یوں ان کا یہ سفر ہر طرح سے کامیاب رہا -

ایران و عراق کے اس سفر کی مصروفیات مسعود حسن رضوی نے اپنی ڈائری میں بھی تاریخ وار درج کی ہیں - ۱۹۳۳ع کی ڈائری کے یہ اوراق ان کے ایران و عراق کے سفر اور وہاں کے شب و روز پر روشنی ڈالتے ہیں :

۲۳ جون ۱۹۳۳ع : ۷ بجے روانگی از لکھنؤ

۲۵ جون : ۸ بجے داخلہ در لاہور

۲۶ جون : $8\frac{1}{2}$ بجے روانگی از لاہور

۲۸ جون : ۱ بجے داخلہ در کوئٹہ

۳۰ جون : سرلی بان چار باغ اصفہان
آقائے مرزا مہدی وکیل
شرکت مخصوص
اقبال سید قاسم فرسان خادم نجف

یکم جولائی : رباعی از علاؤ الدولہ سمنانی :

صد خانہ اگر بہ طاعت آباد کنی
بہ زاں نہ بود کہ خاطرے شاد کنی
گر بندہ کنی بہ لطف آزادے را
بہتر کہ ہزار بندہ آزاد کنی

افسوس کہ خانقاہ او در شرف انہدام است و عنقریب این آثار بزرگ عتیق منہدم خواہد شد -

۲ جولائی ۱۹۳۳ع : مینار واقع سمنان ، بنا کردۂ محمد بختیار کہ از جانب سلطان الپ ارسلان و ملک شاہ سلجوق والئی قومس بودہ در ۵۲۲ھ - ۵۳۳ - مسجد جامع سمنان یک گنبد و ایوانش بنا کردۂ شاہ رخ پسر امیر تیمور ۸۸۶ھ -

۳ جولائی : ۱۰ بجے دن روانگی از کوئٹہ

۴ جولائی : ۹ بجے دن داخلہ در نوک کنڈی
۷ بجے شام روانگی از نوک کنڈی

۵ جولائی : ۱۰ بجے دن قلعۂ سفید ۔
۱۱ بجے دن میر جاوہ ۔
۶ بجے سہ پہر روانگی از میر جاوہ ۔
$\frac{1}{2}$ ۱۱ بجے رات داخلہ در زاہدان ۔
کرایہ لاری از اوک کنڈی تا زاہدان ۔
فی کس ۵ روپے ۳ آنے ۔

۶ جولائی : تبدیلی سکہ بحساب ۶۲۲ قران فی صد روپیہ

۸ جولائی : ۸ بجے رات روانگی از زاہدان ۔
۱۰-۱۱ بجے رات حرمق میں کھانا کھایا ۔
۲ بجے رات سفید آباد میں آرام کیا ۔

۹ جولائی : شجاعت علی سے ملاقات قالیچہ ۔
۶ بجے شام روانگی از برجند ۱۲ تومان ۔
۱۰-۱۱ بجے داخلہ در قائن ۔
قائن کا زعفران مشہور ہے ۔

۱۰ جولائی : ۹ بجے صبح تربت حیدری پہنچے ۔ مسجد ، روضۂ قطب الدین حیدر ۔
۶ بجے شام روانگی از تربت حیدری ۔
$\frac{1}{2}$۶ بجے شام مقبرہ حسینیہ ۔
۲ بجے رات داخلہ در مشہد

۱۱ جولائی : اندراج نہیں

۱۲ جولائی : کاغذ لفافہ ۔ جغرافیائے ایران مفصل
۳ قران ۔ ۱۲ قران
دیوان عنصری ۔ مجالس المومنین
۵ قران ۔ ۲ تومان
عالم آرائے عباسی ۔ ۳ تومان

۱۳ جولائی : فیروزہ کلاں ۳ تومان ۔

۱۴ جولائی : ۱۔ زیارت برادر امام رضا ۔

۲۔ زیارت قدم گاہ و سنگ سیاہ کہ حضرت در شدتِ
کرب آن را بسینہ چسپالیدہ ۔

۳۔ سیر باغ رضوان و باغ نادری ۔
چار شنبہ بازار (غناس) ۔

۱۵ جولائی : ۱۔ ملاقات بہ مثوی باشی ۔
۲۔ سیر کتاب خانہ باغ نادری ۔
۳۔ ارک ۔
۴۔ میدانِ ارک باغ ۔
۵۔ باغ ملی ۔
۶۔ دبستانِ متوسطۂ شاہ رضا ۔

۱۶ جولائی : فیروزہ خرد ۹۱ دالہ ۔ قالیچہ مشہدی ۔ قالیچہ شیرازی ۔
۵ تومان ۷ قران ۔ ۲۳ تومان ۔ ۱۴ تومان ۔

۱۷ جولائی : ۱۔ ۱۰ بجے دن ایالت سے ملاقات ۔
۲۔ برٹش کونسل جنرل کا دفتر ۔

اللهم صلی علی النبی والوصی والبتول والسبطین
و زین العباد و الباقر و الصادق و الکاظم الرضی
والتقی والعسکری والمهدی صلوات الله علیهم ۔

۱۸ جولائی : ۱۔ بقعۂ ہارون ۔ ۲۔ ارک ہارون ۔
۳۔ مقبرۂ فردوسی ۔ ۴۔ پل دواخانۂ شہر طوس ۔

۱۹ جولائی : فیروزہ گوشوارہ ۲ تومان ۔ زیارت خواجہ ربیع ۔
یہ پتھر محرابی شکل کا ہے ۔ ۶ فیٹ لفظم کے گرد
حاشیے پر آیۃ الکرسی لکھی ہوئی ہے ۔ یہ پتھر ایک
ہشت پہل ستون کے ساتھ تراشا گیا ہے ۔ ستون کوئی

۱۰ فٹ کا ہے ۔ اس کے سرے پر گردا گرد یہ
عبارت ہے ۔

نوٹ : عبارت درج نہیں ۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ
۱۷ جولائی کو جو عبارت درج ہوئی ہے وہ ہوگی ۔

۲۰ جولائی : ایالت سے ملاقات اور ان کے خطوط بنام ارباب کیخسرو و
وزیر معاون ایران ۔ یہ دو شعر پڑھے :

طرفہ عطارے کہ از انفاس او
قاف تا قافِ جہاں شد مشک بو

خاکِ نیشا پور تا یوم الصیام
آبرو دارد از این عالی مقام

۲۱ جولائی : تصویر صحن کہنہ ۔ تصویر گنبد و ضریح ۔
۱۰ تومان ۸ تومان

شیخ عطار کی قبر کے سرہانے ایک بڑے پتھر پر
اُبھرے ہوئے حرفوں میں ۲٦ شعروں کی ایک مثنوی
لکھی ہوئی ہے ۔ میں نے عجلت میں صرف . . . .

نوٹ : یقیناً یہ دو شعر وہ ہیں جو ۲۰ جولائی میں
درج کیے گئے ہیں ۔

۲۲ جولائی : مشہد سے نیشا پور کو روانگی ۔

از طرف خیام :

اے آنکہ بدیدنم رسی از رہِ دور
بنگر کہ چسان خفتہ ام اندر تک گور

اہلِ بقعہ بہ این حال کہ بینی کافیست
دیگر تو مکن غططش چوں دیبور[۱]

۱۔ یہ اکثر سنایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ 'دیبور' کا لفظ یہاں کس معنی
میں استعمال ہوا ، سمجھ میں نہیں آتا ۔ (نیر مسعود)

۲۳ جولائی : داخلہ در نیشاپور ۔ نیشاپور سے نیم فرسخ کے فاصلے پر قریہ . . . میں دو امام زادوں کے مقبرے ہیں ۔ بڑے مقبرے کے بائیں پہلو میں ایک محراب دار چھت کے نیچے خیام کی قبر ہے ۔ کوئی کتبہ نہیں ہے ۔ البتہ سامنے کی دیوار پر موسیٰ کنعانی نے ۱۳۵۰ھ میں حسبِ ذیل کتبہ ...

لوٹ : نام درج نہیں ہے ۔ اشعار کا اندراج ۲۲ جولائی میں کیا ہے ۔

۲۴ جولائی : داخلہ در سبزوار ۔

۱۔ در سفید (یک ارگ قدیم) ۔ ۲۔ قبر سہراب ۔
۳۔ مسجد جامع (قبلہ کج) ۔
۴۔ مزار خسرو بشکل منارہ ۔

سبزوار میں درشکہ نہیں ملتا ۔ عکاس خانۂ خورشید ۔

۲۵ جولائی : شیخ الاجل الامیر رکن الدین علاء الدولہ سمنان روحہ اللہ ہم از اکابر و ملوکِ سمنان محسوب می‌شد ۔ در ۶۵۹ھ متولد ، در ۷۳۶ھ رحلت ۔ یادگارے ازاں بزرگوار یک بقعہ خانقاہ است واقع در دو فرسنگے شہر سمنان بین جنوب و مغرب ۔

۲۶ جولائی : داخلہ در سمنان ۔ مسجد بنا کردۂ فتح علی شاہ ۔ در ۱۲۴۳ھ شروع شد و ۱۲۴۸ھ باتمام رسید ۔

شیخ محمد فانی ۔ معلم سمنانی ۔ شخص در تاریخ ایران ۔

۲۷ جولائی : خالی ۔

۲۸ جولائی : داخلہ در طہران ۔ از طہران بہ شاہ عبدالعظیم ۔

۱۔ روضۂ عبدالعظیم بن موسیٰ کاظم ۔
۲۔ روضۂ حمزہ بن موسیٰ کاظم ۔
۳۔ روضۂ طاہر بن زین العابدین ۔

۲۹ جولائی	:	کتابوں کی خریداری ۔
۳۰ جولائی	:	کتابوں کی خریداری ۔
۳۱ جولائی	:	سعید نفیسی اور فخر داعی سے ملاقات ۔ کتابوں کی خریداری ۔ غلاف تکیہ (۱) ۔ قمیض خاکی (۱) ۔ قمیض خاکی ریشمی (۱) ۔ قمیض دھاری دار (۱) ۔ پائجامے پتلی مہری (۲) ۔ پائجامہ جوڑا (۱) ۔ بنیان (۱) ۔ سفید کپڑا (۱) ۔ اچکن (۱) ۔
یکم اگست	:	تصویروں اور کتابوں کی خریداری ۔ ۱۔ مسجد و مدرسہ سپہ سالار ۔ ۲۔ مسجد شاہ (فتح علی شاہ) ۔ ۳۔ عمارت پارلیمان ۔ ۴۔ کتاب خانہ مجالس ۔ ۵۔ شمس العمارہ ۔
۲ اگست	:	آقائے سعید نفیسی سے اس کے مکان پر ملاقات ۔ محمد جعفر صاحب جولپوری انجینئر سندھ ۔ جعفر حسین زیدی ڈپٹی کلکٹر فیض آباد سے ملاقات ۔
۳ اگست	:	مظفر لگری قافلے سے ملاقات اور ان کے لیے جواز خروج حاصل کرنا ۔
۴ اگست	:	شمران میں تجریش اور دربند کی سیر ۔
۵ اگست	،	جمعہ اور ہفتہ دو دن درد شکم اور سوء ہضم میں مبتلا رہا ۔ غذا مطلق نہیں ہوئی ۔
۶ اگست	:	دریافت جواز عبور و ویزہ برائے عراق ۔ ملاقات بہ آقائے محمد علی تربیت نمائندہ مجلس ۔ خرید کتب ۔ وزیر معارف کے دفتر گیا ۔
۷ اگست	:	ملاقات با وزیر معارف و معاونش ۔ دیدن دار المعلمین عالی و دار الفنون و اطاقہائے پارلیمان ۔

۸ اگست : شام روانگی از طہران ۔
شب داخلہ در قُم ۔

۹ اگست : روانگی از قُم ۔
شب داخلہ در اصفہان ۔

۱۰ اگست : مسجد شاہ ۔ مسجد جامع ۔ چہل ستون ۔ عالی قاپو ۔ مدرسہ چہار باغ ۔ مسجد شیخ لطف اللہ داماد شاہ عباس ۔ پل خواجو ۔ سیا و سرپل بررگندہ اور مسجد علی مع منارہ بلند ۔ امام زادہ ہارون ولدیت برادر امام رضا ۔

۱۱ اگست : ۱۔ منار جنبان یا منار جنبان ۔ ۲۔ کوہ آتشگاہ ۔
۳۔ کلیائے جلفا و موزۂ آن ۔

۱۳ اگست : قالین جفت ۷۸½ تومان ۔ کتابیں ۴۵ تومان ۔
آج دو سو روپے کے ۱۱۷ تومان ملے ۔
۱۲ بجے رات کو اصفہان سے روانگی ۔

۱۶ اگست : ۱۲ بجے دن شیراز میں داخلہ ۔

۱۹ اگست : ۱۱ بجے دن شیراز سے روانگی ۔

۲۰ اگست : ۸ بجے رات بوشہر میں داخلہ ۔

۲۳ اگست : بوشہر سے روانگی اور کتابوں کے صندوق کا وہیں چھوٹ جانا ۔ جہاز ۲ بجے کے قریب روانہ ہوا ۔

۲۴ اگست : بصرہ میں داخلہ ۳ بجے دن کے قریب ۔ رائے صاحب سبکارہ ریلوے انسپکٹر سے ملاقات ۔
بصرہ سے روانگی ۱۰ بجے رات کو ۔

۲۵ اگست : ۸ بجے رات کاظمین میں داخلہ ۔

۲۷ اگست : مدائن کی زیارتیں ۔

۲۸ اگست	:	بغداد کی سیر اور مندرجہ ذیل اشیاء کی خریداری : چھینٹ ۶ گز (۷ روپے) - تھان ۴ عدد (۵۰ روپے) - جراب (۱ روپیہ) - گھڑی کی مرمت (۱ روپیہ) -
۲۹ اگست	:	۱- ۷ بجے صبح کو بصرہ کو روانگی - سید محمد پسر امام علی نقی کی زیارت - ۲ بجے دن کو سامرہ میں داخلہ - ۱- امام علی نقی - ۱- امام حسن عسکری - حلیمہ خاتون بنت امام محمد تقی اور نرجس خاتون والدۂ صاحب الزمان کے مزارات - ۲- غار صاحب الزمان - ۳- مینار و عمارت المتوکل - ۴- محبس امام دہم و یازدہم - ۵- قصر قدیم -
۳۰ اگست	:	۴ بجے سامرہ سے روانگی بذریعہ ریل- ۷ بجے کاظمین کو واپسی - قاضی صاحب کو رجسٹری خط بوشہر بھیجا -
۳۱ اگست	:	بغداد کی سیر - ٹائی ۴ عدد (۱ روپیہ) - چھینٹ سرخ $4\frac{1}{2}$ گز (۹ روپے ۵ آنے) - نواب احمد حسن خان سے ملاقات - ۱- قنبر علی غلام امام علی نقی - ۲- حسین ابن اوج - ۳- نائب اول امام عصر - ۴- شیخ عبدالقادر جیلانی - ۵- امام ابو حنیفہ -
یکم ستمبر	:	بغداد کی سیر - چھینٹ سرخ $13\frac{1}{2}$ گز (۴ روپے) - رومال ایک درجن (۱ روپیہ ۲ آنے) - رومال ایک درجن (۲ روپے ۸ آنے) -
۲ ستمبر	:	۹ بجے کاظمین سے روانگی - $1\frac{1}{2}$ بجے کربلا معلیٰ میں داخلہ -

۳ ستمبر : ۲ بجے تقرر ممتحنین ۔ عقیق زرد ۲ عدد (۱ روپیہ) ۔ لانٹ عقیق (۱۱ آنے) ۔ نقشی سنگ سلیمانی (۵ آنے) ۔ انگشتری عقیق زرد (۱۲ آنے) ۔ پنکھے تین عدد (۱ روپیہ ۸ آنے) ۔ تصویر ۱۰ عدد (۱۲ آنے) ۔ بکس چیر کا (۱ روپیہ ۹ آنے) ۔ رومال عربی ۶ عدد (۱ روپیہ ۱۱ آنے) ۔ رومال سیاہ ۳ عدد (ساڑھے ۹ آنے) ۔ رومال شاہی ۶ عدد (۲ روپے ۱۱ آنے) ۔ رومال شاہی ۶ عدد (ساڑھے ۱۲ آنے) ۔

۴ ستمبر : دھوبی کو کپڑے : اچکن (۱) ۔ قمیض (۲) ۔ پائجامے (۲) ۔ بنیان (۲) ۔ تولیا (۲) ۔ کل ۹ عدد ۔

۱۰ ستمبر : نجف میں داخلہ ۔

۱۱ ستمبر : کوفہ کی زیارتیں ۔

۱۲ ستمبر : نجف سے کربلا کو روانگی ۔
انگشتری عقیق سرخ (۱۴ آنے) ۔ انگشتری فیروزہ ۳ عدد (۱۴ آنے) ۔ در نجف ۸ عدد (۸ آنے) ۔ انگشتری فیروزہ ۱۶ عدد (۱۳ روپے ۱۳ آنے) ۔ سلک سیاہ ۸ گز (۱۰ روپے ۱۰ آنے) ۔ سلک ۲ گز (۳ روپے) ۔ ازاربند ۵ عدد (۴ آنے) ۔ تار (۵ روپے ۸ آنے) ۔ رومال (۱۲ آنے) ۔

۱۳ ستمبر : طفلان مسلم اور حضرت عون ۔ خریداری ۔

۱۵ ستمبر : ۱۱ بجے کربلا سے بصرہ کو روانگی ۔

۱۶ ستمبر : ۶ بجے صبح معقل میں داخلہ ۔ عشار کی سیر ۔ خریداری ۔

۱۷ ستمبر : ۷ بجے صبح بصرہ سے روانگی ۔

۱۸ ستمبر : ۵½ بجے صبح ۔ بوشہر کا ساحل ۔ قاضی محمد اکرم صاحب سے ملاقات ۔ کتابوں کے صندوق کا ملنا ۔

۲۱ ستمبر : کراچی میں داخلہ۔

۲۲ ستمبر : کراچی سے روانگی۔

۲۳ ستمبر : لکھنؤ کو واپسی۔

مشاہیر سے ملاقاتیں اور تعلقات :

مسعود حسن خود بڑی شخصیت کے مالک تھے اور علمی و ادبی مرتبے کے باعث لوگ اُن سے ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ مسعود حسن اپنی علمی مصروفیات کی بنا پر بہت کم کہیں آتے جاتے تھے۔ علمائے فرنگی محل سے اُن کے خاصے مراسم تھے۔ یوں اُن کے اپنے بقول گوشہ نشینی اور درویشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس کے باوجود ان کے ہم عصر مشاہیر کے ساتھ تعلقات بھی تھے اور ان سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ ادبستان میں آنے جانے والوں کی وجہ سے خاصی رونق رہتی تھی۔ ان کی شخصیت میں جو کشش تھی وہ اہلِ علم کو علمی پیاس بجھانے کے لیے کشاں کشاں ادبستان کی طرف لے آتی تھی۔ مسعود حسن نے اپنی ایک ریڈیائی تقریر میں بہت سے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

> ”جن شخصیتوں کو میں کبھی بھول نہیں سکتا اُن کے نام یہ ہیں : مرزا محمد ہادی رسوا ، مرزا محمد عسکری ، مولانا صفی لکھنوی ، حضرت آرزو لکھنوی ، پنڈت برج نرائن چکبست ، منوہر لال آتش ، پنڈت کشن پرشاد کول — یہ سب ادب نواز اور ادب آفریں ہستیاں دنیا سے رخصت ہو گئیں مگر ان کی یاد میرے دل میں باقی رہ گئی۔“[1]

بعض ایسے حضرات بھی تھے جن سے مسعود حسن کی خط و کتابت تھی۔ ان میں سے بعض اُس وقت اتنے معروف نہ تھے مگر بعد میں انھوں نے بڑا نام کمایا۔ جن اصحاب سے مسعود حسن کی ملاقاتیں رہیں یا تعلقات رہے ان میں جوش ملیح آبادی ، یگانہ چنگیزی ، نصیر الدین ہاشمی ، محمد مبین چڑیا کوٹی ، دتا تریہ کیفی ، حسرت موہانی ، تاجور نجیب آبادی ، اثر لکھنوی ، اختر علی

۱- میری ادبی زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعات و شخصیات : تقریر ریڈیو لکھنؤ ، ۲ ستمبر ۱۹۶۰ع (محررہ ۳۱ اگست ۱۹۶۰ع)۔

تلہری ، حامد حسن قادری ، علی عباس حسینی ، عبدالسلام ندوی ، عبدالماجد دریابادی ، ڈاکٹر عابد حسین ، قاضی عبدالودود ، امتیاز علی عرشی ، رشید احمد صدیقی ، عبدالقادر سروری اور اسی قبیل کے بہت سے دوسرے نام شامل ہیں ۔

علامہ اقبال سے بھی اُنھیں خاصی عقیدت تھی اور اُن سے ملاقات بھی خاصی یادگار ہے ۔ وہ اپنی یادداشتوں میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

''دو ایک بار ہم پٹنے میں تھے تو سر سلطان احمد کے یہاں گئے ۔ وہاں اقبال کا ذکر نکل آیا ۔ سر سلطان نے کہا کہ ہم لوگ تو روپیہ کمانے کی دھن میں ایسے پڑے رہتے ہیں کہ لطیف جذبات مر جاتے ہیں ۔ اقبال نے ہمارے ہم پیشہ ہونے کے باوجود خود کو روپے کی ہوس سے دور رکھا ، اس لیے ان کے احساسات مردہ نہیں ہوئے ۔ وہیں ایک صاحب اقبال کو اچھی طرح جاننے والے موجود تھے ۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار میرے سامنے اقبال کے پاس ایک ریاست کا مقدمہ آیا ۔ علامہ نے اُسے لینے سے انکار کر دیا ۔ علامہ کے ایک دوست اُنھیں سمجھانے لگے کہ دیکھیے یہ ریاست کا مقدمہ ہے ، آپ کی زندگی میں ختم نہ ہوگا ۔ یہ مقدمہ لے لیجیے تو پھر آپ کو کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں ، عمر بھر کی آمدنی کی سبیل ہو جائے گی ۔ علامہ نے کہا بھئی مجھے روپے کی ضرورت نہیں ، میرے پاس بہت روپیہ ہے ۔ دوست نے پوچھا کتنا روپیہ ہے ؟ علامہ نے کہا بہت ہے ۔ دوست نے پھر پوچھا آخر کتنا ہے ؟ علامہ بولے سات سو ۔ سر سلطان نے کہا ایسے ہی لوگوں کے لطیف احساسات زندہ رہ سکتے ہیں ۔''[۱]

جب مسعود حسن عراق و ایران کی زیارات (۱۹۳۲ع) کے لیے گئے تو لاہور میں بھی ٹھہرے اور ایک دن علامہ اقبال کی خدمت میں بھی حاضری دی ۔ جب وہ لاہور پہنچے تو پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اُنھیں اقبال سے ملانے لے گئے ۔ وہ اس ملاقات کے بارے میں اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں :

''اقبال سفید تہمبند باندھے چارپائی پر بیٹھے تھے ، پاس کچھ معمولی کرسیاں پڑی تھیں ۔ حیرت ہے کہ یہ قطعاً یاد نہیں کہ علامہ صاحب سے کیا گفتگو ہوئی ۔''[۲]

۱۔ یادداشتیں ، مسعود حسن رضوی ادیب (موجود) ۔

۲۔ یادداشتیں ، مسعود حسن رضوی ادیب (موجود) ۔

میاں بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں کے نام ایک نامکمل خط میں اس ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''۱۹۳۳ء اور جون کا مہینہ تھا کہ ایران جاتے ہوئے میں دو دن کے لیے لاہور میں ٹھہر گیا تھا ۔ وہاں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی ، حضرت تاجور نجیب آبادی ، پروفیسر حافظ محمود شیرانی اور علامہ اقبال کی زیارت سے مشرف ہوا ۔''[1]

مسعود حسن کے احباب کے وسیع حلقے کا ذکر کرتے ہوئے علی جواد زیدی لکھتے ہیں :

''ان کے دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع ہے ۔ اس میں لکھنؤ کے وہ نواب بھی ہیں جو ''چنیا بیگم'' کے عاشق اور پالی کے مردِ میدان ہیں ۔ وہ بانکے بھی ہیں جو قدیم فنونِ حرب و ضرب میں طاق ہیں اور وہ مرقع ہائے عبرت بھی ہیں جو سابق خاندانِ شاہی کے چشم و چراغ ہیں یا ادبی اور علمی خانوادوں کی یادگار ہیں ۔ اخباروں کے مدیر اور اسکولوں کالجوں کے مدرس ، مجتہد اور طبیب ، مغنی اور شاعر ، افسانہ نویس اور نقد نگار ، داستان گو اور نثار ، مرثیہ خواں اور مرثیہ گو ، قصیدہ نگار اور غزل گو یہ سب مزید براں ہیں ۔ اس مختلف النوع اور رنگا رنگ مجمع میں مسعود صاحب کے لیے ہر جگہ ایک مخصوص جگہ ہے ۔ اُن کی آمد پر سبھی خوش ہوتے ہیں اور تعظیم کے ساتھ آپ کے لیے جگہ خالی کر دیتے ہیں ۔''[2]

ڈاکٹر نیر مسعود سے جب میں نے مسعود حسن کے مشاہیر کے ساتھ تعلقات اور ملاقاتوں کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا :

''مسعود کے حسرت موہانی ، عزیز لکھنوی ، یگانہ اور آرزو لکھنوی سے تعلقات تھے اور ان سب کے ساتھ یادوں کا خاصا سلسلہ وابستہ ہے ۔ کچھ کے بارے میں ابا بیان کرتے تھے ۔ حسرت کانپور میں رہتے تھے

۱- مسعود حسن رضوی ادیب بنام میاں بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں (موجود) ۔
۲- آپ سے ملیے ، از علی جواد زیدی ، ص ۸۳ - ۸۴ ۔

اور ابا کی سسرال بھی کانپور میں تھی ۔ حسرت کو کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا ، خاص طور پر تذکرے ۔ ابا کو بھی تذکروں سے خاصی دلچسپی تھی اور ابا اُن سے ملنے جاتے تھے ۔ ایک مرتبہ تذکرے دیکھ رہے تھے تو ابا نے ایک تذکرے کے بارے میں کہا کہ یہ میں لے جاؤں اور دیکھ کر واپس کر دوں گا ۔ انھوں نے کہا کہ سب لے جائیں مگر واپس کر دیجیے گا ۔ جب بھی حسرت موہانی لکھنؤ آتے تو ابا سے ضرور ملنے کے لیے آتے تھے ۔ ان دونوں کی ملاقاتیں کتابوں کے سلسلے میں ہی ہوتی تھیں ۔ اسی طرح پریم چند کے بارے میں بتایا کہ پریم چند سے ملاقاتیں نہیں تھیں ، صرف شناسائی تھی ۔ کبھی کبھار کسی ادبی مجلس میں ملاقات ہو جاتی تھی ۔ پریم چند کے بارے میں ایک واقعہ ابا بیان کرتے تھے کہ مسلم اکاڈمی کے جلسے میں عبد الماجد دریابادی کا مضمون تھا : "اُردو کا ایک بد نام شاعر" ۔ یہ شوق کی مثنوی زہرِ عشق پر تھا اور پہلی بار یہاں ہی پڑھا گیا ۔ مولانا خود نہیں پڑھتے تھے ، کسی اور سے پڑھواتے تھے ۔ یہ مضمون انھوں نے یعنی مسعود نے پڑھا ۔ ابا نے یہ تجویز بھی رکھ دی کہ جب مثنوی کے مقامات پیش کیے جائیں تو کوئی اور شخص ترنم سے پڑھے ۔ اتفاق سے وہاں ایک شخص رضی نام کے موجود تھے ۔ مست مولا کہلاتے تھے اور بڑے خوش الحان تھے ۔ وہ مثنوی کی مخصوص دھن سے بھی واقف تھے ۔ چنانچہ جب انھوں نے بلند آواز اور ترنم کے ساتھ وہ حصے پڑھے جہاں ہیروئن بے ثباتیِ دنیا کا تذکرہ کرتی ہے تو سامعین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ پریم چند ہچکیاں لے لے کر اس طرح روئے جس طرح شیعہ مجلس میں بلند آواز سے روتا ہے ۔ اسی طرح صفی لکھنوی سے بھی ابا کے بڑے مراسم تھے ۔ ابا ان کی شعری صلاحیتوں کے بڑے قائل تھے ۔ کہتے کہ انھیں فی البدیہہ کہنے میں کمال حاصل ہے ۔ کسی جلسے کے صدر ہیں تو منظوم خطبہ دیتے تھے ۔ اُدھر صفی لکھنوی بھی ابا کی علمی حیثیت مانتے تھے ۔"[1]

مرزا محمد عسکری اور مسعود حسن کے خاصے بے تکلفانہ تعلقات تھے ۔

۱۔ ڈاکٹر نیر مسعود سے گفتگو (ریکارڈنگ) لکھنؤ ، ۲ جنوری ۱۹۷۹ء ۔

ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بھی تھا ۔ اس کا ثبوت ''من گیستم'' سے بھی ملتا ہے ۔ مسعود حسن رضوی نے مرزا محمد عسکری کے انتقال پر ایک مضمون بھی لکھا[1] ۔ علی عباس حسینی زمانۂ طالب علمی کے ساتھی تھے ۔ علی عباس حسینی مسعود حسن رضوی کے بڑے مداح تھے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''میری شخصیت تین ذاتِ گرامی سے بہت متاثر ہوئی ۔ وہ ہیں نواب زادہ محمد مہدی رضوی ، مرزا حامد حسین ایم ۔ اے اور پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب ۔ مسعود صاحب کے اخلاص نے مجھے خادمِ اُردو بنایا ۔ حق یہ ہے کہ اگر مسعود صاحب اس طرف توجہ نہ دلاتے تو میں انگریزی کا جرنلسٹ بن جاتا . . . مسعود صاحب نے یہ غیرت دلائی ۔ گھر کا دیا پہلے جلاؤ ۔ مسجد کا چراغ جلانے والے بہت ہیں . . . . اُردو کی وہ لگن جو اب مجھ میں ہے وہ مسعود صاحب کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے ۔''[2]

چنانچہ علی عباس حسینی اور مسعود حسن رضوی میں گہری دوستی تھی ۔ علی جواد زیدی ، علی عباس حسینی کے دوستوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''. . . اور دوستوں میں مشہور ادیب مسعود حسن رضوی ادیب ہیں . . . حسینی سے بہت مختلف ۔ یہ کم نویس اور حسینی بسیار نویس ۔ یہ ایک دردِ سر سے پریشان اور حسینی بہت سے ''دردِ سر'' گرد و پیش جمع کیے ہوئے ۔ دونوں کتنے مختلف نظر آتے ہیں ، لیکن بڑے دوست ہیں ، ایسے کہ ایک دوسرے کے لیے ایثار کرنے میں باک نہ ہو ۔''[3]

مسعود حسن نے بھی اپنے ایک مضمون ''علی عباس حسینی اور میں''[4] میں حسینی کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے ۔ اسی طرح علی عباس حسینی کی وفات پر اُنھیں گہرا صدمہ پہنچا ۔ ڈائری میں اس کا اندراج ۲۷ ستمبر ۱۹۶۹ء کی تاریخ

۱۔ مضمون کا مسودہ موجود ہے ۔
۲۔ مسعود حسن رضوی ادیب ــ ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۱۸ ۔
۳۔ آپ سے ملیے ، از علی جواد زیدی ، ص ۲۵ ۔
۴۔ صبح نو پٹنہ ، علی عباس حسینی نمبر ، جنوری ، فروری ، مارچ ۱۹۶۵ء ، ص ۶۵ - ۶۶ ۔

میں صرف اتنا ہے :

"آج صبح کو ۸ بج کر ۲۵ منٹ پر میرے سب سے پرانے دوست علی عباس حسینی نے انتقال کیا ۔ افسوس صد افسوس ۔"[1]

یاس یگانہ چنگیزی سے بھی مسعود حسن رضوی کے خاصے خوش گوار تعلقات تھے ۔ اگرچہ یگانہ نے "غالب شکن" میں مسعود حسن رضوی کے نام ایک کھلا خط بھی لکھا تھا ۔ یگانہ جب ریٹائر ہو کر آئے تو مکان پیلی کوٹھی میں رہتے تھے ۔ اس طرح مسعود حسن اور ان کی ملاقاتیں رہتی تھیں ۔ مختلف اوقات میں مسعود حسن ان کی مدد بھی کرتے رہتے تھے ۔ جس زمانے میں یگانہ نے رسولِ خدا کی شان میں گستاخی کی تھی اور اُن پر حملہ ہوا تو وہ ڈر گئے کہ لوگ مار ڈالیں گے ۔ وہ بڑے پریشان تھے ۔ اس آڑے وقت میں مسعود حسن رضوی نے اُنھیں ادبستان میں مالی کی کوٹھری رہنے کو دے دی تھی ۔ یگانہ نے خود بھی اس کا اظہار کیا ہے ۔ دوارکا داس شعلہ کے نام مسعود حسن رضوی کے مکان کوٹھی ادبستان دین دیال روڈ لکھنؤ سے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"اکیلا رہ گیا ہوں ، یہاں جھونپڑی ڈال کے پڑا ہوں ۔"

اسی طرح ۹ ستمبر ۱۹۵۵ء کے ایک خط میں اُنھیں لکھتے ہیں :

"وہاں پروفیسر مسعود حسن کے باغ میں چھپر ڈال کر ایک مہینہ چوبیس دن رہا ۔"[2]

مرزا ہادی رسوا سے بھی مسعود حسن رضوی کے بڑے تعلقات تھے ۔ مسعود حسن رضوی نے مرزا رسوا پر ایک ڈرامہ[3] بھی لکھا جس کا نام "مرزا محمد ہادی رسوا" تھا ۔ انھوں نے مرزا رسوا کے بارے میں ۲۲ جولائی ۱۹۵۲ء کو ریڈیو لکھنؤ سے ایک تقریر[4] بھی کی جس میں آنکھوں دیکھی باتیں بیان کیں ۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے مسعود حسن رضوی کے مرزا رسوا سے تعلقات کے بارے میں بتایا :

۱۔ نیا دور ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ ۔ اپریل ۱۹۷۷ء ، ص ۳۱ ۔
۲۔ تخلیقی ادب ۲ ۔ کراچی ۱۹۸۱ء ، ص ۵۲۸ ۔
۳۔ نیا دور لکھنؤ ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ ۔ اپریل ۱۹۷۷ء ، ص ۹۷ ۔ ۱۰۰ ۔
۴۔ مسودہ موجود ہے ۔

''مرزا وسوا بہت بزرگ تھے۔ ابا سے ان کے تعلقات نایاب کتابوں کی وجہ سے تھے۔ مرزا صاحب کی ادا یہ تھی کہ وہ جب بھی لکھنؤ آتے تو نئے مکان میں ٹھہرتے اور معلوم کرنے کے بعد ابا ان سے ملنے جاتے تھے۔ اکثر اوقات وہ ناراض بھی ہو جاتے کہ ملنے کے لیے کیوں نہیں آئے۔ ایک دفعہ ابا ملنے گئے تو مرزا صاحب نے بتایا کہ انھوں نے پیچیدہ راگوں کو نوٹ کرنے کا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ اسی طرح اُنھیں ایک عمدہ گیت بھی ملا ہے جو ہمایوں کی یا اکبر کی پیدائش پر گایا گیا تھا۔ مرزا صاحب نے کہا کہ چونکہ رمضان شریف ہے اس لیے میں گا کر نہیں سناؤں گا بلکہ یونہی پڑھوں گا۔ ابا کو وہ گیت اُردو کی ابتدائی شکل کا لگا اور انھوں نے نوٹ کرنا چاہا مگر مرزا صاحب ٹال گئے اور بعد میں انھوں نے ابا کے خاص دوستوں سے شکایت کی کہ مسعود صاحب کو گیت سنایا تو وہ اسے لکھے دے رہے تھے۔''[۱]

علیم اللہ حالی نے مسعود حسن رضوی سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ بڑی خوش خلقی کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ کبھی ادبی شخصیات کی بات چلی تو کبھی جریدوں کی۔ کبھی شاعری کی گفتگو ہوئی تو کبھی تنقید و تحقیق کا تذکرہ ہوا۔ غرض مختلف موضوعات سامنے آئے۔''[۲]

ڈاکٹر من موہن سنگھ دیوانہ نے مسعود حسن رضوی سے اپنی ایک ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پروفیسر مسعود حسن رضوی سے منصوری پہاڑ پر ملاقات ہوئی۔ سڑک پر جا رہے تھے۔ دورانِ گفتگو میر کا ایک شعر رضوی صاحب نے عطا فرمایا:

سر کسی سے فرو نہیں آتا
حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

۱۔ ڈاکٹر نیر مسعود سے گفتگو (ریکارڈنگ) لکھنؤ، ۲ جون ۱۹۷۹ع۔
۲۔ صبح نو پٹنہ، شمارہ جنوری، فروری، مارچ ۱۹۶۵ع، ص ۲۶۔

میر صاحب کو تو کورنش بجا لاتے تھے - اب رضوی صاحب کے آگے
سر جھکنے لگا کہ میر کی زبان سے اپنا راز دل مجھ تک پہنچا دیا ۔۱‘‘

جوش ملیح آبادی (وفات ۲ فروری ۱۹۸۲ع) سے مسعود حسن رضوی کے تعلقات گہرے تھے اور اکثر ان کا ملنا ملانا ہوتا تھا ۔ ان دونوں مشاہیر کے تعلقات کے بارے میں ڈاکٹر آفاق حسین اور ڈاکٹر نیر مسعود سے جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل یہ ہے :

مسعود اور جوش ۱۹۱۰ع میں حسین آباد ہائی اسکول لکھنؤ میں آٹھویں درجے کے طالب علم تھے - مسعود حسن رضوی بتاتے ہیں کہ اس ہم جماعتی کے زمانے میں ہم دونوں میں کبھی کوئی گفتگو نہیں ہوئی ، اس لیے کہ جوش سب سے پیچھے کی نشست پر دوسروں سے بالکل الگ تھلگ بیٹھتے تھے - جوش کچھ دن تک اسکول آتے رہے - اس کے بعد معلوم نہیں کہاں غائب ہو گئے - جوش کی پہلی غزل انھوں نے کیننگ کالج لکھنؤ کے ایک طرحی مشاعرے میں سنی تھی - مصرعِ طرح یہ تھا :

آج تک ہم ہیں فریبِ آہِ بے تاثیر میں

جوش نے بہت کڑک کر غزل پڑھی تھی - ایک شعر یاد رہ گیا ہے :

کیسی آزادی کی طالب ہیں یہ فانی ہستیاں
روح تو جکڑی ہوئی ہے زیست کی زنجیر میں

جوش ملیح آبادی غزل کے مخالف تھے اور مسعود حسن رضوی غزل کے پرستار - اس موضوع پر اکثر ان دونوں کے درمیان مباحثہ ہوتا رہتا تھا - ان مباحثوں کی تفصیل ڈاکٹر آفاق حسین نے بتائی ہے - جوش سے غزل پر کئی بار مباحثے ہوئے - ایک بار رات کو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے مشاعرے میں جوش شریک تھے - مسعود حسن رضوی بھی تھے - وہاں دونوں میں غزل پر کچھ گفتگو ہوئی - دوسرے دن ریڈیو والوں نے جو عصرانہ دیا اس میں دونوں پاس پاس بیٹھے تھے - جوش نے کہا مسعود صاحب آپ غزل کی حمایت میں کچھ لکھیے - میں بھی اپنے قوائے حملہ کو بالکل تیار کیے بیٹھا ہوں - مسعود حسن

۱- ماہنامہ مشرب ، تاریخ اُردو ادب نمبر ، جون - جولائی ۱۹۵۶ع ، ص ۹۱۶ -

نے کہا جوش صاحب ! کئی بار ہماری بحث ہوئی لیکن آپ قائل ہو ہو کر منکر ہو جاتے ہیں ۔ اچھا اب یہ کیا جائے کہ ہائی کورٹ کے کسی جج کو قاضی بنایا جائے ۔ زیرِ بحث مقدمے کی تنقیحات لکھ کر قائم کی جائیں اور ایک ایک تنقیح پر ہم بحث کریں ۔ تمام تنقیحات پر بحث کی سماعت کے بعد جج جو فیصلہ کرے وہ ہم دونوں قبول کر لیں ۔ جوش بھی اس پر راضی ہو گئے لیکن یہ مقدمہ پیش نہ ہوا ۔ ایک بار ادبستان میں غزل پر بحث شروع ہوئی ۔ جوش نے کہا : ''دو مصرعوں میں کوئی نفسیاتی تجزیہ تکمیل کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا ۔'' مسعود نے کہا جوش صاحب یہاں پر ''سکتا'' کا لفظ آپ نے بہت غلط استعمال کیا ہے ۔ جو عمل بار بار ہو چکا ہو اس کے امکان پر غور کرنا چہ معنی دارد ؟ غزل کے بے شمار شعر ایسے ہیں جن میں شاعر نے اپنا کوئی نہ کوئی نفسیاتی تجربہ تکمیل کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ دیکھیے عہدِ شباب کے متعلق ایک شاعر اپنا نفسیاتی تجربہ بیان کرتا ہے ۔ ذرا بتائیے یہ بیان نامکمل تو نہیں ہے :

ہر چیز پر بہار تھی ہر شے پہ تھا نکھار
دنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

شباب کے متعلق ایک اور شعر سنیے :

آج ہم روئے بہت دیکھ کے تصویرِ شباب
یاد پھر آ گئی بھولے ہوئے افسانے کی

اور اب خود اپنے ایک نفسیاتی تجربے کو دیکھیے کہ ایک غزل گو شاعر نے بھی وہی تجربہ بیان کیا ہے ۔ آپ کی ایک نظم ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے سب لوگ مجھے چاہتے تھے ، ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے لیکن اب سب میرے مخالف ہو گئے ۔ جہاں تک غور کرتا ہوں اس تبدیلی کا سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اب میرا شعور پختہ ہو گیا ہے ۔'' اس کے بعد وہ نظم مجھے یاد نہیں ۔ غزل کا شعر ہوتا تو یاد ہو جاتا ۔ بہرحال آپ کی ایک نظم کا مفہوم یہی ہے نا ؟ جی ہاں جی ہاں جوش نے کہا ۔

اب میں غزل کا جو شعر پڑھنے جا رہا ہوں اُسے سنیے کہ اس میں یہی تجربہ بیان ہوا ہے اور آپ کی پوری نظم سے زیادہ تکمیل کے ساتھ ۔۔ یہ کیونکر

ہو سکتا ۔ ''پھر وہی ہو سکتا ۔'' جناب یہ ہو چکا ہے ۔ اچھا ارشاد ۔۔ اور خیال رہے کہ یہ آپ کا ذاتی تجربہ ہے ، لہذا اس کے تکمیل کے ساتھ بیان ہونے کے متعلق آپ سے بہتر کون فیصلہ کر سکتا ہے ۔ جوش صاحب نے بڑی بے قراری سے کہا یقیناً سنائیے صاحب ، وہ کون سا شعر ہے ۔ اور یہ بھی دیکھیے کا کہ اس شعر میں صرف نفسیاتی تجربہ ہی بیان نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے ساتھ ذاتی تاثر کی جھالر بھی لگی ہوئی ہے ۔

ارے صاحب وہ شعر سنائیے تو !

اور یہ تاثر الگ سے نہیں ٹانکا گیا ہے بلکہ شعر میں سمویا ہوا ہے ۔

افوہ ! آپ تو اشتیاق بڑھاتے چلے جا رہے ہیں ۔ صاحب وہ شعر ؟ اور واضح رہے کہ یہ غزل کا شعر ہے ، کسی ناظم کا نہیں ۔ ایک غزل گو شاعر ۔۔ مسعود صاحب کسی طرح سنا بھی چکیے ۔

بہتر ہے ، ملاحظہ ہو :

باولے سے جب تلک بکتے تھے سب کرتے تھے پیار
عقل کی باتیں کیاں ، کیا ہم سے نادانی ہوئی

جوش جھوم جھوم گئے ۔ چار پانچ مرتبہ شعر کو پڑھوایا ۔ پھر پوچھا کس کا شعر ہے ۔ کسی شاعر کا نہیں ۔ کہنے والا ایک غزل گو ہے ۔ کون ؟

وہی بڈھا میر جسے آپ شاعر ہی نہیں مانتے ۔

ایک بار مسعود حسن رضوی کے یولیورسٹی جانے کا وقت قریب تھا کہ جوش آ پہنچے ۔ دوچار باتوں کے بعد کہنے لگے کہ آج میں آپ سے اس موضوع پر بحث کرنے آیا ہوں کہ اُردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے ۔ مسعود حسن نے کہا اب تو میرے یونیورسٹی جانے کا وقت آ گیا ہے ، اور یہ بحث یقیناً طویل ہوگی لہذا پھر کبھی سہی ۔ جوش بولے اچھا تو مختصراً میں اپنی رائے ظاہر ہی کر دوں کہ میرے نزدیک اُردو کا سب سے بڑا شاعر نظیر اکبر آبادی ہے ۔ مسعود حسن نے کہا تو مختصر طور پر میں اس رائے سے اپنا اختلاف ظاہر کرتا ہوں اور نظیر سے بڑا شاعر تو میں آپ ہی کو سمجھتا ہوں ۔

ایک بار مرزا جعفر حسین کے یہاں ایک ادبی نشست میں جوش اپنی زیرِ تکمیل نظم ''حرفِ آخر'' کا ابتدائی حصہ سنا رہے تھے ۔ مسعود حسن نے کئی مقامات پر بڑی تعریف کی ، لیکن ہر بار یہ ضرور کہا کہ ''واہ کیا تغزل ہے'' ۔ جوش اس تعریف پر ہر بار اُن کو گھور کر دیکھتے تھے ۔ آخر ایک بار ضبط نہ کر سکے اور بول اُٹھے ''صاحب! یہ تغزل کیا؟ تنظم کہیے تنظم'' ۔ مسعود حسن نے کہا : ''بھئی ہماری لغت میں تنظم لفظ ہی نہیں ہے ۔ اس نظم میں حوّا کو پہلی بار دیکھنے پر آدم کے دل میں جو لطیف جذبات پیدا ہوئے ہیں ، اُن کی جس خوبصورتی کے ساتھ آپ نے تصویر کھینچی ہے اُسی کو تو تغزل کہتے ہیں ۔'' سب اہلِ محفل نے تائید کی کہ بے شک یہاں پر زبردست تغزل موجود ہے ۔

اسی طرح جوش جب دہلی سے اُردو کا ایک معیاری رسالہ ''کاخِ بلند'' کے نام سے نکالنا چاہتے تھے تو انھوں نے مسعود حسن رضوی کو رسالے کا ایک تفصیلی خاکہ بھیجا ۔ مسعود حسن نے رسالے کے نام سے اختلاف کیا ۔ جوش نے اس اختلاف سے اتفاق کیا اور یہ رسالہ ''کلیم'' کے نام سے نکلا ۔

یوں مسعود حسن رضوی کی بہت سے مشاہیر کے ساتھ خط و کتابت بھی رہی اور ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں ۔ بہت سے لوگ خطوط کے ذریعے استفسار کرتے تھے اور بعض خود حاضری دیتے تھے ۔

مسعود حسن رضوی کا کتب خانہ :

مسعود حسن رضوی کا کتب خانہ بڑی اہمیت کا حامل تھا ۔ انھوں نے لکھنؤ کی گلیوں کی خاک چھان کر یہ کتابیں خریدیں ۔ ''ہماری شاعری'' میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''میں قدیم اور کمیاب کتابوں کی تلاش میں لگ گیا ۔ چار پانچ سال مسلسل اسی تلاش میں لکھنؤ کی گلیوں کی خاک چھانی ۔ خدا کا شکر ہے کہ میری یہ محنت رائیگاں نہیں گئی اور ادبی تحقیق کے لیے گراں قدر سامان فراہم ہو گیا جس میں اب بھی برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔''

یہ کتب خانہ کیسا تھا اور کیا تھا ۔ جن اہلِ علم نے اس سے استفادہ کیا یا اس ذخیرۂ کتب کو دیکھا ، انھوں نے اس کے بارے میں اپنے خیالات کا

اظہار کیا ہے جن سے اس کتب خانے کی ماہیت ، اہمیت اور افادیت کا پتہ چلتا ہے ۔ اس کتب خانے کے بارے میں مرزا محمد عسکری لکھتے ہیں :

"مسعود صاحب کا پرائیویٹ کتب خانہ ، خاص کر مجموعۂ مراثی قابلِ دید ہے ۔ کتابیں کمیاب و نایاب ، نادر قلمی نسخے ، ایک ایک کتاب کے متعدد ایڈیشن اور مرثیے کا تو یہ حال ہے کہ عہد قدیم یعنی دکن کے پرانے مرثیہ گویوں سے لے کر آج تک کے تمام چیدہ مرثیے متعدد الماریوں میں رکھے ہوئے جن کو دیکھ کر آپ کے تجسس و تلاش ، قوتِ انتخاب اور صرفِ زر کا اندازہ ہوتا ہے ۔ ایک مرتبہ نواب نصیر حسین خیال مرحوم نے میرے ساتھ آپ کے مرثیہ خانہ کی زیارت کی تھی اور مراثی کی کثرت و تنوع دیکھ کر مبہوت رہ گئے تھے ۔"[1]

شوکت تھانوی نے اپنے شگفتہ انداز میں مسعود حسن کے کتب خانے کے بارے میں تحریر کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

"وہ قلمی نوادر احتیاط سے رکھتے ہیں جن کو وہ اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھتے ہیں اور یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ان نوادر کو ہوا بھی لگ سکے[2] ۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے کتب خانے میں بہت ہی قیمتی چیزیں ہیں اور ان کی قیمت کا راز صرف ان کی نایابی میں ہے ۔ مثلاً اندر سبھا کا نایاب نسخہ ، واجد علی شاہ کی بیگمات کے خطوط ، واجد علی شاہ کی قلمی مثنویاں اور اسی قسم کی بے شمار چیزیں جن کو لوگ عجائبات کے طور پر دیکھنے جاتے ہیں اور مسعود حسن صاحب اگر بہت مجبور ہو گئے تو وہ نوادر اس طرح دکھاتے ہیں جس طرح نظام حیدرآباد نے علامہ اقبال کو اپنے جواہرات کا خزانہ دکھایا تھا ۔ اس میں شک نہیں کہ مسعود حسن صاحب کا خزانہ بھی جواہرات سے کم نہیں ۔"[3]

۱۔ من کیستم ، مرزا محمد عسکری ، ص ۶۹ - ۷۰ ۔

۲۔ یہ شوکت تھانوی کا اپنا خیال ہے ۔ فراہمی کتب کے سلسلے میں اس کا جواب دیا جا چکا ہے ۔

۳۔ نقوش شخصیات نمبر ، حصہ اول ، جنوری ۱۹۵۵ء ، ص ۵۴۲ ۔

علی عباس حسینی ان کے ذخیرۂ کتب اور مختلف موضوعات پر نسخوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''انھوں نے تاریخِ اودھ پر بہت سا نیا مواد جمع کر رکھا ہے اور واجد علی شاہ کی بھی تصنیفی ، تالیفی و ثقافتی زندگی پر جتنی وسیع ان کی معلومات ہیں اور اس فن کار بادشاہ کی جتنی تصنیفات ان کے پاس موجود ہیں ، ہندوستان و پاکستان میں کسی کے پاس نہیں ۔ مرثیوں کا ذخیرہ جیسا مسعود صاحب نے جمع کر لیا ہے ، وہ عالم کہیں نہ ملے گا ۔''[۱]

مرزا جعفر حسین نے ڈاکٹر صفدر آہ اور ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کے دو بیان درج کیے ہیں جن سے اس کتب خانے کی اہمیت اور افادیت پر روشنی پڑتی ہے ۔ ڈاکٹر صفدر آہ لکھتے ہیں :

''ادیب صاحب کا نادر کتب خانہ خود ان کی محنت اور کوشش سے جمع ہوا ہے . . . . گلی کوچوں میں پھر کر ہر قسم کی کمیاب اور نایاب کتابوں کا خریدنا ، انھیں بہ شوق پڑھنا . . . بعض موضوعات پر ان کے یہاں کتابوں کا جو ذخیرہ ہے وہ کہیں اور نہیں مل سکتا ۔''

مسعودِ حسن کے پاس مراثی کا جو بے پناہ ذخیرہ تھا اُسے دیکھنے کے لیے اہلِ علم دور دور سے آتے تھے ۔ ڈاکٹر آفاق حسین لکھتے ہیں :

''راجہ صاحب محمود آباد نے ایک دن بھائی صاحب سے فرمائش کی کہ میں آپ کا ذخیرہ مراثی دیکھنا چاہتا ہوں ۔ وقت اور تاریخ مقرر ہو گئی ۔ بھائی صاحب نے تین بڑے کمروں اور ان تینوں کمروں کے آگے کے وسیع دالان میں میزوں پر مراثی پھیلا دیے جو کثیر تعداد میں تھے ۔''

راجہ صاحب نے دیکھتے ہی فرمایا :

''پروفیسر صاحب ! آپ نے مجھے وہ لفسیاتی شکست دی ہے کہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا ۔''[۲]

۱- مسعود حسن رضوی ادیب — ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۲۷ ۔
۲- آج کل ، نئی دہلی ، فروری ۱۹۷۶ع ، ص ۳۷ ۔

مسعود حسن نے مراثی کا یہ ذخیرہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو معمولی رقم کے عوض دے دیا ۔

اعزازات :

مسعود حسن رضوی کو ان کی زندگی میں بہت سے انعام و اکرام اور اعزازات سے نوازا گیا ۔ اس میں ان کی تصنیفات پر انعام بھی شامل ہیں ۔ اس کی تفصیل یوں ہے :

(۱) تقسیمِ ملک سے قبل حکومتِ اُتر پردیش نے تین کتابوں پر ایک ایک ہزار روپے کا انعام دیا ۔ کتابوں میں لکھنؤ کا شاہی سٹیج ، لکھنؤ کا عوامی سٹیج اور رزم نامۂ انیس شامل تھیں ۔

(۲) ۱۳ فروری ۱۹۶۰ع کو حکومتِ ہند کی ادبی انجمن ساہتیہ اکیڈمی کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے وگیان بھون نئی دہلی کی ایک خاص تقریب میں "اُردو ڈرامہ اور سٹیج" پر اکاڈمی کا نشانِ امتیاز اور پانچ ہزار روپے کا چیک پیش کیا ۔

(۳) یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے یکم اگست ۱۹۶۳ع سے ۳۱ جولائی ۱۹۶۶ع تک تین سال کے لیے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں ریسرچ پروفیسر مقرر کیا ۔ ایک سال پانچ ہزار روپے اور دو سال سات سات ہزار روپے اعزازیہ مقرر کیا ۔

(۴) ۱۰ اپریل ۱۹۶۹ع کو صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے "فارسی کی مسلمہ قابلیت اور علمی شغف" کے لیے راشٹر پتی بھون نئی دہلی میں منعقدہ ایک تقریب میں سب سے بڑا علمی اعزاز سرٹیفیکیٹ آف آنر (سندِ اعزاز) اور خلعت کے علاوہ تین ہزار روپے سالانہ کا مستقل وظیفہ مقرر کیا ۔

(۵) ۲۱ اپریل ۱۹۷۰ع کو صدر جمہوریہ شری وی ۔ وی ۔ گری نے "پدم شری" کا خطاب و اعزاز دیا ۔

(٦) ۱۳ اپریل ۱۹۷۲ء کو حکومت اُتر پردیش نے ادبی خدمات کے صلے میں پانچ ہزار روپے کا خاص الخاص انعام دیا اور سند عطا کی ۔

(۷) دسمبر ۱۹۷۲ء میں اُتر پردیش اُردو اکادمی نے ''اسلافِ میر انیس'' پر دو ہزار روپے کا خاص انعام دیا ۔

☆ ☆ ☆

ادبی و شعری محرکات

اُردو ادب نے فارسی کے زیرِ سایہ پرورش پائی ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اسالیب اور روایات پر فارسی کا گہرا اثر رہا ۔ فارسی ادب کا مطالعہ کریں تو واضح طور پر یہ دکھائی دیتا ہے کہ نظریۂ نقد کے حوالے سے فارسی کا دامن خالی ہے ۔ ہاں البتہ شاعری بہت آگے ہے ۔ اُردو کا حال اس سے بھی پتلا ہے ۔ اُردو میں شاعری کی ابتدا بھی فارسی کے زیرِ اثر ہوئی اور اس طرح اُردو ادب کی ساری کائنات شاعری تھی اور نثر کا سرمایہ بہت کم تھا ۔ فارسی کی تقلید میں تذکرہ نویسی رواج پا چکی تھی ۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی لکھتے ہیں : ''اس کی ابتدا دہلوی شاعری کے تیسرے دور میں ہوئی ۔''[1] یہ دور میر و سودا کا دور ہے اور اس میں میر تقی میر کے تذکرے ''نکات الشعراء'' کو اولیت حاصل ہے ۔ اس کے علاوہ تذکرۂ شعرائے اُردو ، گلشنِ ہند ، گلزارِ ابراہیم ، مخزنِ نکات اور مجموعۂ نغز وغیرہ لکھے گئے ۔ ان تذکروں کی صورت بھی یوں ہے کہ چونکہ اس زمانے میں شعر و شاعری کا چرچا تھا اس لیے بیاضوں میں اشعار لکھ لیے جاتے تھے اور کہیں کہیں شعراء کے بارے میں رائے بھی درج کر دی جاتی تھی اور شعراء کے مختصر کوائف بھی ہوتے تھے ۔ ان تذکروں میں اگرچہ پورے طور پر تنقید نہیں ہے مگر پھر بھی شاعر کے کلام کے بارے میں تھوڑے بہت تنقیدی اشارے مل جاتے ہیں جنھیں اُردو تنقید کا نقطۂ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے ۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد سیاسی اور سماجی اعتبار سے تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں ۔ جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہوا اور اس کے نتیجے میں متوسط

۱۔ دلی کا دبستانِ شاعری ، از ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ، ص ۸۸ ۔

طبقہ ابھرا ۔ اس تبدیلیٔ حیات کا اثر اُردو ادب پر بھی پڑا ۔ مروجہ معیاراتِ تحقیق و تنقید کی عمارت ہل گئی اور زندگی کے نئے رجحانات کے ساتھ ساتھ تنقید کے بھی نئے معیارات قائم ہوئے ۔ ان تبدیلیوں کی نشاندہی ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بھی کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''ادب و شعر کو زندگی کا ترجمان سمجھا گیا ۔ اس کی نوعیت سماجی و عمرانی بتائی گئی ۔ یہ خیال عام ہوا کہ سماجی زندگی شعر و ادب پر اثر کرتی ہے اور ادب و شعر سماجی زندگی کو متاثر کرتے ہیں ۔ ادب اور شعر کے لیے افادیت کو ضروری قرار دیا گیا . . . اب صرف حسن کاری اس کا مقصد نہیں رہ گیا ۔ لفظی اور لسانی پہلوؤں کی طرف توجہ کم ہوئی ۔ اس کو اخلاق کا نائب مناب اور قوموں میں ایک نئی روح پھونکنے کا آلہ تصور کیا گیا اور ان تمام ضروری باتوں کو ذہن نشین کرانے کے لیے تنقید کے اصولوں پر تفصیل سے بحث کی گئی ۔''[۱]

یوں ادب میں مقصدیت کی تحریک شروع ہوئی اور اس کا سہرا سر سید احمد خاں کے سر ہے ۔ سر سید کی تحریک نے ادب کے مردہ قالب میں جان ڈال دی ۔ سادہ اور سلیس نثر کو رواج ہوا ۔ ادب کے معنوی پہلوؤں پر زور دیا جانے لگا ۔ ادب کو الہامی اور ما بعد الطبیعیاتی تصورات سے نجات دلائی گئی اور اسے سماجی اور عوامی بنایا گیا ۔ سر سید کی یہ تحریک جو علی گڑھ تحریک کے نام سے موسوم ہے ، تعلیمی یا سیاسی تحریک کے علاوہ فکری ، تہذیبی اور علمی و ادبی تحریک بھی ہے ۔ اس تحریک کے ذریعے سر سید نے اُردو ادب میں ایک انقلاب برپا کیا ۔ اس کا آغاز صحیح معنوں میں تہذیب الاخلاق (۱۸۷۰ع) کے اجرا سے ہوا ۔ اس کے مقاصد خود سر سید نے پہلی اشاعت میں واضح کیے ۔ ان کے بقول ''ہم لوگوں کو مغربی تمدن اور معاشرت سے آگاہ کریں گے ۔ جہالت اور رسم و رواج کی بیخ کنی کریں گے ۔ سوسائٹی اور اس کے اخلاق کو سدھاریں گے ۔ علمِ مجلس اور علمِ اخلاق کی درستی میں کوشش کریں گے اور سب سے بڑھ کر فنِ انشا اور شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کریں گے ۔''

چنانچہ تہذیب الاخلاق کے مضامین انھی مقاصد کا احاطہ کرتے ہیں اور خاص طور پر فنِ انشا اور شاعری میں نئے نئے خیالات اور افکار و تصورات کے

۱۔ اُردو تنقید کا ارتقا ، از ڈاکٹر عبادت بریلوی ، ص ۳۷۳ ۔

حامل بھی ہیں ۔

ان مقاصد کے پیش نظر سرسید اور ان کے رفقا نے مضامین لکھے ۔ ان مضامین نے ادبی اعتبار سے اسلوبِ بیان میں ایک نئی طرز کی بنا ڈالی ۔ بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ ''سرسید کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جدید مغربی خیالات کو قبول کرنے کے لیے ذہنوں کو آمادہ کیا ۔''۱

چنانچہ اُردو میں مغربی تصورات در آئے اور مغربی علوم سے استفادہ کیا جانے لگا ۔ یوں سرسید نے اُردو ادب کو بے انتہا متاثر کیا ۔ مہدی افادی کی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بقول اُن کے ''سر سید کے کمالاتِ ادبی کا عدمِ اعتراف صرف نا شکری نہیں بلکہ تاریخی غلطی ہے ۔''۲

اس تناظر میں اُردو ادب کی نئی تحریکیں سرسید ہی کی مرہونِ منت ہیں ۔ مولانا شبلی نے سر سید کے اُردو ادب پر احسانات کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے :

''سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ رفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرے سے آفتاب بن گئیں ، ان میں ایک اُردو لٹریچر بھی ہے ۔ سر سید ہی کی بدولت اُردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی ، سیاسی ، اخلاقی ، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر ، وسعت و جامعیت ، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں ہوئی ۔ ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمران ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سر سید کے بارِ احسان سے گردن اُٹھا سکتا ہو ۔ بعض بالکل ان کے دامنِ تربیت میں پلے ہیں ۔ بعضوں نے دور سے فیض اُٹھایا ہے ۔ بعض نے مدعیانہ اپنا الگ راستہ نکالا ۔ تاہم سر سید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے تھے ۔''۳

۱۔ سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ ، از ڈاکٹر سید عبد اللہ ، ص ۲۷۹ ۔

۲۔ افاداتِ مہدی ، مرتبہ مہدی بیگم ، ص ۲۳۳ ۔

۳۔ نگار ، سرسید نمبر (حصہ اول) ، نومبر ۔ دسمبر ۱۹۷۰ع ، ص ۱۱ ۔

شبلی نعمانی کے اس بیان کے بعد تو سر سید کے اثرات سے انکار ہی نہیں کیا جا سکتا ۔ تہذیب الاخلاق کے حوالے سے اسلوبِ بیان کے علاوہ موضوع روحِ معانی پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے ۔" ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے صحیح لکھا ہے :

"تہذیب الاخلاق نے ہمارے ادب اور انشا کا رخ بدل دیا ۔ تصنع کی جگہ سادگی اور اصلیت نے لے لی ۔ عبارت سلیس اور جاندار لکھی جانے لگی ۔ اب قلم اور دماغ کو الفاظ کی مینا کاری کے بجائے مضمون کے ادا کرنے کا موقع ملا ۔ اُردو میں بھاشا[1] کی سادگی ، عربی کی وسعت ، انگریزی کی صاف گوئی اور زور کو رواج پانے کا موقع ملا ۔"

یوں اس ادبی تحریک میں سر سید کے رفقاء نے بھی بھرپور حصہ لیا اور مختلف اصنافِ ادب میں جو اضافے کیے اور ان کے جو اصول وضع کیے اس نے اُردو ادب پر دور رس اثرات مرتب کیے ۔ اس بارے میں احتشام حسین کا یہ بیان خاصی اہمیت کا حامل ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

"سر سید اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں اُردو ادب نے ایک نئی کلاسیکی عظمت حاصل کی جس کے لیے حسن و رعنائی کم ، صحت زیادہ ہے ۔ بلکہ یہ نئی زندگی میں داخل ہونے کا شعوری احساس تھا جس نے ادب کو سماج اور تہذیب کے ارتقاء کا ایک اہم آلۂ کار بنایا . . . . سر سید کے دور میں علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر اُردو ادب کی ایک منزل آئی اور ایک نئی منزل کی طرف ادب کا کارواں روانہ ہو گیا . . . سرسید کے ادبی کارنامے ، تہذیب الاخلاق کی جاندار نثر ، علمی و ثقافتی مسائل پر بحث مباحثے ، ڈپٹی نذیر احمد کے ناول اور لیکچروں کے مجموعے ، حالی کی شاعری اور تنقیدی بصیرت ، محسن الملک مولوی چراغ علی ، وقار الملک ، ذکاء اللہ ، سید علی بلگرامی کے ادبی کارنامے ، تحریک سے مخالفت کے باوجود شبلی کے علمی و ادبی شاہکار اور ان سب سے بڑھ کر وہ زندہ تحریک اور ترقی پذیر ادبی و علمی فضا جو ان بزرگوں کے کارناموں سے وجود میں آئی ، یہ سب چیزیں علی گڑھ تحریک کے دفترِ عمل میں لکھی جائیں گی ۔"[2]

۱۔ نگار ، سرسید نمبر (حصہ دوم) ، جنوری ۔ فروری ۱۹۷۱ع ، ۲۰۳ ۔

۲۔ نگار ، سر سید نمبر (حصہ دوم) ، جنوری ۔ فروری ۱۹۷۱ع ، ص ۲۴۸ ۔

اس اقتباس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ سر سید اور ان کے رفقاء نے ادب کو ہر طرح سے متاثر کیا ۔ علی گڑھ تحریک کے جو نتائج سامنے آتے ہیں، موضوع اور روحِ معانی میں انقلاب کے حوالے سے اس کی فہرست کچھ یوں بنتی ہے :

(۱) مقالہ نگاری ۔ (۲) تنقیدِ جدید کا آغاز ۔ (۳) سوانح نگاری ۔
(۴) تاریخ نگاری ۔ (۵) نیچرل شاعری ۔

یوں سر سید کے نورتنوں نے بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار :

''اُردو شعر و ادب میں پہلی مرتبہ ایک ہمہ گیر اصلاحی تحریک کے سلسلے میں مقصدی شعر و ادب کی تخلیق کی روایت قائم کی ۔ یہ ایک بہت بڑا اقدام تھا ۔ اُردو شعر و ادب میں پہلی مرتبہ ادب کی عمرانی اہمیت کا اندازہ لگایا گیا ۔''[۱]

اس سلسلے میں شیخ محمد اکرام کی رائے خاصی وزنی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''ادبی نقطہ نظر سے علی گڑھ تحریک کے سارے پھل میٹھے تھے ۔''[۲]

سرسید کی اس ادبی تحریک کو خراج پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں :

"Being a great wrifer himself, he was the couse of great writing in others. The impulse be gave to the Literature was great, he inaugurated a new era in Literature in Northern India."[3]

اس تناظر میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سرسید نے اُردو ادب میں ایک انقلاب برپا کیا اور ان کے زیر اثر مغربی علومِ سے استفادہ کرنے کا میلان پیدا ہوا ۔ اس فضا میں حالی ، شبلی اور آزاد نے نہ صرف تنقید کی بنیادیں رکھیں

۱۔ اُردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر ، از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، ص ۱۰۳ ۔

۲۔ موجِ کوثر ، از شیخ محمد اکرام ، ص ۱۴۲ ۔

۳۔ A History of Literature by Dr. M. Sadiq, p. 262.

بلکہ تنقید کے لئے تصورات بھی قائم کیے ۔ حالی کو اُردو کے اہم ترین نقادوں میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔ ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں پہلی بار انھوں نے اصول تنقید وضع کیے ۔ ''حیات سعدی'' اور ''یادگار غالب'' میں عملی اور نظریاتی تنقید کے نمونے پیش کیے ۔ اگرچہ بعض مقامات پر وہ اُلجھاؤ کا بھی شکار ہوئے ہیں اور اس کی وجہ انگریزی سے ان کی ناواقفیت قرار دی جا سکتی ہے ۔ بعض جگہوں پر وہ بات کو واضح بھی نہیں کر سکے ۔ خاص طور پر یادگار غالب میں وہ اپنے وضع کردہ اصولوں کی نفی بھی کر جاتے ہیں ۔ ڈاکٹر وحید قریشی ان کی تنقید نگاری کی اس خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ان کے تنقیدی نظام میں توازن نہیں ، وضاحت ہے ۔ اس وضاحت اور اس سادگی نے ان کے انداز نظر کو عام فہم اور دلچسپ تو ضرور بنا دیا ہے لیکن یہ اجتہاد اس لیے ناقص ہے کہ اس پر زیادہ غور نہیں کیا گیا ۔ شیفتہ ، ہالرائیڈ اور سرسید کے میل جول نے ان کے انداز نظر میں ایک خوشگوار تبدیلی تو ضرور پیدا کردی ہے لیکن یہ تبدیلی نظام تنقید میں زیادہ دور تک جاتی نظر نہیں آتی ۔''[1]

لیکن اس کے باوجود حالی نے بعض ایسے تنقیدی نظریات اُردو میں پہلی بار رائج کیے جن کا وجود نہ تھا ۔ انھوں نے پہلی بار شاعری کو خالص سماجی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور جانچنے کی کوشش کی ۔ اس کے ساتھ ساتھ نظریاتی اور عملی تنقید کی ابتدا بھی کی اور ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں پہلی بار شاعری کے اصول و ضوابط پر بحث کی اور شاعری کے اصول بھی وضع کیے ۔ ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں :

"It is only when we came to Hali that we catch the first authentic notes of the renaissance in poetry and criticism."[2]

اسی طرح ''مقدمہ شعر و شاعری'' کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر محمد صادق رقمطراز ہیں :

۱۔ مطالعۂ حالی ، از ڈاکٹر وحید قریشی ، ص ۴۳ - ۴۲ ۔

۲۔ A History of Urdu Literature, by Dr. M. Sadiq, p. 266.

" "Muqaddama-e-Shir-o-Shairi" marks the dawn of historical and scientific criticism in Urdu. It is first formal treatise on poetry."[1]

چنانچہ اُردو میں سائنٹیفک تنقید رائج کرنے میں مولانا حالی کا بہت بڑا ہاتھ ہے ۔ مولانا حالی کی تنقید میں خامیاں بھی تھیں جن کے بارے میں اوپر ڈاکٹر وحید قریشی کے حوالے سے بات کی جا چکی ہے ۔ کلیم الدین احمد نے "اُردو تنقید پر ایک نظر" میں مولانا حالی پر خاصے اعتراضات لگائے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

"حالی کی نظر سطحی تھی اور یہ سطحیت ہر جگہ ملتی ہے ۔"[2]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

"شعر کی ماہیت سے بھی وہی بے خبری ہے جو شعر کی اہمیت سے تھی ۔"[3]

لیکن ان سب خامیوں کو اگر مان بھی لیا جائے تو پھر بھی "مقدمہ شعر و شاعری" کے حوالے سے مولانا حالی اہم ترین نقاد ہیں جنھوں نے اُردو تنقید کو ایک نئی راہ سجھائی ۔ شبلی نعمانی ، حالی کے برعکس ، شاعری کو خالص سماجی نقطہ نظر سے جانچنے کی بجائے منطقی اور فلسفیانہ نظر سے جانچتے ہیں ۔ ان کا رجحان مغربی سے زیادہ مشرقی تنقید کی طرف ہے ۔ وہ صوری اور جمالیاتی پہلوؤں کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں ۔ شعر العجم میں اس کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں ۔

"موازنہ انیس و دبیر" سے پہلی بار تقابلی تنقید کا آغاز ہوتا ہے اور اس میں عملی اور نظری دونوں طرح کی تنقید ملتی ہے ۔

۱- A History of Urdu Literature, by Dr. M. Sadiq, p. 269.
۲- "اُردو تنقید پر ایک نظر" ، از کلیم الدین احمد ، ص ۸۸ ۔
۳- "اُردو تنقید پر ایک نظر" ، از کلیم الدین احمد ، ص ۹۲ ۔

حالی اور شبلی کے ہم عصر آزاد ادب کی سماجی حیثیت کے قائل تھے۔ میجر فلر اور کرنل ہالرائیڈ کی صحبتوں کی وجہ سے مغربی ادبیات سے خاصی واقفیت رکھتے تھے اور مغرب سے خاصے متاثر بھی تھے۔ ان کے ہاں عبارت آرائی انھیں تنقید سے دور لے جاتی ہے۔ چنانچہ آب حیات میں تنقید بہت کم نظر آتی ہے۔ البتہ آب حیات کے حوالے سے آزاد وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے تذکرے کو ادبی تاریخ بنایا۔ ان کی تحریروں کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان کی تنقید میں رومانی اور تاثراتی تنقید کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

اس تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرسید اور اس کے زیر اثر ادیبوں نے تنقید میں نہ صرف نئے معیارات و تصورات پیش کیے بلکہ نئی تنقیدی روایتوں کی بھی بنا ڈالی اور اُردو تنقید کے لیے ایک سازگار فضا قائم کی۔

اس عہد میں تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیق کو بھی رواج ہوا اور اس میں بھی دور رس تبدیلیاں ہوئیں۔ سرسید کی آثار الصنادید اور آئینِ اکبری تحقیقی کتابیں ہیں۔ ان میں جدید طریقۂ تدریس کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ڈاکٹر محمود الٰہی اپنے مضمون ''سرسید اور اُردو میں جدید تحقیق'' میں رقمطراز ہیں:

> ''آثار الصنادید سے آئینِ اکبری تک کا فاصلہ کوئی زیادہ طویل نہیں، لیکن سرسید کے تحقیقی اکتسابات کے لحاظ سے بہ کافی اہم ہے۔ اگر آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں سرسید کے تحقیقی شعور پر جذباتیت اور افسانویت کا پردہ پڑا ہوا تھا، تو آئینِ اکبری تک آتے آتے ان کی رگوں میں تلاش و تفحص خون بن کر دوڑنے لگا۔ آئینِ اکبری میں سرسید ایک مغربی محقق کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا موضوعِ تحقیق مشرقی تھا لیکن انداز و آداب مغربی۔ اب وہ مسائل کی تہوں تک پہنچنے کا ڈھنگ جان گئے تھے۔''[۱]

گویا سرسید نے اُردو تحقیق کو بھی متاثر کیا اور تحقیق نے مشرقی اصولوں کے ساتھ ساتھ مغربی اصولِ تحقیق کو بھی اپنایا۔

آزاد کا تذکرۂ آبِ حیات ایک طرح تحقیقی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے

۱۔ نگار، سرسید نمبر (حصہ دوم)، جنوری۔ فروری ۱۹۷۱ع، ص ۲۶۳۔

مندرجات کے مستند ہونے پر جس طرح عدمِ اعتماد کا اظہار کیا گیا ہے ، وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے ۔ البتہ ایک بات ضرور ہے کہ آبِ حیات تحقیق کی نئی روایت کو آگے بڑھاتی ہے ۔ شبلی کی ادبی کاوشوں سے گہرے مطالعے ، تاریخی تحقیقات اور چھان بین سے ان کی بالغ نظری کا تو ثبوت مل جاتا ہے مگر کہیں کہیں وہ بھی آزاد کی طرح روایات کا سہارا لیتے ہیں اور ان کے ہاں تحقیقی لغزشیں موجود ہیں مگر پھر بھی تحقیق کے لئے در ضرور کھلتے ہیں ۔

تحقیق و تنقید کے حوالے سے ''آبِ حیات'' ہو یا ''شعر العجم'' ، ان سب کی بنیاد پرانی بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے ۔ مغرب سے استفادے کے باوجود مشرقی نظریات کا غلبہ زیادہ نظر آتا ہے ۔ البتہ نظریاتی ، عملی اور تقابلی تنقید کا آغاز اسی دور سے ہوتا ہے ۔

سر سید اور ان کے رفقاء کے ان انقلابی کارناموں نے اُردو ادب کو نئی سمتوں سے روشناس کرایا اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ ایک زمانے تک اُردو ادب پر چھائے رہے اور بعد میں بھی ادیبوں نے ان کے چراغ سے چراغ جلائے ۔

عہدِ سر سید کے بعد تحقیق نے ایک نیا رخ اختیار کیا ۔ مولوی عبد الحق اس بعد کے دور کے بڑے محقق ہیں اور انہوں نے کوشش کی کہ خطی نسخے کتابی شکل میں سامنے آ جائیں تاکہ آنے والے محقق ان پر کام کر سکیں ۔ نسخوں کی چھان بین اور تقابل وغیرہ کی طرف انہوں نے زیادہ توجہ نہیں دی ۔ ان کے ساتھ دتاتریہ کیفی ، حبیب الرحمٰن شروانی اور حافظ محمود شیرانی جیسے محقق بھی اُردو ادب کے مختلف تحقیقی موضوعات پر کام کر رہے تھے ۔

ان ادبی و شعری محرکات کے تناظر میں مسعود حسن رضوی نے لکھنے کا آغاز کیا اور ان کے سامنے تحقیق و تنقید کی یہ سب روایات موجود تھیں ۔ مسعود حسن رضوی ، حالی اور شبلی سے زیادہ آزاد سے متاثر نظر آتے ہیں لیکن انھوں نے محض ان کی تقلید نہیں کی بلکہ اپنے لیے نئی راہیں بھی نکالیں ۔ آزاد کے وہ بہت بڑے حمایتی بھی رہے اور ان کے حق میں بہت کچھ لکھا اور ان کا دفاع کیا ۔

شبلی کی تقابلی تنقید اور مورخانہ صلاحیتوں سے بھی انہوں نے اثر قبول کیا ۔

حالی کے ''مقدمۂ شعر و شاعری'' کے مندرجات سے اختلاف کرتے ہوئے ''ہماری شاعری'' لکھی ۔ اسی طرح تحقیق میں مولوی عبد الحق سے جدا راستہ اختیار کیا ۔

اُردو ادب کی کچھ اور تحریکیں بھی مسعود حسن رضوی کے سامنے گزریں ۔ مثلاً پنچ اخبارات کی تحریک اور ترقی پسند تحریک ۔ مسعود حسن رضوی نے ان تحریکوں اور ان کے محرکات کا مطالعہ ضرور کیا مگر ان سے کوئی سروکار نہ رکھا ۔ ''اودھ پنچ'' کے مدیر منشی سجاد حسین سے ان کا یارانہ تھا ۔ اسی طرح ترقی پسند تحریک کے سالاروں میں سے ایک یعنی پروفیسر احمد علی ان کے رفیقِ کار اور سجاد ظہیر یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے تھے مگر اس کے باوجود انھوں نے ترقی پسند تحریک کو کبھی بھی موضوع نہیں بنایا ۔ انھوں نے نظم و نثر کی تنقید میں معقول اور متوازن طریق اختیار کیا ۔

سر سید کی تحریکوں کے اثرات قبول کرنے ، حالی اور شبلی سے متاثر ہونے ، آزاد کی حمایت کرنے اور مختلف ادبی محرکات کا مطالعہ کرنے سے مسعود حسن رضوی کا جو تعلق بنتا ہے اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی ۔ وہ بطور نقاد کن اصولوں کے تحت لکھتے تھے ، تحقیق میں ان کا طریقِ کار کیا تھا ، ان سب مباحث کا جائزہ ان کی کتابوں اور مختلف تحریروں کے حوالے سے بطور نقاد اور بطور محقق الگ الگ لیا جائے گا ۔

☆ ☆ ☆

بحیثیت نقاد

مسعود حسن رضوی نے اپنی زندگی میں بہت کچھ لکھا ۔ کتابیں مرتب کیں ، حواشی لگائے ، تنقید لکھی ، تحقیق کا حق ادا کیا ، غرض ان کی تصانیف و تالیفات کے ساتھ ساتھ ان کے بکھرے ہوئے مضامین بھی خاصی تعداد میں ہیں جو ان گنت اور اہم موضوعات پر مشتمل ہیں ۔ ان میں سے اگرچہ بہت سے مضامین ان کی کتابوں میں شامل ہو گئے ہیں ، مگر ان کی تعداد اتنی ہے کہ اب بھی متنوع موضوعات پر ان سے کئی کتابیں مرتب کی جا سکتی ہیں ۔ ان کی سب تحقیقات و تنقیدات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے زندگی بھر تحقیق کے لیے جستجو کی اور قدیم و جدید تحقیقی و تنقیدی سرمائے کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا اور اسی مطالعے نے ان کی تنقیدی و تحقیقی نظر میں وسعت پیدا کی ۔ اس سے پہلے کہ ان کی تنقید و تحقیق کا جائزہ لیا جائے ، ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کے مطالعے کے شوق اور لکھنے کے آغاز پر بھی گفتگو کر لی جائے ۔

مطالعے کا شوق :

مسعود حسن رضوی کو بچپن ہی سے مطالعے کا شوق تھا اور وہ کتابیں پڑھتے رہتے تھے ۔ اس سلسلے میں مرزا جعفر حسین لکھتے ہیں :

"مسعود صاحب کو ہمیشہ ٹھوس اور سنجیدہ کتابیں پڑھنے کا شوق رہا ۔ وہ رابرٹ لوئی اسٹیولسن کے اس زمانے[1] میں بہت دلدادہ تھے یا بیکن کا دقیق مطالعہ کرتے ، مگر کم پڑھتے اور غور زیادہ کرتے ۔ بیاری کی

۱- امامیہ بورڈنگ ہاؤس کا زمانہ جب ۱۹۱۸ع میں مسعود حسن ایف ۔ اے کے طالب علم تھے ۔

حد تک یہ جنون تھا کہ جو فقرے ، جملے یا مضامین بہت پسند آتے
تھے وہ یاد کر لیتے تھے اور کبھی نہیں بھولتے تھے ۔"[۱]

ڈاکٹر آفاق حسین نے ان کے زمانۂ طالب علمی کے مطالعے کے شوق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

"بھائی جان جب حسین آباد ہائی سکول میں چھٹے درجے میں لیے گئے تو اس وقت تک انگریزی کے حرف شناس تک نہیں تھے ۔ ساتواں درجہ پاس کرنے کے بعد گرمیوں کی چھٹیوں میں جب وطن آئے تو ،نس فیلڈ کی گرائمر لیتے آئے ۔ کہنے لگے کہ ہماری کلاس میں ایک لڑکا گرائمر اچھی جانتا ہے ۔ چھٹیوں میں بغیر کسی کی مدد کے ساری گرائمر پڑھ ڈالی اور جب لکھنؤ آئے اور آٹھویں کلاس میں داخل ہوئے تو جو لڑکا گرائمر میں اچھا تھا اس کو کوسوں پیچھے کر دیا ۔"[۲]

مسعود حسن رضوی سنہ ۱۹۱۸ع میں سررشتۂ تعلیم کے کٹیلاگ ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہوئے جہاں اُنھیں کتابوں پر ریویو لکھنا پڑتا تھا ۔ وہاں انھوں نے تقریباً نو دس ہزار کتابیں پڑھیں جس کی وجہ سے ان کی نظر میں وسعت اور دل میں لکھنے کا شوق پیدا ہوا ۔ ڈاکٹر نذیر احمد ان کے مطالعے کے بارے میں لکھتے ہیں :

"وہ صبح جلد اُٹھ جاتے ہیں ۔ معمولات سے فارغ ہونے کے بعد مطالعے کے کمرے میں آ کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں اور رات تک یہی شغل رہتا ہے ۔ اب اسّی سال کی حدود میں ہوں گے ، مگر اب تک معمول میں فرق نہیں آیا ۔"[۳]

ڈاکٹر نیر مسعود اس بات کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"رات کے گیارہ بجے تک وہ تصنیف و تالیف میں لگے رہتے ۔ پھر سونے کے لیے لیٹ جاتے اور رات کو دو یا تین بجے جس وقت بھی آنکھ

۱۔ ادبیات و شخصیات ، از جعفر حسین ، ص ۲۰۸ ۔
۲۔ آج کل ، نئی دہلی ، فروری ۱۹۷۶ع ، ص ۳۷ ۔
۳۔ مسعود حسن رضوی ادیب ــ ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۷۸ ۔

کھلتی ، لکھنے پڑھنے میں لگ جاتے اور پھر نہ سوتے ۔''۱

یوں مسعود حسن رضوی نے اپنی تمام زندگی مطالعے ہی میں گزاردی ۔ معلوم نہیں کہ ان کی نظر سے کتنی کتابیں سرسری طور پر گزری ہوں گی اور کتنی کتابوں کا انھوں نے دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہوگا ۔

لکھنے کا آغاز :

مسعود حسن رضوی نے کیٹلاگ ڈیپارٹمنٹ میں جو ریویو لکھے ، تلاش کے باوجود نہ تو دفتری فائلوں میں اور نہ ہی خود مسعود حسن رضوی کے اپنے ریکارڈ میں اس زمانے کی کوئی تحریر مل سکی ہے ۔ البتہ اس ملازمت سے پہلے ۱۹۱۷ء میں جب انھوں نے ایم ۔ اے انگریزی میں داخلہ لیا تو انگریزی کے تین رومانی شاعروں شیلے ، کیٹس اور کولرج کا تقابلی مطالعہ کیا ۔ اس مضمون کو ان کے پروفیسروں نے بڑا پسند کیا ۔ اس دوران وہ انگریزی سے اُردو کی طرف متوجہ ہوئے ۔ شاعری بھی شروع کی لیکن پھر نظم کی بجائے اپنے لیے نثر کا میدان منتخب کیا ۔ ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں :

''انگریزی سے اُردو اور نظم سے نثر کی طرف اس رجوع کی معنی خیز علامت ان کی پہلی کتاب ''امتحانِ وفا'' شائع ہوئی ۔''۲

اینک آرڈن کی نظم کو نثر میں ترجمہ انھوں نے ۱۹۱۸ء میں کیا جو ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا ۔ اس سے ہی مسعود حسن رضوی کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا ۔ اسی طرح لکھنؤ ریڈیو سے ۴ ستمبر ۱۹۶۰ء کو ''میری ادبی زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعات اور شخصیات'' کے عنوان سے تقریر کرتے ہوئے اور پھر ۲۶ فروری ۱۹۶۷ء کو جی ۔ ایم ۔ شاہ کو انٹرویو دیتے ہوئے اس بات کا تذکرہ کیا کہ ''امتحانِ وفا'' کو ہی ان کی ادبی زندگی کا نقطۂ آغاز سمجھنا چاہیے ۔ جی ۔ ایم ۔ شاہ کے ایک سوال کے جواب میں کہ آنجناب کی پہلی تصنیف کون سی تھی ؟ مسعود حسن رضوی نے کہا :

۱۔ نیا دور لکھنؤ ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ ۔ اپریل ۱۹۷۷ء ، ص ۳۱ ۔
۲۔ مسعود حسن رضوی ادیب ـــ ذات و صفات ، مرتبہ سالک رام ، ص ۶۸ ۔

"اس کے جواب میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اگر مضامین کو بھی تصنیفات میں شمار کیجیے تو سب سے پہلا مضمون انگریزی زبان میں تھا جس کا عنوان تھا "The Cultural Value of Urdu" - دوسرا ایک مبسوط اور جامع مضمون تھا جس کا عنوان تھا "شعر" - یہ دونوں مضامین "لکھنؤ یونیورسٹی جرنل" میں شائع ہوئے تھے - اس کے بعد تو مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا -"[1]

یوں مسعود حسن رضوی کا سب سے پہلا تصنیفی کارنامہ "امتحانِ وفا" ہے جو ۱۹۱۸ء میں ترجمہ کیا - اس کے بعد ان کا یہ پہلا مضمون "The Cultural Value of Urdu" "لکھنؤ یونیورسٹی جرنل" کے مئی ۱۹۲۳ء کے شمارے میں شائع ہوا اور دوسرا مضمون "شعر" فروری ۱۹۲۴ء کے شمارے میں چھپا - "امتحانِ وفا" پر مسعود حسن رضوی بطور مترجم کے الگ بحث ہوگی - مسعود حسن رضوی کے دوسرے دو مضمون ایسے ہیں جن سے ان کی تنقید کی ابتدا ہوتی ہے (اگرچہ "امتحانِ وفا" میں بھی انھوں نے لارڈ ٹینی سن کی شاعری پر تنقیدی نظر ڈالی ہے) - اپنے مضمون "شعر" سے انھوں نے دراصل شاعری پر تنقید کا آغاز کیا - اس طرح اس سلسلے کے دو اور مضمون "اُردو شاعری پر اعتراض کی نظر اور تحقیق کی نگاہ" اور "کیا اُردو شاعری تقلیدی اور غیر فطری ہے" - رسالہ اُردو میں جولائی ۱۹۲۶ء اور اکتوبر ۱۹۲۷ء کے شماروں[2] میں شائع ہوئے - ان مضامین میں شاعری کے بارے میں جو مبحث پیش کیے گئے ہیں وہ بعد میں "ہماری شاعری" کی صورت میں کتابی شکل میں سامنے آئے اور اس طرح شاعری پر بھرپور تنقیدی کتاب چھپی -

ہماری شاعری :

ہماری شاعری کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۷ء میں انجمن ترقیٔ اردو ، اورنگ آباد ، دکن" کے زیرِ اہتمام شائع ہوا - ڈاکٹر مولوی عبد الحق اس کتاب کی اشاعت سے ناخوش تھے - اس کا اظہار انجمن ترقیٔ اُردو کے ایک اہل کار محمد صدیق حسن

۱- اہلِ قلم سے ملاقاتیں — جی - ایم - شاہ کا مسعود حسن رضوی سے انٹرویو ، لکھنؤ ریڈیو ، نشریہ ۲۶ فروری ۱۹۶۷ء -

۲- میرے پاس موجود ہیں -

نے مسعود حسن رضوی کے نام اپنے ۲۷ دسمبر ۱۹۲۷ء کے خط[1] میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

''کتاب کو دیکھ کر سخت مایوسی اور افسوس ہوا اور مولوی صاحب قبلہ نے تو اسے بالکل ہی ناپسند کیا ۔ اور پھر اس پر اتنا صرف ہو گیا کہ اس کا اتنی قیمت میں فروخت ہونا تقریباً نا ممکن نظر آتا ہے . . . . مولوی صاحب قبلہ فرماتے تھے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کتاب کا کیا حشر ہوگا اور کیسے فروخت ہو سکے گی کیونکہ لاگت بہت زیادہ آ گئی ہے ۔ اگر جلد بندی (فل کلاتھ) کے بعد ایک روپے پر فروخت ہو سکتی تو البتہ نکل جاتی ۔ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے اور شاید پندرہ بیس برس میں بھی یہ پانسو نسخے نکل سکیں تو غنیمت ہے ۔''

مولوی عبد الحق کی یہ عجیب و غریب رائے اور محمد صدیق حسن کا اندازہ دونوں غلط نکلے کیونکہ یہ کتاب بہت جلد فروخت ہو گئی اور اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا اور اب تک اس کے چودہ ایڈیشن (۱۹۲۷ء ، ۱۹۲۹ء ، ۱۹۳۵ء ، ۱۹۴۰ء ، ۱۹۵۳ء ، ۱۹۵۶ء ، ۱۹۵۹ء ، ۱۹۶۲ء ، ۱۹۶۳ء ، ۱۹۶۷ء ، ۱۹۷۱ء ، ۱۹۷۳ء ، ۱۹۷۶ء ، ۱۹۷۹ء) چھپ چکے ہیں ۔ مندرجات کے حوالے سے ''ہماری شاعری'' متنازعہ فیہ رہی ۔ خاص طور پر بیخود موہانی نے اس پر خاصے اعتراضات کیے اور جوہرِ آئینہ و منظرِ آئینہ کے نام سے دو کتابچے بھی لکھے ۔ بعض دوسرے نقادوں نے ہماری شاعری کے حق میں لکھا ۔ خود مسعود حسن رضوی نے کئی مضامین لکھے جو بعد میں ''آئینۂ سخن فہمی'' کے نام سے شائع ہوئے جن میں بیخود موہانی کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے ۔ محمد باقر شمس کا ایک رسالہ ''شکستِ آئینہ'' کے نام سے شائع ہوا ۔

مولانا حالی نے ''مقدمۂ شعر و شاعری'' میں جس طرح شعر کی تعریف ، شعر کی عظمت ، شاعری کا تعلق اخلاق کے ساتھ ، شاعری میں تقلید ، وزن کی شعر میں ضرورت ، قافیہ ، شاعری کے لیے شرطیں ، تخیل کی تعریف ، شعر کی خوبیاں ،

۱۔ میرے پاس موجود ہے ۔

اصناف شاعری خاص طور پر غزل کے بارے میں اظہار خیال کیا اس سے بحث کی نئی راہیں کھلیں ۔ مولانا حالی نے غزل کی مخالفت کی ۔ اس ضمن میں مسعود حسن رضوی نے اپنی اس کتاب ''ہماری شاعری'' میں شعر کے دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ غزل پر مولانا حالی کے اعتراضات کا جواب دیا ۔ اس کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مولانا حالی کے جواب ہی میں لکھی گئی ، اگرچہ مسعود حسن رضوی نے (غالباً مصلحتاً) خود ایسا خیال ظاہر نہیں کیا بلکہ ''ہماری شاعری'' کو ''مقدمہ' شعر و شاعری'' کا تتمہ قرار دیا ۔ لیکن اس کے باوجود کہیں کہیں ان پر تنقید بھی کی ۔ ''ہماری شاعری''[۱] کے مقدمے میں مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں :

''ایک طرف مغربی تنقید کی کورانہ تقلید نے ہم کو مشرق مذاق شاعری سے بیگانہ کر دیا ۔ دوسری طرف خواجہ حالی کی اصلاحی تحریک نے قدیم اُردو شاعری کے خلاف بدظنی پھیلا دی ۔ انھوں نے اُردو شاعری کی اصلاح کی غرض سے اپنے دیوان کا جو معرکہ آرا مقدمہ ''شعر و شاعری'' کے عنوان سے لکھا ، وہ اُردو شاعری پر ایک عالمانہ تبصرہ ہے ۔ اس کا خاص مقصد یہ ہے کہ اُردو شاعری کے نقائص دکھائے جائیں اور ان کی اصلاح کی تدبیریں بتائی جائیں ۔ اپنے مقصد کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے اُردو شاعری کے اس حصے کو نمایاں کیا ہے جو ان کی رائے میں اصلاح کا محتاج تھا ۔ اور اُس حصے سے عمداً چشم پوشی کی ہے جو ان کے نزدیک بھی اصلاح سے مستغنی اور تعریف کا مستحق تھا کیونکہ وہ ان کے موضوع بحث سے خارج تھا ۔ اس مقدمے نے جہاں اُردو شاعری کو اس بات پر آمادہ کیا کہ پرانے فرسودہ راستوں کو چھوڑ کے شاعری کے لیے نئی نئی راہیں نکالیں ، وہاں ہماری شاعری کی یک رخی تصویر پیش کر کے یہ غلط فہمی بھی پھیلا دی کہ ہمارے قدیم شاعروں کے دیوان جھوٹ کے پوٹ اور تصنع کے دفتر ہیں ۔ سچی شاعری اور فطرت کی مصوری سے ان کو

۱۔ اس بحث کے لیے ''ہماری شاعری'' کا آٹھواں ایڈیشن حوالے کے لیے سامنے رکھا گیا ہے ، اس لیے کہ اس ایڈیشن تک انھوں نے تھوڑے بہت اضافے کیے ہیں ۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ختم کر دیا ۔

کچھ لگاؤ نہیں . . . حالی کی بے لوث شخصیت کا وقار اور ان کی نیت کے خلوص کا اعتبار قائم ہو ہی چکا تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا مقدمہ اور مسدس[1] پڑھ پڑھ کر بہت سے لوگ اساتذۂ سخن کی سحر کاریوں اور معجز نگاریوں کو ہذیان اور خرافات سمجھنے لگے اور قابلِ اعتراض کلام کے ساتھ مایۂ ناز کلام بھی بدظنی اور بدبینی کا شکار ہو گیا ۔ اب نئے تعلیم یافتہ طبقے کا یہ حال تھا کہ کوئی شعر کو بے کار چیز اور شاعری کو بے کاری کا مشغلہ سمجھنے لگا ، کوئی شعر اور غیر شعر میں امتیاز کرنے سے قاصر ہو گیا ۔ کوئی اُردو شاعری کو اعتراضوں کا نشانہ بنانے لگا ۔ یہی وہ حالات تھے جو اس کتاب کی تصنیف کے محرک ہوئے ۔ شعر کا صحیح ذوق ، سخن فہمی کا ملکہ اور نقدِ شعر کی قوت پیدا کرنا اور اُردو شاعری کا روشن رخ نمایاں کرکے تعلیم یافتہ طبقے کی نگاہوں میں اس کا وقار قائم کرنا اس تصنیف کے اہم مقاصد ہیں ۔''[2]

اس طویل اقتباس کے درج کرنے کا مقصد اس بات کی وضاحت کرنا ہے کہ ''ہماری شاعری'' حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کے جواب میں لکھی گئی اور وہ غلط فہمی جو مولانا حالی نے اُردو شاعری کے بارے میں پھیلائی اسے دور کرنے کی کوشش کی گئی ۔ اُردو شاعری خاص طور پر غزل پر جو اعتراضات مولانا حالی نے کیے ''ہماری شاعری'' میں ان کا جواب نہایت مدلل طریق سے دیا گیا اور یوں مسعود حسن رضوی نے غزل کا دفاع کیا ۔ اس سلسلے میں خود ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب ''غزل اور مطالعۂ غزل'' کے بارے میں ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں :

''جب اُردو غزل پر ہر طرف سے اعتراضوں کی بوچھار ہو رہی تھی تو سب سے پہلے میں نے ''ہماری شاعری'' لکھ کر اس طوفان کو روکا تھا اور غزل فہمی کے لیے زمین ہموار کی تھی ۔ اب آپ نے یہ کتاب لکھ

۱۔ مسعود حسن رضوی نے 'مسدس' سے بھی حالی کی اُردو شاعری کی مذمت کی مثالیں دی ہیں ۔

۲۔ ہماری شاعری ، ص ۲۱—۲۳ ۔

لکھ کر اس عمارت کو بہت اونچا اُٹھا دیا جس کی داغ بیل میں نے ڈالی تھی ۔''[1]

مسعود حسن رضوی نے اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے :

''حالی کا مقدمہ اور مسدس دونوں سے صاف ظاہر ہے کہ شعر و شاعری کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر اخلاق ہے ۔ پیش نظر کتاب کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ اس کے مصنف کا نقطۂ نظر ادبی ہے . . . راقم حروف نہ اُردو شاعری کے واقعی نقائص کا منکر ہے نہ ضروری اصلاح کا مخالف ۔ مگر جس طرح اُردو شاعری کا بے عیب حصہ خواجہ حالی کی شعر و شاعری کے موضوع سے خارج تھا اسی طرح اس کا عیب دار حصہ ''ہماری شاعری'' کے موضوع سے خارج ہے ۔''[2]

اس طرح مسعود حسن رضوی نے اپنے نقطۂ نظر اور مقاصد کی وضاحت کر دی ہے اور ''ہماری شاعری'' کے مطالعے سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے اُردو شاعری کے خصائص اور خاص طور پر غزل کے مضامین پر بحث کی ہے اور دلائل سے اعتراضات کو رد کیا ہے ۔ اس کے علاوہ شعر اور اس کے متعلقات سے بھی بحث کی گئی ہے ۔

مسعود حسن رضوی نے ''ہماری شاعری'' میں زیادہ تر غزل کو ہی پیش نظر رکھا ہے ۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''کتاب کے بعض پڑھنے والوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اردو شاعری سے بحث کرتے وقت اکثر و بیشتر غزل پر نظر رکھی گئی ہے ۔ دوسرے اصنافِ سخن کا کہیں کہیں صرف سرسری طور سے ذکر کیا گیا ہے ۔ ایسا کیوں ہے ؟ اس سوال کا جواب ایک معروف اور مقبول ہم عصر ادیب (رشید احمد صدیقی) کی زبان سے سنیے ۔ فرماتے ہیں :*''غزل جتنی ہی بدنام ہے اُتنی ہی مجھے عزیز ہے ۔ شاعری کا ذکر آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہو جاتا ہے ۔

۱۔ اورینٹل کالج میگزین ، اگست ۔ نومبر ۱۹۷۹ع ۔
۲۔ ہماری شاعری ، ص ۲۶ ۔ ۲۷ ۔

"غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں ۔ ہماری تہذیب غزل
میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے ۔ دونوں کو سمت و رفتار ،
رنگ و آہنگ ، وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہے ۔" یہ بیان اُردو
شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کی اکثریت کے مذاق کی ترجمانی
کرتا ہے ۔"[۱]

مسعود حسن رضوی نے "ہماری شاعری" کی تصنیف سے جب تنقید کا آغاز کیا تو اس وقت حالی اور شبلی اس میدان میں اپنے کارنامے دکھا چکے تھے ۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن :

"اگر مقدمہ شعر و شاعری نے لکھنؤ کے دور آخر کی پرتصنع شاعری پر سخت تنقید نہ کی ہوتی تو مدتوں ہماری شاعری کی دنیا محدود رہتی ۔"[۲]

یہ بات اپنی جگہ بجا مگر ادب اور خاص طور پر شاعری کے لیے اعتدال و توازن بھی ضروری ہے ۔ یہ خصوصیت "ہماری شاعری" کے حوالے سے آتی ہے اور یوں مسعود حسن رضوی کی تنقید بھی اعتدال و توازن کے زمرے میں آتی ہے جنھوں نے نہایت سلیقے ، نرمی اور دھیمے لب و لہجے میں اُردو شاعری پر اعتراضات کا دلیلوں سے جواب دیا اور یوں وہ تصویر جو حالی کے ہاں یک رخی تھی ، ہماری شاعری میں مکمل ہوگئی ۔

"ہماری شاعری" کے دو حصے ہیں ۔ پہلا حصہ معیار اور دوسرا حصہ مسائل پر مشتمل ہے ۔ پہلے حصے میں شعر کی حقیقت و ماہیت اور شاعری کی اہمیت و افادیت واضح کی گئی ہے ۔ دوسرے حصے میں ان مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے جو شاعری کو سمجھنے کے لیے درکار ہوتے ہیں اور مثالوں سے شاعری کی قدر و قیمت کا اظہار کیا گیا ہے ۔ "ہماری شاعری" کا مقدمہ ۱۲ صفحات پر محیط ہے ۔ اس سے مسعود حسن رضوی کے نقطۂ نظر ، تنقیدی نظریات اور اسلوبِ تحریر کا پتہ چلتا ہے ۔ "ہماری شاعری" پر مضامین بھی لکھے گئے اور تبصرے بھی ہوئے ۔ اس کے علاوہ خطوں میں بھی اس کے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا ۔ ان تمام کی تفصیل یہ ہے :

۱- ہماری شاعری ، ص ۲۶ ۔
۲- آج کل ، نئی دہلی ، فروری ۱۹۷۶ع ، ص ۳۲ ۔

تبصرے (اُردو) :

زمانہ ، کانپور ، جون ۱۹۲۸ء - سرفراز ، لکھنؤ ، ۷ ستمبر ۱۹۲۸ء از حامد اللہ افسر - ادب ، لکھنؤ ، فروری ۱۹۳۰ء از اختر علی تلہری - جامعہ ، دہلی ، مارچ ۱۹۲۸ء ، ڈاکٹر عابد حسین - نیرنگ ِ خیال ، اپریل و مئی ۱۹۲۸ء ، علی عباس حسینی - نیرنگ ِ خیال ، مئی ۱۹۳۰ء ، یگانہ چنگیزی - سرفراز لکھنؤ ، ۲۷ اپریل ۱۹۲۸ء ، اختر علی تلہری - معارف اعظم گڑھ ، جنوری ۱۹۲۹ء ، سید سلیمان ندوی - صداقت کانپور ، ۱۷ جون ۱۹۲۸ء - روزنامہ ہمدرد دہلی ، ۲۷ جون ۱۹۲۸ء ، عبدالماجد دریا آبادی - حقیقت ، لکھنؤ ، ۳۱ اگست ۱۹۲۸ء -

تبصرے (انگریزی) :

The Muslim Review Calcutta : جنوری تا مارچ ۱۹۲۸ء ، محفوظ الحق -

The Leader Allahabad : ۳ فروری ۱۹۲۸ء ، منوہر لال زتشی -

The Bombay Chronicle : ۳ جون ۱۹۲۸ء ، ایم - ایچ - سید -

Modern Review Calcutta : اکتوبر ۱۹۲۸ء ، عبدالقادر -

خطوط :

صفی لکھنوی ، مرزا محمد عسکری ، یگانہ چنگیزی ، عبد الستار صدیقی ، پنڈت شبھو ناتھ سکل -

مضامین :

ہماری شاعری ایک مطالعہ ، ڈاکٹر آصف زمانی ، نیا دور ، مارچ ، اپریل ۱۹۷۷ء - ہماری شاعری پر ایک نظرثانی ، شمس الرحمٰن فاروقی - مقدمہ شعر و شاعری اور ہماری شاعری ، ڈاکٹر تنویر احمد علوی - مسعود حسن رضوی ادیب ـــ ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام -

ہماری شاعری کے پہلے حصے "معیار" میں سب سے پہلے جذبات کی اہمیت اور شعر کی افادیت پر بحث کی گئی ہے - مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں :

"جذبات جب لفظوں کا لباس پہن لیتے ہیں تو شعر کہلاتے ہیں -"[1]

۱- ہماری شاعری ، ص ۳۳ -

''شاعری بے حس قوتوں کو چولکاتی ہے ، سوئے احساس کو جگاتی ہے ، مردہ جذبات کو جلاتی ہے ، دلوں کو گرماتی ہے ، حوصلوں کو بڑھاتی ہے ، مصیبت میں تسکین دیتی ہے ، مشکل میں استقلال سکھاتی ہے ، بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارتی ہے اور گری ہوئی قوتوں کو ابھارتی ہے ۔''

یوں وہ بھی حالی کی طرح شاعری کی مقصدیت کے قائل ہیں اور شاعری کا تعلق اخلاق سے بھی جوڑتے ہیں ۔ مولانا حالی نے جس طرح لکھا ہے کہ پولیٹیکل معاملات میں شعر سے بڑے بڑے کام لیے گئے ہیں ، اسی طرح مسعود حسن رضوی بھی اس کے قائل ہیں کہ شاعری سے قوموں کی بیداری کا کام لیا جا سکتا ہے ۔ لکھتے ہیں :

''اب ضرورت ہے ایسے شاعروں کی جو خود ہنس کر دوسروں کو ہنسائیں ، جو دلیری اور جانبازی کے جذبات کو بھڑکائیں ، جو ہمدردی اور رواداری کے خیالات کو ابھاریں اور ملک میں حب وطن اور قوم پرستی کی روح پھونکیں ۔''

شعر کی ماہیت اور حقیقت پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

+''وہ کلام جس میں اثر ہو ، یعنی جس کی غرض اپنے دل کی کوئی کیفیت جیسے رنج ، خوشی ، حیرت ، جوش ، غصہ ، خوف وغیرہ دکھانا ہو یا دوسروں کے دل پر کسی طرح کا اثر ڈالنا اور ان کے جذبات کو ابھارنا ہو۔''

یہاں وہ مولانا حالی سے متفق نظر آتے ہیں کہ شعر کی تاثیر مسلّم ہے ۔ بقول مولانا حالی :

+''شعر کی تاثیر کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا ۔ سامعین میں اکثر اس سے حزن و نشاط یا جوش و افسردگی کم یا زیادہ ضرور پیدا ہوتی ہے ۔''+

اس سلسلے میں مسعود حسن رضوی شعر کی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں :

+''کامل شعر وہی ہے جس میں موزونیت بھی ہو اور اثر بھی۔''

یوں وہ شعر کے لیے دو خاصیتیں موزونیت اور اثر قرار دیتے ہیں ۔ یہاں موزونیت سے ان کی مراد وزن ہے ۔

مولانا حالی نے وزن پر بحث کرتے ہوئے اور انگریزی شاعری سے تقابل کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وزن کی شرط شعر میں نہیں بلکہ نظم میں معتبر ہونی چاہیے ۔ مسعود حسن رضوی اس فرق کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''مصرعوں کی انفرادی موزونیت اور چیز ہے اور نظم کی عمومی موزونیت اور چیز ہے ۔ مصرعے کی موزونیت یہ ہے کہ وہ کسی عروضی وزن کے مطابق ہو اور نظم کی موزونیت یہ ہے کہ اس کے مصرعوں میں باہم تناسب اور توازن ہو ۔''

اس حوالے سے مسعود حسن رضوی موزونیت کو شعر کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں ۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ موزونیت سے شعر کے حسن اور اثر میں اضافہ ہوتا ہے ، تاہم وہ اس بات کے بھی قائل نظر آتے ہیں کہ شاعرانہ خیالات کے اظہار کا فطری ذریعہ نظم ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ قافیے اور ردیف کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کرتے ۔ لکھتے ہیں :

''اگرچہ وزن کی طرح قافیے اور ردیف کو شعر کے عناصر میں شمار نہیں کر سکتے لیکن اس میں شک نہیں کہ جن چیزوں سے شاعری ساحری بن جاتی ہے ، ان میں قافیے اور ردیف کو ممتاز درجہ حاصل ہے ۔''

اپنے موقف کی وضاحت کے لیے مثالیں دے کر مسعود حسن رضوی نے قافیے اور ردیف کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور مخالفانہ باتوں کو رد کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

''وزن اور قافیے کی اصولی بحث کو چھوڑیے ، حقیقی شاعروں کے عملی تجربوں پر نظر کیجیے ۔ اکبر کی اصلاحی شاعری ، چکبست کی سیاسی شاعری ، جوش کی انقلابی شاعری اور اقبال کی فلسفیانہ شاعری میں کیسے کیسے جدید خیال کیسے کیسے حسین انداز سے ادا کیے گئے اور وزن و قافیہ اظہار خیال میں کبھی حائل نہ ہوا . . . میر انیس کے مرثیے مسدس اور مسلسل طولانی نظمیں ہیں جن کے کل بند مقفٰی اور بیشتر مردف ہیں ، لیکن احساس بھی نہیں ہوتا کہ شاعر کو اظہار خیال میں کہیں دشواری ہوئی . . . . جس طرح گزرگاہ کی تنگی دریا کی روانی میں طغیانی اور جوش و خروش پیدا کرتی ہے اسی طرح وزن ، قافیے اور ردیف کی لبدیلی شاعر کی تخیل کو رسا اور فکر کو تیز کر دیتی ہے ۔''

شعر کے لیے مسعود حسن رضوی تخیل اور الفاظ کو بھی بڑی اہمیت دیتے ہیں اور ان خصوصیتوں کو شعر کی معنوی اور لفظی خوبیاں قرار دیتے ہیں ۔ مولانا حالی نے سادگی ، اصلیت اور جوش کو شعر کی خوبیاں قرار دیا تھا ۔ مسعود حسن رضوی اصلیت ، سادگی ، بلندی ، تڑپ اور باریکی کو شعر کی معنوی خوبیاں قرار دیتے ہیں ۔ انھوں نے شعر کی لفظی خوبیاں الگ بیان کرتے ہوئے سادگی ، اختصار ، زور ، مناسبتِ الفاظ اور جدت پر بحث کی ہے ۔ شعر کی لفظی و معنوی خوبیوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ سادگی ، بلندی ، باریکی ، اختصار ، زور، مناسبتِ الفاظ اور جدت کے فرق کے لیے بھی مثالیں دی گئی ہیں ۔ یہاں یہ بات البتہ کہی جا سکتی ہے کہ مسعود حسن رضوی نے کافی سوچ بچار کے بعد شعروں کا انتخاب کیا ہے ۔

مسعود حسن رضوی نے شعر میں صنعتوں کے استعمال پر زور دیا ہے ۔ اس کے ساتھ صنائع کو احتیاط سے استعمال کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

> ”صنعتیں بذاتِ خود کلام کا مقصد نہیں ہیں ۔ ان کے استعمال کی غرض کلام کی تزئین ہے ، اس لیے ان کے استعمال میں اتنی باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ صنعت سے کلام میں حقیقتاً کوئی حسن پیدا ہو ۔ فصاحت کے شرائط اور بلاغت کے لوازم میں فرق نہ پڑے ، تکلف اور تصنع ظاہر نہ ہو ۔ ذہن کسی غیر متعلق یا خلافِ محل مفہوم کی طرف منتقل نہ ہونے پائے اور صنعت اتنی نمایاں نہ ہو جائے کہ ذہن کو معنی سے ہٹا کر اپنی طرف کھینچ لے ۔“

یوں شعر کے بارے میں بحث کرتے ہوئے طویل مگر با معنی ، پُر مغز اور صاف ستھری گفتگو کی ہے اور اپنے مؤقف کو سمجھانے کے لیے مثالوں سے کام لیا ہے اور دلائل دیے ہیں ۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ادق باتوں کو نہایت ہی آسان اور سادہ زبان میں ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے ۔

”ہماری شاعری“ کا دوسرا حصہ ”مسائل“ پر مبنی ہے ۔ شاعری کی وسعت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے غزل کے ساتھ مرثیہ کا بھی ذکر کیا ہے اور غزل کی افادیت اور اہمیت کے ساتھ ساتھ دیگر شعری اصناف کی ضرورت سے انکار نہیں کیا ۔

مسعود حسن رضوی شعر کو مسرت کا وسیلہ گردانتے ہیں اور اسے فائدہ مند قرار دیتے ہیں ۔ گویا وہ شعر کی افادیت کے قائل ہیں ۔ لکھتے ہیں :

"جو لوگ صرف چند مضمونوں کو ہماری شاعری کی کل کائنات سمجھتے ہیں ، وہ اس غلط فہمی کے خود ہی ذمہ دار ہیں ، اور اُردو شاعری کے دائرے کو تنگ کرکے غزل میں محدود کر دیتے ہیں ۔ بے شک غزل ہی ہماری شاعری کی وہ صنف ہے جس کی خصوصیتیں ہر نگاہ کو اپنی طرف کھینچتی ہیں ۔ ہر دل میں گھر کرتی ہیں ۔ ہر زبان کو لذت دیتی ہیں اور ہر محفل کو گرماتی ہیں ۔ مقدار کے لحاظ سے بھی شاعری کی ہر صنف سے غزل کا پلہ بھاری ہے ۔ مگر رباعیاں ، قطعے ، قصیدے ، مثنویاں ، واسوخت ، سلام ، مرثیے اور مسلسل نظمیں بھی کچھ کم نہیں ہیں ۔"[1]

لیکن اس اعتراف کے باوجود انھوں نے غزل ہر ہی زیادہ زور دیا ہے اور غزل کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے ۔ غزل کے محدود عشقیہ مضامین کے بارے میں اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"غزل حقیقت میں جذبات کا مرقع ہے ۔ اس کا ہر شعر کسی انسانی جذبے کی تصویر ہے اور انسان کے جذبے اپنی لیرلگیوں میں شمار کی حد سے نکل جاتے ہیں ۔ اس لیے بے شمار مضامین غزل کے شعروں میں موجود ہیں ۔ مگر اُنھیں سمجھنے کے لیے شاعر کی زبان سمجھنا ضروری ہے ۔"[2]

مسعود حسن رضوی نے یہاں شاعرانہ اور غیر شاعرانہ انداز کو مثالوں سے واضح کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے :

"اُردو غزل عشق و محبت میں محدود نہیں ہوتی ، بلکہ گوناگوں جذبات اور رنگا رنگ خیالات کا گلدستہ ہوتی ہے ۔"[3]

۱- ہماری شاعری ، ص ۱۲۰ ۔
۲- ہماری شاعری ، ص ۱۳۲ ۔
۳- ہماری شاعری ، ص ۱۳۴ ۔

مسعود حسن رضوی غزل کو داخلی مضامین کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں اور داستانِ حسن و عشق کے بیان میں تاثراتِ غم اور حسرت کے جذبات کو ضروری گردانتے ہیں ۔ اس طرح وہ غم کو خوشی کے کہیں بہتر موضوع قرار دیتے ہیں اور اپنی بات کی حمایت میں انگریزی ، سنسکرت ، فارسی اور اُردو کی مثالیں لاتے ہیں ۔ اور بالآخر غزل کی معنوی تنگ دامنی کے وہم کا سبب شعر فہمی کی صلاحیت کے فقدان کو قرار دیتے ہیں ۔

اُردو غزل پر اس اعتراض کا کہ اس میں گل و بلبل اور اس طرح کی دوسری تمثیلوں کا سہارا لیا جاتا ہے ، جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

''غزل کا ہر شعر بجائے خود ایک مستقل نظم ہوتا ہے ۔ غزل کہنے والا انتہائی کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح ایک شعر کے چند لفظوں میں بہت سا مطلب بھر دے ۔ تمثیلی الفاظ سے اس کو بہت مدد ملتی ہے ۔ ان میں سے ایک ایک لفظ کے ساتھ بہت بہت سے خیالات و جذبات وابستہ ہو گئے ہیں ۔ ایک لفظ کہا اور نہ معلوم کتنی باتیں آنکھوں کے سامنے آ گئیں ۔ اس لیے غزل میں ان لفظوں کا استعمال نہ صرف مناسب بلکہ ناگزیر ہے ۔''۱

اس ضمن میں غالب اور دوسرے شاعروں کی مثالوں اور واقعات سے ثابت کرنے کے بعد مسعود حسن رضوی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں :

''حقیقت یہ ہے کہ شعر کا سمجھنا شعر کہنے سے کچھ کم مشکل نہیں ہے ۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں قدرت نے سخن فہمی کا ملکہ عطا کیا ہے ۔''۲

مسعود حسن رضوی نے مذاقِ سخن کی صلاحیت پر خاصا زور دیا ہے ۔ اُردو شاعری کو انگریزی تنقید کے پیمانوں پر ناپنے والوں اور اُردو شاعری کو کمتر ظاہر کرنے والوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱۔ ہماری شاعری ، ص ۵۰ - ۱۵۱ ۔
۲۔ ہماری شاعری ، ص ۱۵۸ ۔

"بعض لوگ انگریزی شاعری اور مغربی تنقید کی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں اور اُردو شاعری کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کرتے ۔ ان کے ذوق پر مغربی رنگ چڑھ جاتا ہے اور وہ مشرقی مذاقِ سخن سے بیگانہ ہو جاتے ہیں ۔ یہ لوگ اُردو شاعری میں انگریزی شاعری کا لطف ڈھونڈھتے ہیں ۔ مگر حلوہ سوہن میں چاکلیٹ کا مزا نہیں مل سکتا ۔ انگریزی شاعری کا عام موضوع ہے کائنات (نیچر) اور اس کا تعلق انسان سے ہے ۔ اُردو شاعری کا عام موضوع ہے انسان اور اس کا تعلق اپنے ابنی نوع اور خدا سے ہے ۔ دونوں کی منزلیں جدا جدا اور راستے الگ الگ ہیں ۔ پھر حالاتِ سفر کیونکر یکساں ہو سکتے ہیں ۔"[1]

یوں مسعود حسن رضوی درحقیقت اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ہر شاعری کو اس کے اپنے مجوزہ تنقیدی معیارات پر جانچنا چاہیے ، خاص طور پر اُردو شاعری کو اس کے اپنے مخصوص تہذیبی پس منظر میں رکھ کر جانچنے کی ضرورت ہے ۔

اُردو شاعری پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ شاعروں کے خیالات میں تضاد ہوتا ہے اور اکثر ان کا ایک قول دوسرے قول کا مخالف نظر آتا ہے ۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں :

"جب انسانی فطرت اپنی نیرنگیوں میں اصولِ منطق کی اس پیروی سے آزاد ہے تو شاعر کے کلام میں یک رنگی کیسی ؟"[2]

اپنے مؤقف کی حمایت میں دلائل اور شعروں کی مثالیں دے کر وہ واضح کرتے ہیں کہ شاعر کے کلام میں یک رنگی نہیں ہوتی ۔ بلکہ شاعر ہمیشہ اپنے ہی حالات کا نقشہ نہیں کھینچا کرتا ، دوسروں کے دل کا حال بھی بیان کرتا ہے ۔

اُردو شاعری میں مقامی رنگ نہیں پایا جاتا ۔ یہ وہ اعتراض ہے جو اکثر کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اُردو شاعری اس ملک میں ایک بدیسی چیز ہے اور اس میں ملکی خصوصیات نہیں پائی جاتیں ۔ مسعود حسن رضوی اس اعتراض کو یکسر رد کرتے ہیں اور لکھتے ہیں :

۱- ہماری شاعری ، ص ۱۵۹ -

۲- ہماری شاعری ، ص ۱۶۱ - ۱۶۲ -

"اُردو شاعری کا پتلا ہند کی خاک سے بنا اور اس کی نشو و نما بھی اسی سرزمین میں ہوئی ۔ اس لیے گو وہ مدتوں فارسی کے نقشِ قدم پر چلتی رہی مگر اس کی طبیعت نہیں بدلی ۔ مزاج ہندوستانی ہی رہا ۔"[۱]

کیا اُردو شاعری تقلیدی اور غیر فطری ہے ؟ اس سوال کے جواب میں مسعود حسن رضوی نے بعض باتوں کو تسلیم کیا ہے کہ اُردو شاعری میں فارسی کی تقلید کی گئی ہے ۔ شاعری ایک ڈگر پر بھی چلتی رہی مگر اس کے ساتھ نئی راہیں بھی تلاش کی گئیں ۔ شعراء کے مزاج اور طبائع میں بھی اختلاف رہا جو ان کے کلام میں ابھی موجود ہے ۔ اسی طرح کچھ شاعروں نے واقعات کے بیان اور جذبات کے اظہار میں بیش تر مبالغے سے کام لیا ہے ۔ اس اعتبار سے شاعری کے کچھ حصے کو فقط اس حد تک غیر فطری کہا جا سکتا ہے ۔ مگر شاعری کا معتدبہ حصہ ایسا ہے جو خلافِ فطرت نہیں ۔ البتہ شعر کو سمجھنے اور اس سے لطف اُٹھانے کے لیے نکاتِ زبان اور شاعرانہ اندازِ بیان سے کامل واقفیت کی ضرورت ہے ۔ اس سلسلے میں وہ مثالیں دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"لطف اُٹھانے کے لیے اہلِ زبان کا روزمرہ ، اُن کے محاورے ، مثلیں ، کنائے ، تلمیحیں ، الفاظ کے محلِ استعمال ، مترادفات کے نازک فرق ، اظہارِ جذبات کے طریقے ، فصاحت کے رمز ، بلاغت کے لکتے ـــ ان سب چیزوں کا علم ضروری ہے ۔ اگر ان چیزوں کا علم ہو جائے تو بہت سے شعر جو بے معنی ، بے اثر اور خلافِ فطرت معلوم ہوتے ہیں ، ان میں معنی بھی پیدا ہو جائیں ، اثر بھی آ جائے اور فطرت سے اختلاف بھی نہ رہے ۔"[۲]

اُردو کی عشقیہ شاعری میں محبوب کے لیے مذکر کا صیغہ استعمال ہوتا ہے ، اس پر بھی کافی اعتراضات ہوئے ہیں ۔ اس سلسلے میں مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں : "بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ اُردو کی عشقیہ شاعری میں معشوق جنسِ ذکور سے ہوتا ہے اور امرد پرستی کے جذبات نظم کیے جاتے ہیں ، اس لیے وہ خلافِ فطرت بھی ہے اور مخربِ اخلاق بھی ۔

۱۔ ہماری شاعری ، ص ۱۷٦ ۔
۲۔ ہماری شاعری ، ص ۱۹۸ ۔

لیکن ذرا آنکھیں کھول کر اُردو شاعری کے وسیع میدان کی سیر کی جائے تو حقیقت خود بول اٹھے گی کہ اس خیال کی بنا وہم یا ناواقفیت پر ہے۔ اُردو غزلوں میں ہزارہا شعر ایسے ملتے ہیں جن میں معشوق کی نسوانیت بے پردہ نظر آتی ہے، جیسے :

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

کسی کی محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کوئی حباب آیا[1]

مسعود حسن رضوی معشوق کے لئے صیغہ مذکر لانے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

+ ''ہماری تہذیب میں عورتوں کا ذکر کرنا اور نام تک لینا شرم و حیا کے خلاف ہے۔ ان کے حسن و جمال کا کھلم کھلا بیان کرنا، اُن سے علانیہ عشق و محبت کا اظہار کرنا تو بہت بڑا گناہ ہے۔''[2]

اسی طرح ایک اور توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''لفظ معشوق اور اس کے مترادف الفاظ محبوب، دوست، یار، بت، صنم، کافر وغیرہ سب مذکر ہیں۔ معشوق کے لیے ان مذکر لفظوں کے استعمال کا سبب وہی حیا پرستی اور غیرت شعاری ہے، جسے ہندوستانی اخلاق کا سنگِ بنیاد کہہ سکتے ہیں۔''[3] +

تصوف کے حوالے سے بھی مسعود حسن رضوی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غزل میں فعلوں کی تذکیر معشوق کی تذکیر کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت سی شاعرات کی مثالیں دی ہیں، جنھوں نے غزل میں ہمیشہ ضمیر متکلم کے ساتھ مذکر استعمال کیے ہیں۔ یوں بہت سے اشعار کی مثالیں دے کر وہ مولانا حالی کے ہمنوا ہیں کہ مرد کا مطلوب مرد

۱- ہماری شاعری، ص ۲۰۳ - ۲۰۴ -
۲- ہماری شاعری، ص ۲۰۷ -
۳- ہماری شاعری، ص ۲۱۰ -

نہیں ہے اور نہ ہی شاعری سے امرد پرستی کا خیال آتا ہے ۔ گویا انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو کی عشقیہ شاعری کو امرد پرستی سے کوئی لگاؤ نہیں ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری میں امرد پرستی آج بھی موجود ہے اور اس سے کسی طرح بھی چھٹکارا نہیں ہو سکتا ۔

مسعود حسن رضوی نے معشوق کی شکل و شمائل ، عاشق و رقیب اور وصل و ہجر کے موضوعات پر اعتراضات کا جواب دیا ہے ۔ ان کے خیال میں :

"یہ سب چیزیں ہمارے شاعروں کے نظریۂ محبت اور نظامِ معاشرت سے پوری مطابقت رکھتی ہیں ۔"[۱]

غزل کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا بھی مسعود حسن رضوی نے ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :

(۱) غزل بے ربط شعروں کا مجموعہ ہوتی ہے ۔

(۲) غزل کے شعروں میں مختلف اور متضاد خیالات اور جذبات کا اظہار ہوتا ہے ۔

(۳) غزل غیر فطری چیز ہے ۔

(۴) غزل کے مختلف المضامین اشعار سے دماغ کو ٹھوکریں سی لگتی ہیں ۔

(۵) غزل کے ایک ہی شعر میں کسی نفسیاتی تجربے کا مکمل اظہار ممکن نہیں ۔

ان غلط فہمیوں کا مسعود حسن رضوی نے تفصیل سے جواب دیا ہے جس کا خلاصہ کچھ یوں بنتا ہے :

(۱) اُردو میں مسلسل غزلیں بھی لکھی گئی ہیں جن کے اشعار باہم مربوط ہیں ۔

(۲) متفرق شعروں کو ایک لڑی میں گوندھ کر غزل کی صورت میں پیش کرنے سے ان کا حسن اور اثر بڑھ جاتا ہے ۔

۱- ہماری شاعری ، ص ۲۶۰ ۔

(۳) یکساں وزن کے اشعار پڑھنے سے دماغ کو آرام ملتا ہے اور یکساں وقفوں کے بعد قافیوں کے کھٹکے کلام میں موسیقیت پیدا کر دیتے ہیں۔ ردیف سے یہ موسیقیت اور بڑھ جاتی ہے۔

(۴) جب یہ معلوم ہے کہ غزل کے ایک شعر کو دوسرے شعر سے کوئی معنوی ربط نہیں ہوتا تو ہر شعر میں ایک نئے مضمون کے لیے دماغ پہلے سے تیار ہوتا ہے۔ اس کو کسی چیز سے اچانک سابقہ نہیں پڑتا جس کو ٹھوکر لگنے سے تعبیر کیا جائے۔

(۵) غزل گو بھی واقعات سے متاثر ہوتا ہے اور اس تاثر کے اظہار میں عمومیت پیدا کر دیتا ہے۔

(۶) غزل گو کے طریقۂ اظہار کی تعمیم آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیتی ہے۔

اس تناظر میں مسعود حسن رضوی نے غزل کی مدافعت میں دلائل دیے ہیں۔ اختتام پر ''ضروری گزارش'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''خاتمۂ کلام پر تعلیم یافتہ نوجوانوں سے گزارش کرنا ہے کہ تنقید کی جو قدرت ان کو انگریزی تعلیم کی بدولت حاصل ہوئی ہے، اسے اپنی شاعری کو بدنام کرنے میں صرف کرکے اپنی ناقہمی اور کج رائی کی نمائش نہ کریں۔ اپنے ادبی خزانوں کی دیکھ بھال کریں۔ ادبی دفینوں کو منظرِ عام پر لائیں۔ اپنی شاعری کی خوبیاں خود سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں۔ اس کی صحیح تنقید کرکے اسے ادبیاتِ عالم کی محفل میں اعزاز و امتیاز کی جگہ دلوائیں۔ ہاں لکیر کا فقیر ہونا ٹھیک نہیں۔ ہماری شاعری میں جو نقص ہو اسے دور کرنا، جو کمی ہو اُسے پورا کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔''[۱]

یوں دیکھا جائے تو مسعود حسن رضوی نے ''ہماری شاعری'' میں قدیم اُردو شاعری کے سرمایے اور شعراء کے کمالات کا روشن ترین رخ دکھایا ہے۔ مگر ایک خامی یہ ہے کہ یہ بھی مولانا حالی کی طرح یک رخی تصویر ہے۔

۱- ہماری شاعری، ص ۲۷۲۔

مگر چونکہ انھوں نے دیباچے میں اس کا اعتراف کر لیا ہے اس لیے اس سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے ۔ ''ہماری شاعری'' کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسن کی یہ رائے خاصی وزنی ہے جس میں وہ اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''مولانا حالی نے غزل کو ناکافی بنا دیا تھا اور اُردو شاعری کو ایک مخصوص نہج کی طرف لانے کی کوشش کی تھی ۔ مسعود صاحب نے ہماری کلاسیکی شاعری کے رموز و نکات کو بیان فرمایا اور اس انداز سے اس کی پرتیں کھولیں کہ غزل کی ایمائیت اور جامعیت روشن ہو گئی ۔ اب بھی وہ اس موضوع پر تنہا کتاب ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اُردو غزل کی ہزار شیوگی کا ایسا رمز شناس مدتوں میں پیدا ہوگا ۔''[۱]

ڈاکٹر اعجاز حسین ''ہماری شاعری'' کے بارے میں لکھتے ہیں :

''مقدمۂ شعر و شاعری میں توازن پیدا کرنے کے لیے ایک ایسی ہی کتاب کی ضرورت بہت محسوس ہو رہی تھی ۔ ''ہماری شاعری'' کا وجود بہت بروقت ہوا ۔''[۲]

اس اعتبار سے فنِ شعر سے متعلق یہ کتاب اب بھی اہم تصنیف ہے جس سے شعر گوئی ، اس کے محاسن اور غزل اور اس کے متعلقات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ۔ آسان پیرایۂ بیان فنِ شعر کے ادق مسائل اور اشعار کے ساتھ واقعات کی مثالیں اس کی گتھیاں سلجھانے میں بڑی مدد دیتا ہے ۔

نقادوں کی نظر میں :

''ہماری شاعری'' کا خاصا چرچا ہوا - اس پر تبصرے ہوئے اور مسعود حسن رضوی کی اس کاوش کو سراہا بھی گیا ۔ یہاں چند تبصروں کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ اس کتاب کی اہمیت و افادیت اور اس کا مقام و مرتبہ واضح ہو کر سامنے آ جائے ۔

۱۔ ہماری زبان ، نئی دہلی ، مسعود حسن رضوی نمبر ، ۲۲ دسمبر و یکم جنوری ۱۹۷۶ء ، ص ۲ ۔

۲۔ مختصر تاریخِ ادبِ اُردو (گیارھواں ایڈیشن) ، از ڈاکٹر اعجاز حسین ، ص ۳۹۸ ۔

ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں :

''مسعود حسن رضوی ادیب سارے قدردانانِ اُردو کے دلی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ''ہماری شاعری'' کے نام سے ایک ایسی کتاب لکھ دی ہے جسے ہم بے تکلف یورپ کے بہترین نقادوں کی تصانیف کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں ۔ اس کتاب میں شاعری کی عام ماہیت سے محققانہ بحث کی گئی ہے . . . کتاب کے اصل حصے میں مصنف نے ان اعتراضات کو ایک ایک کرکے جانچا ہے جو اُردو شاعری پر کیے جاتے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے اکثر اعتراضات شاعری کی حقیقت سے ناواقفیت اور یورپ کی کورانہ تقلید پر مبنی ہیں ۔''[۱]

اختر علی تلہری نے اس بات کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے :

''ضرورت تھی کہ ''اُردو شاعری'' کی جائز حمایت کے لیے آپ قلم اُٹھائیں اور ایک مرتبہ فیصلہ کن عنوان سے یہ بتلا دیں کہ اُردو شاعری کے خلاف جو فہرست جرائم قائم کی گئی ہے ، اس میں صداقت کہاں تک ہے ۔ چنانچہ خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اس مقصد کے لیے ''ہماری شاعری'' لکھی ۔ لکھی اور خوب لکھی ۔ پورے طور سے دادِ تحقیق دے کر لکھی ۔''[۲]

حامد اللہ افسر نے تبصرہ کرتے ہوئے داد دی اور لکھا :

''حقیقت یہ ہے کہ خواجہ حالی کے مقدمے کے بعد اس موضوع پر جس قدر کتابیں شائع ہوئیں ، ''ہماری شاعری'' ان سب سے زیادہ کامیاب تصنیف ہے ، اور کیا بلحاظِ مطالب اور کیا بلحاظِ زبان ہر حیثیت سے مقدمۂ شعر و شاعری کی ہم پلہ ہے ۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر آج خواجہ حالی زندہ ہوتے تو وہ ''ہماری شاعری'' کی دل کھول کر داد دیتے ۔''[۳]

علامہ سید سلیمان ندوی اس پر تبصرے کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱۔ جامعہ دہلی ، بابت مارچ ۱۹۲۸ع ۔

۲۔ ادب لکھنؤ ، فروری ۱۸۳۰ع ۔

۳۔ سرفراز لکھنؤ ، ۵ ستمبر ۱۹۲۸ع ۔

"مصنف نے جس تفصیل ، جس خوبی ، جس شگفتگی ، جس خوش اسلوبی اور جن مختلف پہلوؤں سے ہماری شاعری پر نظر ڈالی ہے اور جس طرح نگاہوں سے اوجھل نکتوں کو منظرِ عام پر لائے ہیں ، وہ حد درجہ تحسین و داد کا مستحق ہے ۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اردو شاعری کی تنقید و تبصرہ پر مقدمہ' حالی کے بعد ہماری زبان میں یہ دوسری تصنیف ہے ۔"۱

یاس یگانہ چنگیزی نے رائے دیتے ہوئے لکھا :

"یہ تو وہ تصنیف ہے جو یورپ زدہ اصحاب کی غلامانہ ذہنیت میں انقلاب پیدا کرنے کی زبردست طاقت رکھتی ہے . . . میں بہت مشکل سے کسی کی مدح کرتا ہوں مگر اس کتاب کی قدر نہ کروں تو اس سے بڑھ کر خلافِ شرافت کوئی بات نہ ہوگی ۔"۲

علی عباس حسینی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے راقم ہیں :

"انھوں نے اس مختصر سی تصنیف میں حالی کی دقیقہ سنجی ، شبلی کی وسعتِ نظر اور آزاد کی سحر نگاری ایک جگہ جمع کرکے رکھ دی ہے . . . اگر حالی ، شبلی اور آزاد زندہ ہوتے تو مصنف کو اپنی محنتوں کی کچھ داد مل سکتی ۔"۳

ڈاکٹر محمد حفیظ سید بمبئی کرانیکل کے ۳ جون ۱۹۲۸ع کے شمارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"There is no other critic of Urdu poetry whose appreciation is so original, genuine and true as Prof. S.M. Rizvi . . . . his estimation and criticism of poetry is "entirely his own" so for none of the critics has touched the points which he has so skinfully made out in vindication of the merits of Urdu poetry."

۱- معارف اعظم گڑھ ، جنوری ۱۹۲۹ع ۔
۲- نیرنگِ خیال ، مئی ۱۹۳۰ع ۔
۳- نیرنگِ خیال ، اپریل ، مئی ۱۹۲۸ع ۔

پروفیسر محفوظ الحق نے مسلم ریویو کلکتہ کے جنوری - مارچ ۱۹۲۸ء کے شمارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :

"The author conscious of his responsibility has performed his task to the best of his ability."

منوہر لال زتشی نے ہندوستان ریویو کلکتہ کے اکتوبر ۱۹۲۹ء کے شمارے میں تبصرہ کیا ۔ مگر اس سے پہلے مسعود حسن رضوی کو ایک خط[1] لکھا ۔ یہ خط ۲۵ فروری ۱۹۲۸ء کا ہے ۔ اس میں لکھتے ہیں :

"ہماری شاعری ، کل شام شروع کی تھی ، آج دوپہر کو اسے ختم کیا ۔ خیالات پاکیزہ ، اصول صحیح اور تنقید کی کسوٹی پر کسے ہوئے . . . کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مصنف نے کوئی بات بلا سوچے سمجھے لکھ دی ہے ۔ کتاب کا ہر ورق گواہ ہے کہ آپ نے بہت کچھ پڑھا ہے اور جتنا پڑھا ہے اس سے زیادہ اس کے حسن و قبح پر غور کیا ہے ۔"

اس کے بعد تبصرے میں لکھتے ہیں :

"Even those who disagree with the author will have to acknowledge the extensiveness of his reading, the soundness of hts judgement and genuineness of his culture."

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اردو میں بھی تبصرہ کیا اور انگریزی میں بھی ۔ ماڈرن ریویو کلکتہ کے اکتوبر ۱۹۲۸ء کے شمارے میں لکھتے ہیں :

"The author has done a distinct service to the oriental literature and has admiralily filled a long-felt want. The book supplements at a very appertune moment the great Hali's great Muqaddima."

عبدالستار صدیقی ۲۴ اپریل ۱۹۲۸ء کے ایک خط[2] میں لکھتے ہیں :

۱- میرے پاس موجود ہے ۔
۲- ایضاً ۔

''کتاب کا کیا کہنا ! خوب ہے اور بہت ہی خوب ۔ اردو میں ایسی ہی کتابوں کی ضرورت ہے ۔ ایک بہت ہی اُلجھے ہوئے مضمون کو اس سہل طریقے سے سلجھانا آپ ہی کا کام تھا ۔''

صفی لکھنوی نے مسعود حسن رضوی کو داد دیتے ہوئے لکھا :

''فاضل مصنف کے سحرکار بلکہ معجز نگار قلم نے فلسفیانہ خیالات و شاعرانہ جذبات کے آب و رنگ کو باہم سمو کر اس حسن سے ہماری شاعری کی صورت کشی کی ہے جس کی تعریف کے لیے مجھے الفاظ نہیں ملتے ۔''

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ''ہمدرد'' دہلی کے ۱۷ جون ۱۹۲۸ء کے شمارے میں تبصرہ کرتے ہوئے مولانا حالی اور مسعود حسن رضوی کے نقطہ نظر کے فرق کو ظاہر کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''اصلی اور بڑا فرق دونوں کتابوں میں نقطہ نظر کے اختلاف کا ہے ۔ مولانا حالی کا نقطہ نظر اخلاقی تھا اور انھوں نے اردو شاعری پر ایک واعظ (مصلح) کی حیثیت سے نظر کی اور انھوں نے وہی لکھا جو اُنھیں لکھنا چاہیے ۔ اور شاعری پر وہ اعتراضات کیے جو تقریباً ہر شاعری پر وارد ہو سکتے ہیں ۔ ہمارے مصنف ادیب کا نقطہ نظر اس کے برخلاف تمام تر ادبی ہے ۔ انھوں نے شاعری کے اس معیار کو تسلیم کرکے جو سارے عالم کی شاعری میں مسلم ہو چکا ہے ، اردو شاعری کو اس پر جانچا اور بالکل کھرا پایا ہے ۔ مولانا حالی کے مقدمے اور ان کی کتاب میں (بہ زبانِ حضرتِ اکبر) وہی فرق ہے جو یخنی کے پیالے اور شراب کے گلاس میں ہو سکتا ہے ۔''

ان تبصروں اور ناقدین کی آراء کو سامنے رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان سب کے خیال میں ''ہماری شاعری'' مقدمے کا تتمہ ہے ۔ معلوم نہیں حالی کے بعض ناقدین سے ڈرکر یا کسی مصلحت کی بنا پر واضح طور پر اس کا اعتراف نہیں کیا گیا مگر حقیقت یہ ہے کہ ''ہماری شاعری'' مقدمہ کا جواب ہے ۔ البتہ اس کا اسلوب دھوکے میں ڈال دیتا ہے ۔ درحقیقت مسعود حسن رضوی نے ایسا

۱۔ میرے پاس موجود ہے ۔

انداز اور اسلوب اختیار کیا ہے اور اس سلجھے ہوئے طریق سے اعتراضات کا جواب دیا ہے جس کی وجہ سے یہ بات بظاہر دکھائی نہیں دیتی ، بلکہ بین السطور محسوس کی جا سکتی ہے ۔ اس بات کی تصدیق مرزا محمد عسکری کے ایک طویل خط[۱] سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے ۲۲ اپریل ۱۹۲۹ع کو مسعود حسن رضوی کے نام لکھا ۔ اس میں لکھتے ہیں :

''دیباچے میں لائق مصنف نے از راہِ تہذیب و انکسار لکھا ہے کہ یہ کتاب یعنی "ہماری شاعری'' مقدمۂ شعر و شاعری کا جواب نہیں بلکہ اس کا تتمہ ہے ۔ مگر فی الحقیقت یہ اس کا جواب ہے اور نہایت معقول جواب ہے ۔''

ڈاکٹر گیان چند کے ایک مضمون کے اس اقتباس سے بھی اس خیال کو مزید تقویت پہنچتی ہے ۔ لکھتے ہیں :

''ان کا یہ اعتذار کہ ہماری شاعری ، مقدمۂ شعر و شاعری کا جواب نہیں تتمہ ہے ، محض مہذب پیرایۂ بیان ہے ۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حالی نے اردو شاعری پر جو اعتراضات کیے تھے ، مسعود حسن رضوی نے ان کے جواب دیے ہیں ۔[۲]''

بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسعود حسن رضوی نے غزل کا دفاع کیا اور خوب کیا ۔ البتہ اس میں ایک خامی رہ گئی اور وہ یہ کہ ضرورت اس امر کی بھی تھی کہ قدیم مشرقی شاعری کی کسی ایک صنف یا کسی ایک حصے پر نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی پوری شاعری کی نئی تفہیم کے پیمانے تراشنے چاہییں تھے ۔ ایک اور بات بھی اس سلسلے میں یہ ہے کہ مسعود حسن رضوی نے غزل کے متعلقات پر کافی بحث کی ہے لیکن غزل کی روح اور اس کی شعریت کو نظر انداز کیا ہے ۔ ان سب باتوں کے باوجود بحیثیتِ مجموعی ''ہماری شاعری'' فنِ شعر کے بارے میں عام طور پر اور غزل کے بارے میں خاص طور پر ایک ایسی عمدہ کتاب ہے کہ اس سے بہتر کتاب اس موضوع پر آج تک نہیں لکھی گئی ۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ تفہیمِ شعر کا ذوق پیدا

۱- میرے پاس موجود ہے ۔

۲- نیا دور، لکھنو، مسعود حسن رضوی نمبر، مارچ - اپریل ۱۹۷۷ع ، ص ۲۲ ۔

کرتی ہے اور مشرقی شاعری کو مشرقی تنقید کے سانچوں سے پرکھنے کی فکر انگیز دعوت دیتی ہے ۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنے مضمون میں بڑے پتے کی بات کہی ہے ۔ لکھتے ہیں :

''پروفیسر رضوی کی توضیحات سے اردو شاعری ، بالخصوص اردو غزل ، کی مزاج فہمی کی ایک روایت کا آغاز ہوتا ہے ۔ پروفیسر یوسف حسین خان، ڈاکٹر عبادت بریلوی ، فراق گورکھپوری اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اردو غزل کے مطالعے میں جن حقائق کی بازیافت اور قدرشناسی کی کوشش کی ہے ، اس کی پیش لوائی ''ہماری شاعری'' نے کی اور اس طرح غزل پر تنقید کا ایک نیا اسکول وجود میں آیا ۔ ''ہماری شاعری'' اپنی بہترین صورت میں مطالعۂ غزل ہے اور اس اعتبار سے یہ ایک عہد آفرین کارنامہ ہے ۔''[1]

بہرکیف ہماری شاعری کے بارے میں جو اندازہ مولوی عبدالحق نے لگایا تھا وہ غلط ثابت ہوا اور ہماری شاعری کو مقبولیت حاصل ہوئی ۔

شاعری پر متفرق مضامین :

مسعود حسن رضوی نے شاعری اور اس کے مسائل پر جو مضامین لکھے ان میں سے کئی ایک ''ہماری شاعری'' میں شامل ہیں ۔ اس سلسلے کے دوسرے متفرق مضامین کی تفصیل یہ ہے :

(۱) اردو شاعری کا زریں عہد	علی گڑھ میگزین ، سالنامہ دسمبر ۱۹۳۲ع
(۲) حکمت اور شاعری	جہانگیر نظام نمبر ، اکتوبر ۱۹۳۳ع
(۳) صنف غزل پر ایک تحقیقی نظر	نگار، فروری۔ مارچ ۱۹۳۶ع
(۴) حضرت جگر مراد آبادی کے سوگ میں	ہماری زبان ، ۲۲ دسمبر ۱۹۶۰ع

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب ــ ذات و صفات ؛ مرتبہ مالک رام ، ص ۲۲۹ ۔

(۵) علامہ کیفی اور صنفِ غزل — ہماری زبان ، ۱۵ ۔ اگست ۱۹۶۸ء

(۶) شاعری کا مستقبل (مباحثہ) — قومی آواز ، لکھنؤ

ان مضامین میں بھی مسعود حسن رضوی نے غزل کا ہی دفاع کیا ہے ۔ ''صنفِ غزل پر ایک تحقیقی نظر'' میں تقریباً وہی خیالات پیش کیے گئے ہیں جو ''ہماری شاعری'' میں موجود ہیں ۔ مضمون کے آخر میں مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں :

''میں غزل کی خوبیوں کا دل سے قائل ہوں ، مگر نہ غزل گویوں پر ایسا فریفتہ ہوں کہ شاعر اور متشاعر میں امتیاز نہ کر سکوں ۔ نہ غزل کا ایسا شیفتہ ہوں کہ مسلسل نظموں سے لطف اندوز نہ ہوسکوں ۔ اردو شاعری میں جو نئے نئے تجربے کیے جا رہے ہیں ، ان میں سے بعض چیزوں کو انفرادی طور پر غلط یا مضر سمجھنے کے باوجود مجموعی طور سے ان کو اردو شاعری کی حیات کے آثار اور ترقی کے اسباب سمجھ کر ان کی قدر کرتا ہوں ۔ مگر ہمارے وہ شاعر جو قدیم اصنافِ سخن میں دادِ سخنوری دے چکے ہیں اور کمالِ شاعری صرف کر چکے ہیں ، ان کے کارناموں کو غلط فہمی کی بدولت مٹتے نہیں دیکھ سکتا اور شاعری کا جو سرمایہ ہماری زبان نے دو تین صدیوں کی طویل مدت میں جمع کیا ہے ، اس کو سطح بینی کے ہاتھوں لٹتے نہیں دیکھ سکتا ۔''[1]

اس اقتباس کو ''فن و شخصیت'' بمبئی نے غزل نمبر[2] میں نقل کیا ہے ۔

آخری جملوں سے غزل کی طرفداری یقینی طور پر ظاہر ہو رہی ہے ۔

مسعود حسن رضوی نے جگر مراد آبادی کے انتقال پر جو پیغام شائع کرایا اس میں بھی غزل کے حوالے سے گفتگو کی ۔ لکھتے ہیں :

۱۔ نگار ، فروری ۔ مارچ ۱۹۳۶ء ۔

۲۔ فن و شخصیت ، بمبئی ، غزل نمبر ، مارچ ۱۹۷۸ء ، ص ۳۴ ۔

''اردو شاعری پر ایک ایسا وقت آ پڑا تھا جب مغربی تنقید کی آندھی غزل کا چراغ گل کرنے پر تُل گئی تھی ۔ اس پُر آشوب دور میں حضرت جگر کے سے شاعروں نے اس چراغ کی لو اتنی تیز کر دی کہ مخالف ہوائیں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں . . . معلوم نہیں اردو کو ایسا غزل گو پھر کبھی ملے گا یا نہیں ۔''[1]

اسی طرح ''شاعری کا مستقبل'' کے موضوع پر ایک مباحثے میں ، جو لکھنؤ ریڈیو سے نشر ہوا اور بعد میں قومی آواز لکھنؤ میں شائع ہوا (جس کے شرکاء مسعود حسن رضوی ، احتشام حسین اور صدیق حسن تھے) ، مسعود حسن رضوی نے قدیم شاعری کی حمایت کی ۔ خاص طور پر زبان پر زور دیتے ہوئے کہا :

''آج کے شعراء اور خاص کر غزل گو شعراء کے خیالات قدیم شعراء کے مقابلے میں زیادہ کھرے اور سنجیدہ ہوتے ہیں ۔ موضوعات کا انتخاب بھی خیال افروز ہوتا ہے ۔ لیکن وہ اثر پیدا کرنے کا گر نہیں جانتے ۔ کیونکہ وہ زبان کا مطالعہ اس طرح نہیں کرتے جس طرح قدما کرتے تھے ۔''[2]

یوں اپنے متفرق مضامین میں بھی انھوں نے اردو شاعری ، خاص طور پر غزل ، کے معاملے میں مدافعانہ رویہ اختیار کیے رکھا اور یہ ان کی اپنے نظریات پر ثابت قدمی کی دلیل روشن ہے ۔

آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ :

شاعری کے بعد آزاد اورخاص طور پر ''آبِ حیات'' دوسرا موضوع ہے جس کی مسعود حسن رضوی نے حمایت کی ۔ آب حیات پر جو اعتراضات کیے گئے ، ان کے جواب پر مبنی ایک کتاب ''آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ'' کے نام سے لکھی جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۳ء اور حک و اضافے کے ساتھ دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ۔ اس وقت کتاب کا دوسرا ایڈیشن پیشِ نظر ہے ۔

اس مختصر کتاب میں مسعود حسن رضوی نے مستند ماخذوں کے حوالے

۱- ہماری زبان ، ۲۲ ستمبر ۱۹۶۱ء ، ص ۲ ۔

۲- میرے پاس موجود ہے ۔

نے یہ ثابت کیا ہے کہ بیشتر اعتراضات معترضین کی کوتاہ نظری اور عدم تحقیق کا نتیجہ ہیں ۔ اس سلسلے میں ''فیض میر'' کے دیباچے میں بھی اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''آزاد کے خلاف جو بدظنی پھیل رہی ہے اور پھیلائی جا رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں آبِ حیات میں کسی ایسی چیز کا ذکر دیکھا جو ہماری دسترس سے دور یا ہمارے علم سے باہر ہے اس کو آزاد کا گھڑا ہوا افسانہ سمجھ لیا ۔ آزاد کی تحقیق میں غلطیاں ممکن ہیں اور کسی تحقیق کو غلطیوں سے مفر نہیں ، لیکن جو لوگ تحقیق کی غلطی اور افسانے کی تصنیف کا فرق سمجھتے ہیں ، ان کی نظر میں آزاد محقق ہی ٹھہرتے ہیں ۔''[1]

''آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ'' کا سببِ تالیف بتانے سے پہلے انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ آزاد کی تحقیق میں غلطیاں بھی ممکن ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

''حضرت آزاد کے یہاں بھی غلطیاں ہیں ، مگر وہ غلطیاں بھی ایسی ہیں جیسی ایک محقق ہی سے ہو سکتی ہیں اور جن کی بنا تحقیق ہی پر ہے ۔ تحقیق میں غلطی ہو جانا اور چیز ہے اور بلا تحقیق کچھ لکھ مارنا اور چیز ہے ۔ ان ناگزیر غلطیوں کی بنا پر کسی کتاب کو کلیتہً پایہٴ اعتبار سے ساقط کر دینا اور اس کے مصنف کی عرق ریزیوں اور جان فشانیوں پر پانی پھیر دینا بے دردی بھی ہے اور جہالت بھی ۔''[2]

کتاب کا سببِ تالیف بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :

''بعض ذی علم اور نام برآوردہ بزرگوں کی غیر تحقیقی تحریروں اور غیر محتاط رویوں سے متاثر ہو کر ایسے ایسے نوخیز لکھنے والے ، جو علمی استعداد اور معلومات کی وسعت کے اعتبار سے آزاد کی خاک پا کو بھی نہیں پہنچتے ، اس محققِ علام کے منہ آنے لگے اور اس پر اعتراض

۱- فیض میر ، مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب ، ص ۳ - ۴۔
۲- آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ ، ص ۲۲ - ۲۳ ۔

کر کر کے گویا چاند پر خاک ڈالنے لگے ۔ ان سب اعتراضوں کا جائزہ لیا جائے تو آبِ حیات سے کہیں زیادہ ضخیم کتاب تیار ہو جائے ۔ اس لیے آئیے مثال کے طور پر چند اعتراضوں کو لیں اور دیکھیں کہ آزاد کے جن بیانوں سے وہ متعلق ہیں وہ تحقیق پر مبنی ہیں یا نہیں ۔"[1]

چنانچہ آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ میں صرف ان موضوعات یا مندرجات کو لیا گیا ہے جن پر اعتراضات کیے گئے ہیں ۔ مثال کے طور پر ولی اردو کا پہلا شاعر ، مرزا مظہر کی حسن پرستی ، میر کے والد کا نام ، سید انشا کا جنون ، ذوق اور غالب ، ذوق اور ظفر ، ناسخ کے تین دیوان ، ناسخ کی قصیدہ گوئی ، ناسخ کی ایک مثنوی ، ناسخ کا مذہب ۔ یہ صفحہ ۲۳ سے صفحہ ۹۷ تک پھیلے ہوئے ہیں ۔ مسعود حسن رضوی نے مستند حوالوں سے ان اعتراضات کو غلط ثابت کیا ہے ۔ اس کے بعد "مولوی شیرانی[2] کے اعتراضات" کے عنوان میں ان کے عائد کردہ اعتراضات ، میر کی نازک مزاجی اور بے دماغی ، میر اور خانِ آرزو ، آزاد کے قیاسی طوطے مینا اور تذکرہ خاکسار کا نام وغیرہ کے مدلل جوابات دیے ہیں ۔ یہ بحث صفحہ ۹۷ سے صفحہ ۱۴۰ تک محیط ہے ۔ بہرکیف مولانا شیرانی کے اعتراضات کو مسعود حسن رضوی نے رد کرتے ہوئے لکھا ہے :

"ایک قاسم کے تذکرے مجموعۂ نغز کے منظرِ عام پر آ جانے سے آزاد کے کتنے بیانوں کی تصدیق ہو گئی ہے ۔"[3]

حافظ محمود شیرانی کو بھی یہی شکایت تھی کہ آزاد نے تحقیق سے کام نہ لے کر روایات کا سہارا لیا ہے ، مگر جب انھوں نے قاسم کے تذکرے مجموعۂ نغز کو مرتب کیا تو اُنھیں بھی اعتراف کرنا پڑا کہ آزاد نے بیشتر معلومات اسی تذکرے سے حاصل کی ہیں ۔ مسعود حسن رضوی نے تحقیقی حوالوں سے اعتراضات کے مدلل جواب دیے ہیں ۔ اس سلسلے میں مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنؤی کو ۱۶ نومبر ۱۹۵۲ع کے ایک خط[4] میں لکھتے ہیں :

۱۔ آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ ، ص ۲۳ ۔
۲۔ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی ۔
۳۔ آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ ، ۱۳۱ ۔
۴۔ میرے پاس موجود ہے ۔

"آبِ حیات پر جو مقالہ میں نے لکھا ہے ، اس میں اس کتاب کی اہمیت پر بحث کی ہے اور جو اعتراضات ان پر وارد کیے گئے ہیں ، ان کو مستند ماخذوں کے حوالوں سے رد کیا ہے ۔"

اسی طرح مولانا فاضل لکھنوی کو ۳۰ جنوری ۱۹۵۳ع کے ایک خط[1] میں لکھتے ہیں :

"یہ کتاب کاہے کو ہے ، ایک چھوٹا سا کتابچہ ہے ۔ اُمید ہے اس کے مطالعے سے آبِ حیات کا درجہ اور مصنفِ آبِ حیات کا پایہ متعین کرنے میں مدد ملے گی ۔ آپ نے اس کتابچے کی تکمیل کو بڑا کام قرار دیا ہے ، مگر حقیقت میں ایسا نہیں ۔ اگرچہ یہ ایک مدت کے مطالعے کا نتیجہ ہے ، پھر بھی کوئی بڑا کام نہیں سمجھا جا سکتا ۔ ہاں اگر اس سے ایک عظیم تصنیف کی تحقیر اور اس کے مصنف ، اردو کے محسن اعظم کے ساتھ ناانصافی کا سدِباب ہو جائے تو اپنے نتیجے کے اعتبار سے اس کو شاید بڑا کام کہا جا سکے ۔"

اسی طرح ڈاکٹر صفدر آہ کو ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ع کے ایک خط[2] میں لکھتے ہیں :

"میر کے بارے میں آزاد کی مفروضہ غلط بیانیوں کی تردید میری کتاب "آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ" میں کر دی گئی ہے ۔"

مسعود حسن رضوی کو آزاد سے ایک طرح اندھی عقیدت تھی اور انھوں نے ہر طرح سے آزاد کی حمایت کی ہے ۔ بقول ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی :

"آبِ حیات کے بعض نکتہ چینوں کی کوشش اس پر مرکوز تھی کہ اس تذکرے کو غیر مستند ثابت کریں ۔ مسعود صاحب نے آزاد کی مدافعت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی ۔"[3]

۱- میرے پاس موجود ہے ۔
۲- ایضاً ۔
۳- ماہنامہ آج کل ، نئی دہلی ، فروری ۱۹۷۶ع ، ص ۲۲ ۔

آزاد کی طرح مسعود حسن رضوی کی اس کتاب کے بارے میں بھی مخالفانہ رویہ اختیار کیا گیا ۔ ایم ۔ کے ۔ فاطمی نے ''آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ'' پر کڑی تنقید کی ۔ اس کا تفصیلی ذکر ادیب کے ادبی معرکے میں ہوگا ۔ اس کے برعکس بہت سے لوگوں نے اس کتاب کو سراہا اور مسعود حسن رضوی کو داد دی ۔ مظفر علی سید نے اسے تنقید کی بجائے تحقیق کی کتاب قرار دیا اور اس کے بارے میں رائے دیتے ہوئے لکھا :

''اس کتاب میں انہوں نے نہ صرف سطحی اعتراض کرنے والوں کو سنجیدگی سے جواب دیے ہیں ، بلکہ آبِ حیات اور اس کے مصنف کو اردو تحقیق کی تاریخ میں پہلی مرتبہ خراجِ تحسین ادا کیا ہے جو ہم پر کوئی اسی سال سے قرض تھا ۔ . . . جو بے انصافی اس کام کے حق میں صفیر بلگرامی ، مولوی عبدالحی مصنف گلِ رعنا ، فرحت اللہ بیگ ، حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کے ہاتھوں ہوئی تھی ، اس کتاب نے بڑی حد تک اس کی تلافی کردی ۔''[1]

ڈاکٹر صفدر آہ رقم طراز ہیں :

''یہ کتاب توازن ، تحقیق اور صفائی استدلال کا نادر نمونہ ہے ۔ اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں لیکن ابھی تک کسی مخالفِ آزاد کو یہ ہمت نہ ہو سکی کہ اس کی ایک دلیل کو بھی رد کر سکے ۔''[2]

اس تناظر میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسعود حسن رضوی نے تلاش و تحقیق ، دلائل اور مستند حوالوں سے آزاد پر لگائے گئے اعتراضات کو رد کیا ہے ۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ''آبِ حیات کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے سید سجاد نے جو کتاب مرتب کی اس میں اس ساری کتاب کو بغیر اعتراف کے شامل کر دیا ۔ اس بات کی نشاندہی پاکستان ٹائمز میں عظمت انصاری نے تبصرہ کرتے ہوئے کی ۔ وہ لکھتے ہیں :

۱۔ نقوش ، اگست ۱۹۶۰ع ، ص ۲۳۹ ۔

۲۔ ماہنامہ کتاب لکھنؤ ، دسمبر ۱۹۶۸ع ۔

"Moreover Masood Hassan Rizvi's Aab-i-Hayat Ka Tanqidi Mutala'a has been included by the Editor, without anywhere acknowledging the fact that it is a separate entity and has been published as a book."[1]

بہر طور اس چھوٹی سی کتاب سے آزاد کے ساتھ بے انصافی کا کسی حد تک ازالہ ہو گیا اور آزاد کے معترضین کو بھی آزاد کے بیانوں کی صداقت کو تسلیم کرنا پڑا ۔ البتہ مسعود حسن رضوی کے سلسلے میں ایک بات یہ ہے کہ کہیں کہیں انھوں نے آزاد کی بے جا حمایت بھی کی ہے ۔ خاص طور پر میر کے سلسلے میں ۔ اس لیے کہ اگرچہ مسعود حسن رضوی میر سے خاصی عقیدت رکھتے تھے مگر آزاد کی حمایت میں انھوں نے میر کے بارے میں آزاد کی بیان کردہ باتوں کو رد نہیں کیا ۔ اس اعتبار سے تحقیقی جذباتیت اس کتاب میں دکھائی دیتی ہے ۔ اس کے باوجود یہ کتاب مسعود حسن رضوی کا ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے اور مطالعۂ آزاد کے سلسلے میں خاصی اہمیت کا حامل ہے ۔

بحیثیتِ نقاد :

مسعود حسن رضوی کے ان تنقیدی کارناموں سے ، جن کا تجزیاتی مطالعہ اوپر کے صفحات میں پیش کیا گیا ہے ، یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ وہ ایک معتدل اور متوازن نقاد تھے ۔ بحیثیتِ نقاد ان کے ہاں دو چیزیں اہم ہیں ۔ ایک ان کے تنقیدی نظریات اور دوسرا ان کا مخصوص تنقیدی اسلوبِ نثر ۔ اس جائزے میں پہلے ان پہلوؤں پر گفتگو کی جائے گی ۔

تنقیدی نظریات :

مسعود حسن رضوی کی تحریروں ، انٹرویوز ، متفرق مضامین اور خاص طور پر ''ہماری شاعری'' سے ان کے تنقیدی خیالات اور نظریات کا پتہ چلتا ہے ۔ ان میں انھوں نے شعر ، اصنافِ سخن اور اسلوب کے بارے میں اپنے نظریات بیان کر دیے ہیں ۔ ان کے مطالعے سے جو باتیں سامنے آتی ہیں ، ان کا خاکہ کچھ یوں بنتا ہے ۔

۱۔ پاکستان ٹائمز لاہور ، ۶ اگست ۱۹۶۷ع ۔

مسعود حسن رضوی اُنیسویں اور بیسویں صدی دونوں کے مذاق و مزاج کے رمز شناش تھے ۔ انھوں نے قدیم شاعری کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور اس سلسلے میں فارسی ادب کے ذوق اور مطالعے نے ان کا بھرپور ساتھ دیا ۔ ترقی پسند تحریک ان کے سامنے جوان ہوئی اور اس طرح کی دوسری ادبی و نیم ادبی تحریکوں کو بھی انھوں نے دیکھا ، مگر کسی سے نہ تو وابستگی اختیار کی اور نہ ہی اثر قبول کیا ۔ ان کے اپنے ذاتی نظریات تھے جن میں اردو ادب کا ماضی اور حال دیکھا جا سکتا ہے ۔ ان کا قول ہے :

"بڑا ادیب وہی ہے جو ہر طرح کے مطالب سادہ زبان میں ادا کر سکتا ہو ۔"

وہ ادیب کے لیے علومِ ادبیہ کی تحصیل کو ضروری قرار دیتے ہیں ۔ ان کے بقول :

"کوئی شخص کسی زبان کا کامل ادیب نہیں قرار دیا جا سکتا جب تک کہ اس نے صرف و نحو ، معنی ، بیان ، بدیع ، عروض ، لغت ، لسانیات ، صوتیات ، تنقید کے اصول ، ادب کی تاریخ اور ادیبوں و شاعروں کے حالات کا علم باقاعدہ حاصل نہ کیا ہو ، اور اس زبان کے ادب اور شعر کا مدت تک گہرا اور وسیع مطالعہ نہ کیا ہو ۔ یہ سچ ہے کہ بعض لوگ ان علوم سے واقف ہوئے بغیر اچھے اچھے مضامین لکھ لیتے ہیں مگر ایسے لوگوں کو خوش تحریر یا زیادہ سے زیادہ انشا پرداز کہہ سکتے ہیں ، ادیب نہیں کہہ سکتے ۔ وہ عبارت کے حسن و قبح وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتے ۔ وہ غلط اور صحیح ، فصیح اور غیر فصیح کا فیصلہ دلیلوں کے ساتھ نہیں کر سکتے ۔ اور صاف تو یہ ہے کہ وہ نہ بالکل صحیح زبان بول سکتے ہیں نہ بالکل صحیح عبارت لکھ سکتے ہیں ۔ ان کی زبان پر غلط الفاظ ضرور جاری ہوتے ہیں اور ان کے قلم سے غلط محاورے، فقرے اور جملے ضرور نکلتے ہیں ۔"[۱]

اس طویل اقتباس کے دینے کا مقصد یہی تھا کہ ادیب کے بارے میں ان

۱۔ اردو زبان اور اس کا رسمِ خط ، ص ۳۶ - ۳۷ ۔

کے نظریات سامنے آ جائیں ۔ وہ زبان و بیان کی قدرت کو اہمیت دیتے ہیں اور صحیح اردو لکھنے پر زور دیتے ہیں ۔

"ہماری شاعری" میں شعر اور مختلف اصنافِ سخن کے بارے میں ان کے نظریات سامنے آتے ہیں ۔ شعر کے بارے میں ان کا نظریہ یہ ہے : موزوں اور بااثر کلام کو وہ شعر کہتے ہیں ۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

"اگر کوئی کلام موزوں ہو ، مگر اس میں اثر نہ ہو تو وہ صورت میں شعر سے مشابہ ہوگا ، حقیقت میں شعر نہ ہوگا ۔ کیونکہ شعر کے لیے اثر لازمی ہے ۔ اسی طرح اگر کسی کلام میں اثر ہو ، مگر وہ موزوں نہ ہو تو وہ شاعرانہ کلام تو ہوگا مگر شعر نہ ہوگا ۔ کیونکہ شعر کے لیے موزونیت ضروری ہے ۔"[1]

غزل کے بارے میں ان کا نظریہ یہ ہے :

"غزل حقیقت میں جذبات کا مرقع ہے ۔ اس کا ہر شعر کسی انسانی جذبے کی تصویر ہے اور انسان کے جذبات اپنی نیرنگیوں میں شمار کی حد سے نکل جاتے ہیں ، اس لیے بے شمار مضامین غزل کے شعروں میں موجود ہیں ۔"[2]

اس طرح سب سے پہلے مسعود حسن رضوی نے غزل کے صحیح معنی کی طرف متوجہ کیا کہ اس سے مراد عورتوں کے بارے میں باتیں کرنے کے ہیں ۔

صنفِ مرثیہ کے بارے میں ان کا نظریہ ہے :

"مرثیہ سچی شاعری کی آخری حد ہے ۔ اس کو جذبات کی اصلیت اور بیان کی سلاست کی بدولت درد و اثر کا ایک طلسم ہونا چاہیے ۔"[3]

تنقید کے بارے میں انھوں نے کئی جگہ اپنے خیالات و نظریات کا اظہار کیا ہے ۔ وہ ہر ادب کو اس کے مخصوص تہذیبی پس منظر میں میں رکھ کر

۱- ہماری شاعری ، ص ۴۳ ۔
۲- ایضاً ، ص ۱۳۲ ۔
۳- نیرنگ رامپور ، جولائی ۱۹۲۹ع ، ص ۳۰ ۔

جانچنے کے قائل ہیں ۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اردو شاعری کو انگریزی شاعری کی تنقید کے معیار پر جانچنا مناسب نہیں ، کیونکہ اس سے قباحتیں پیدا ہوتی ہیں ۔ اس طرح وہ مشرقی تنقید کے حامی دکھائی دیتے ہیں ۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ مغربی تنقید کی اہمیت و افادیت کے بھی قائل ہیں ۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

''مغرب سے آئی ہوئی جدید تنقید میں بہت سی خوبیاں ہیں ۔ وہ ادب کو تاریخی ، معاشی ، سماجی اور سیاسی پس منظر میں دیکھنا اور ادیب اور شاعر کے خیالات کی بنیادوں کا پتہ لگانا چاہتی ہے ۔ وہ کسی شاعر کے کلام یا کسی عہد کی شاعری کا مجموعی حیثیت اور مقصدی نقطۂ نظر سے جائزہ لینا اور کسی مخصوص نظامِ زندگی کے ماتحت اس کی قدر و قیمت کا تعین کرنا چاہتی ہے ۔ لیکن وہ اپنے مقصد کے لیے جذبات سے زیادہ خیالات کو ، تاثرات سے زیادہ افکار کو اور ہیئت سے زیادہ مواد کو پیشِ نظر رکھتی ہے ۔ یہ طریقۂ کار ادب کی دوسری صنفوں کے لیے مناسب ہے تو شاعری کے لیے نہیں ہے ۔ شاعری کی بعض صنفوں کے لیے اگر مناسب ہے تو غزل کے لیے نہیں ہے ۔ جدید غزل کے لیے اگر مناسب ہے تو قدیم غزل کے لیے نہیں ہے ۔''[1]

اس طرح مسعود حسن رضوی نے مشرقی اور مغربی تنقید کے بنیادی فرق کو واضح کر دیا ہے ۔ وہ تنقید میں جذبات ، تاثرات اور ہیئت کو خیالات ، افکار اور مواد پر فوقیت دیتے ہیں ۔ اپنے اس نظریے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

''ہماری قدیم شاعری دل کی آواز اور جذبات کی زبان ہے ۔ اس آواز کو سننا اور اس زبان کو سمجھنا ہو تو اپنے دل ٹٹولنا ہوں گے ۔ اپنے جذبات کا جائزہ لینا ہوگا ۔ اپنی پسند اور ناپسندیدگی کا نفسیاتی تجزیہ کرنا ہوگا ۔ شاید کوئی کہے کہ یہ طریق کار داخلی اور تاثراتی ہے اور تنقید کو تاثراتی نہیں اصولی ہونا چاہیے ۔ بے شک ادب کی دوسری صنفوں کی حد تک یہ بات صحیح ہے لیکن شاعر بالخصوص غزل گو شاعر کا نقطۂ نظر تاثراتی ، اندازِ فکر تاثراتی اور اسلوبِ بیان تاثراتی

۱۔ ہماری شاعری ، ص ۱۹ ۔

ہوتا ہے ، اس لیے جو طرزِ تنقید داخلیت اور تاثریت سے دامن بچائے گا ،
وہ س کی شاعری کی روح تک نہ پہنچ سکے گا ۔''۱

یوں مسعود حسن رضوی غزل کے لیے تاثراتی تنقید کے قائل ہیں ۔ ''ہماری شاعری'' میں بھی انھوں نے تاثراتی تنقید سے کام لیا ہے ۔

مسعود حسن رضوی جدید تنقید کی اہمیت کے بھی قائل ہیں مگر اس کی خامیوں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں ۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

''جدید تنقید اکثر کلام کی شعریت پر نظر نہیں کرتی ۔ اس کے فنی اور جمالی پہلو کو کوئی اہمیت نہیں دیتی اور شاعر جو کچھ کرنا چاہتا تھا اس کو نظر انداز کرکے اس چیز کو تلاش کرتی ہے جو نقاد کی رائے میں شاعر کو کرنا چاہیے تھی ۔ اس طرح ہمارے عظیم شعری کارنامے بھی بے وقعت معلوم ہونے لگتے ہیں . . . نئی تنقید ہیئت کی اہمیت کو اصولی طور پر تو تسلیم کرتی ہے لیکن جب عمل کے میدان میں اُترتی ہے تو بیشتر صرف مواد کو پیشِ نظر رکھتی ہے ۔ وہ ہیئت کی اچھائی برائی کو نہ پورے طور پر محسوس کرتی ہے ، نہ اس کا تجزیہ کر سکتی ہے ۔ اس کے پاس بیان کا وہ اسلوب بھی نہیں ہے جو اس تجزیے کو دل نشین انداز میں پیش کر سکے ۔ اس نے تنقید کے اصول بھی مغرب سے لیے ہیں اور تنقید کی زبان بھی مغرب سے سیکھی ہے ۔ وہ ہماری شعری اور تنقیدی اصطلاحوں سے کام نہیں لیتی ۔''۲

اس تناظر میں مسعود حسن رضوی تجزیاتی اور جمالیاتی تنقید کے حامی نظر آتے ہیں اور تنقید میں بھی بیان کے حسن اور دلکشی کی اہمیت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ مشرقی معیارِ تنقید اور تنقیدی اصطلاحوں کو برتنے کے حق میں ہیں ۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسعود حسن رضوی تنقید میں جدید اصولوں کے حامی نہیں ۔ وہ ان کی اہمیت اور افادیت سے آگاہ ہیں مگر وہ جدید تنقید کے اس طریقِ کار سے اتفاق نہیں کرتے جو فنی خصوصیات کو ثانوی حیثیت دیتی ہے ۔ ایسی جدید تنقید سے مسعود حسن رضوی کی مراد ایسی ترقی پسند تنقید ہے جو

۱۔ ہماری شاعری ، ص ۲۰ - ۲۱ ۔
۲۔ ایضاً ، ص ۱۹ - ۲۰ ۔

ادب میں مقصد کو اصل معیار سمجھتی ہے اور فنی خصوصیات کو ثانوی اور ضمنی حیثیت دیتی ہے ۔ آج جب ہم نئی تنقید کو دیکھتے ہیں تو مسعود حسن رضوی کے ان خیالات سے اتفاق کرنا پڑتا ہے ۔ مسعود حسن رضوی ادب میں عصریت کے قائل ہیں اور وہ تنقید میں مقامی عناصر کو ترجیح دیتے ہیں اور تنقید کے مقامی سانچے استعمال کرتے ہیں اور اسلوب کو خاص اہمیت دیتے ہیں ۔

نظریۂ اسلوب :

مسعود حسن رضوی تنقید میں اسلوب کی اہمیت کے بے پناہ قائل ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اسلوب پر خاصا زور دیا ہے ، اسی لیے تنقید میں ان کا اپنا مخصوص اسلوب ہے اور اس اسلوب کے بارے میں ان کا اپنا ایک مخصوص نظریہ ہے ۔ وہ سعدی ، اسٹیونسن اور آزاد کے اسلوب کو پسند کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ''ہماری شاعری'' کو ان تینوں مصنفوں کے نام معنون کیا ہے ۔ لکھنؤ ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے ایک بار یوں کہا :

''مولوی اسمعیل میرٹھی کی اردو کی پانچویں کتاب نصاب میں داخل تھی ۔ ان کا اسلوبِ تحریر اتنا پسند آیا کہ ایک ایک سبق کئی کئی دفعہ پڑھا اور ان کے نصابی سلسلے کی اور کتابیں اُسی شوق کے ساتھ پڑھ ڈالیں ۔ اس میں شک نہیں کہ میرے ادبی ذوق کی بنیاد انھی کتابوں سے پڑی ۔ آگے چل کر جب اردو کے ممتاز ادیبوں کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا تو مولانا محمد حسین آزاد کے کمالِ انشا پردازی کا سکہ دل پر بیٹھ گیا اور میں کچھ دن ان کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش کرتا رہا ۔''[1]

مسعود حسن رضوی لفظ کی اہمیت کے بڑے قائل ہیں اور لفظ کے استعمال میں خاص طور پر احتیاط کرتے ہیں ۔ لفظ کے استعمال اور اسلوبِ بیان کے بارے میں ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا :

''کچھ زمانے تک ارادی طور پر بعض انشا پردازوں کے اسلوب کی

۱۔ میری ادبی زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعات و شخصیات ، لکھنؤ ریڈیو ، نشریہ ۲ ستمبر ۱۹۶۰ع ۔

پیروی کی ، مگر رفتہ رفتہ یہ روش خود بخود ترک ہو گئی ۔ اور معلوم نہیں کن کن اثروں کے باعث لکھنے کا ایک ڈھنگ بندھ گیا ہے . . . صحیح لفظ صحیح محل پر استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور اپنے امکان بھر عربی لفظوں کی عربی جمع نہیں لاتا ۔ اضافی اور توصیفی ترکیبوں میں فارسی کی نہیں ، اردو قواعد کی پیروی کرتا ہوں ۔ ہندی لفظوں کو فارسی عربی لفظوں پر ترجیح دیتا ہوں ، مگر اس شرط کے ساتھ کہ مطلب کے اظہار میں خلل نہ پڑے اور اردو کا مزاج بگڑنے نہ پائے . . . مجھے نہ تو شوخ رنگینی پسند ہے ، نہ کھری سادگی بلکہ سادگی اور رنگینی کا ایک معتدل اور متوازن امتزاج ۔ آپ اس کو سادہ رنگینی یا رنگین سادگی کہہ سکتے ہیں ۔''۱

اسی طرح ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

''بیان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کہنے والا جو کچھ کہے سننے والا وہی سمجھے ۔ آسانی سے سمجھے اور اس کے سوا کچھ اور نہ سمجھے ۔ دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ سننے والے کو بیان میں ایسی لذت ملے کہ وہ اس کو پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنتا رہے ۔''۲

چنانچہ مسعود حسن رضوی نے خود اپنی تحریروں میں ان باتوں کا خیال رکھا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر سادہ بھی ہے اور رنگین بھی ۔ وہ الفاظ کی بازی گری سے عبارت آرائی کے بجائے ایسا اسلوب اختیار کرتے ہیں جس میں مطالب اور معانی کی سحر کاریاں بھی ہیں اور زبان کی حلاوت و شیرینی بھی ۔

اسلوبِ بیان :

مسعود حسن رضوی کی تحریریں ان کے نظریات کا عملی ثبوت پیش کرتی ہیں ۔ وہ جس طرح کی نثر کو پسند کرتے تھے اسی طرح کی نثر لکھی ہے ۔ ان کا اندازِ بیان اتنا سادہ اور شگفتہ ہے کہ بات خود بخود دل میں اُترتی چلی جاتی ہے ۔ ''ہماری شاعری'' اور ''آئینۂ سخن فہمی'' میں اس جمالیاتی اسلوب کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں ۔

۱۔ نگارشاتِ ادیب ، ص ۹ - ۱۰ ۔

۲۔ ہماری شاعری ، ص ۲۵ ۔

مسعود حسن رضوی اپنے مقصد اور مطلب کے گرد ہی رہتے ہیں اور ادھر اُدھر کی باتوں سے بات کو ٹالتے نہیں ۔ بے جا طوالت سے گریز کرتے ہوئے اصل مقصد کی طرف پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اُنھیں زبان و بیان پر یکساں قدرت حاصل ہے ۔ ان کی عبارت آرائی میں فصاحت بھی ہے اور بلاغت بھی ۔ ان کا لب و لہجہ کہیں بھی تلخ اور ترش نہیں ہوتا ۔ حتی کہ اعتراضات کا جواب بھی دھیمے لہجے میں دیتے ہیں ۔ ان کے اسلوب پر انشائی انداز غالب ہے ، مگر یہ انداز تنقید پر غالب نہیں آتا ۔ اس سے نثر میں حسن پیدا ہوتا ہے ۔ ان کے اس منفرد اسلوب کو بہت سے نقادوں نے سراہا ہے ۔ چنانچہ ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں :

"صحیح اور سادہ نثر لکھنا ادیب کی امتیازی خصوصیت ہے جو باوجود اپنی سادگی کے نہ تو بے کیف ہوتی ہے اور نہ خشک بلکہ الفاظ کی سجاوٹ اور جملوں کی ساخت سے ایک خاص روانی اور حلاوت پیدا ہوتی ہے ۔ شروع سے لے کر آخر تک آپ کا طرزِ نگارش یکساں اور ہموار ہے ۔ باوجود ثقیل اور وزنی مسائل پر گفتگو کرنے کے پڑھنے والوں کی دلچسپی برابر قائم رہتی ہے ۔"[1]

تاریخِ ادب اردو کے مصنفین مسعود حسن رضوی کی نثر نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں :

"آپ کی نثر سیدھی سادی ہوتی ہے جس میں نرم و ملائم الفاظ کے ساتھ سلاست ، روانی ، دلکشی اور دلچسپی ہوتی ہے ۔ طرزِ بیان نہایت شیریں اور ہموار ہے ۔"[2]

سید علی جواد زیدی ان کی نثر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"مسعود حسن رضوی اردو نثر کے صاحبانِ اسالیب میں سے ہیں ۔ ان کا طرزِ تحریر قدماء میں محمد حسین آزاد اور حالی دونوں سے بیک وقت

۱- مختصر تاریخِ ادبِ اردو (گیارھواں ایڈیشن) ، از ڈاکٹر اعجاز حسین ، ص ۴۹۸ ۔

۲- تاریخِ ادبِ اردو ، از ڈاکٹر نذیر احمد ۔ ڈاکٹر عباد اللہ ، ص ۱۶۱ ۔

متاثر ہے ۔ نہ تو جدید نثرِ اردو کی طرح جملوں کی ساخت تک میں مغربی تصنیفوں کی نقالی ہے اور نہ عربی اور فارسی الفاظ کی بہتات کے باعث مصنوعی گراں باری ۔ ان کا سنبھلا ہوا اندازِ بیان صاف اور شستہ اردو کا اچھا نمونہ ہے ۔ استدلال میں متانت کے علاوہ وضاحت اور منطقی زور ہے . . . ان سب پر مستزاد ادبی چاشنی ہے جو خشک بحث کو دلچسپ بنا دیتی ہے ۔ یہ طرزِ نگارش آپ کے مزاج و طبیعت کی پوری آئینہ داری کرتا ہے ۔''[۱]

ڈاکٹر شارب ردولوی ان کے اندازِ بیان کے بارے میں لکھتے ہیں :

''ان کی زبان سادہ ، سلیس اور انداز سائنٹفک ہے ۔ وہ کسی بات کے پیش کرنے میں زورِ بیان سے نہیں بلکہ شواہد سے کام لیتے ہیں ۔''[۲]

منوہر لال زتشی ، مسعود حسن رضوی کو ۲۵ جنوری ۱۹۲۸ء کے ایک خط[۳] میں لکھتے ہیں :

''اسلوبِ بیان کا کیا کہنا ، ہر سطر شاہد ہے کہ آزاد کی نواسنجیوں کا نغمہ ، لکھنے والے کے دماغ میں سمایا ہوا ہے ۔''

''ہماری شاعری'' اور ''آئینۂ سخن فہمی'' پر جتنے بھی تبصرے ہوئے مسعود حسن رضوی کے منفرد اسلوبِ نثر اور زبان و بیان کی خوبیوں کو سراہا گیا ہے ۔ یہ درست ہے کہ شروع میں ان کے ہاں آزاد کا رنگِ تحریر جھلکتا ہے اور خود انھوں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے ، مگر آہستہ آہستہ ان کا اپنا ایک ذاتی اسلوبِ نثر بنتا گیا جو تحقیق و تنقید کے حوالے سے ان سے ہی مختص ہے ۔ شاید اسی بنا پر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے :

''پروفیسر مسعود حسن رضوی کا انداز و اسلوب بھی مستقبل کا اشاریہ ہے ۔ اردو نثر کا قافلہ ان کے دکھلائے ہوئے خطوط پر چلتا رہے گا ۔''[۴]

۱۔ آپ سے ملیے ، از سید علی جواد زیدی ، ص ۸۵ - ۸۶ ۔
۲۔ جدید اردو تنقید ، از ڈاکٹر شارب ردولوی ، ص ۴۳۰ ۔
۳۔ میرے پاس موجود ہے ۔
۴۔ ماہنامہ آج کل ، نئی دہلی ، فروری ۱۹۷۶ء ، ص ۲۳ ۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ ان کا اسلوب اردو نثر کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ بقول ڈاکٹر نیر مسعود "رشید احمد صدیقی، مسعود حسن رضوی کو اُن معدودے چند لکھنے والوں میں شمار کرتے تھے جن کی نثر اردو کے بنیادی اسلوب کی نمائندگی کرتی ہے" یہ سب سے بڑا خراج ہے جو مسعود حسن رضوی کے اسلوب نثر کو پیش کیا گیا ہے۔

تنقید میں مقام و مرتبہ :

مسعود حسن رضوی کی تحریروں، اسلوبِ بیان اور تنقیدی نظریات کے اس تجزیاتی مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تنقیدی سے زیادہ تحقیقی مزاج رکھتے تھے، اس لیے ان کی تنقید کو تحقیقی تنقید کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مسعود حسن رضوی تنقید میں جزئیات نگاری کے قائل ہیں اور مسئلے کے ہر گوشے، ہر پہلو اور ہر ممکنات پر بحث کرتے ہیں۔ انھوں نے نظم و نثر دونوں کی تنقید میں متوازن اور معقول رویہ اختیار کیا ہے۔ ان کی تنقید پر مشرقی رنگ غالب ہے۔ تنقید میں وہ حالی اور شبلی سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ مغربی تنقید سے خاصی واقفیت رکھتے تھے، مگر ان کے سوچنے اور جانچنے کا انداز خالصتاً مشرقی ہے اور ان کی عملی تنقیدات میں مشرقی رنگ ہی نمایاں ہے۔ لیکن سائنٹیفک انداز کی بنا پر ان کی تنقید میں ایک سنبھلی ہوئی اور متوازن کیفیت پائی جاتی ہے۔ اویس احمد ادیب نے ان کی تنقید کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے :

"وہ اعتدال پسند نقاد ہیں اور منتہا پسندی کے خلاف ہیں۔"[۱]

مسعود حسن رضوی کے ہاں تاثراتی، جمالیاتی اور نظریاتی تنقید کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کے بقول :

"پروفیسر مسعود صاحب کی نظری تنقید کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس نکتے کو پیش کرتے ہیں، اس کی وضاحت کے لیے بہت سی مثالیں تحریر فرماتے ہیں۔ اس طرح ان کا کوئی خیال مبہم نہیں رہتا ہے۔ بلکہ ہر خیال آرسی اور آئینے سے زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ یہ خوبی ہر دور کے نقادوں کے یہاں عام طور پر نہیں پائی جاتی . . . جہاں تک

۱- ہمایوں لاہور، جنوری ۱۹۴۷ء، ص ۷۱-

مشرق الداز تنقید کا تعلق ہے ، اس میں بھی ان کے مقابل کا نہ کوئی
نقاد ہندوستان میں ہے اور نہ پاکستان میں ۔''۱

ڈاکٹر سلام سندیلوی کی اس رائے کے آخری جملے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے ، تاہم یہ ضرور ہے کہ مشرق الداز تنقید میں ان کا کوئی مقابل نہیں ۔ وہ معتدل طرز تنقید کے سب سے بڑے علمبردار ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ نئے نقاد شمس الرحمن فاروقی نے لکھا ہے :

''پرانی تنقید کے اہم ترین نقاد مسعود حسن رضوی جو اپنے وقت میں
جدید تھے اور آج بھی ان کی تحریریں بعض جدید نظریات کی پیش بینی
کرتی نظر آتی ہیں ۔''۲

یوں مسعود حسن رضوی جدید بھی ہیں اور قدیم بھی اور ان کی تنقید کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

مسعود حسن رضوی کی تنقید میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ کچھ خامیاں بھی ہیں ۔ ایک تو یہ کہ کہیں کہیں دفاع کرتے ہوئے ان کا لہجہ جذباتی ہو جاتا ہے اور وہ وکالت کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔ دوسرے وہ اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لیے بیان کو بہت زیادہ طول دیتے ہیں یا واقعات اور مثالوں کی بھرمار کر دیتے ہیں ۔ اس سے کہیں کہیں توازن نہیں رہتا ۔ لیکن یہ ایسی باتیں ہیں جنھیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور یہ خامیاں ان کی خوبیوں میں دب کر رہ گئی ہیں ۔ مسعود حسن رضوی نے جدید تنقید کی تعمیر میں خاموش مگر گہرا کام کیا ہے اور اگر وہ ''ہماری شاعری'' کے بعد کوئی اور کتاب نہ بھی لکھتے تب بھی اردو کے بڑے نقادوں میں ضرور شمار ہوتے ۔ ان کے ہاں بیک وقت تجزیاتی ، جمالیاتی ، تاثراتی اور نظریاتی تنقید کا امتزاج ملتا ہے ۔ حالانکہ اردو تنقید کے کئی اور دبستان بھی وجود میں آ چکے ہیں مگر نظریاتی تنقید پر بہت کم کام ہوا ہے اور اس لحاظ سے حالی اور شبلی کے بعد مسعود حسن رضوی کا نام لیا جا سکتا ہے ۔

☆ ☆ ☆

۱۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ (چوتھا ایڈیشن) ، از ڈاکٹر سلام سندیلوی ،
ص ۶۳۷ - ۶۳۹ ۔

۲۔ شعر ، غیر شعر اور نثر ، از شمس الرحمن فاروقی ، ص ۲۶ ۔

چوتھا باب

بحیثیتِ محقق

اُردو تحقیق میں جن لکھنے والوں نے خاصا وقیع کام کیا ہے ، ان میں سید مسعود حسن رضوی ادیب کا نام سرِ فہرست ہے ۔ مسعود حسن رضوی کا تحقیقی کام خاصا پھیلا ہوا ہے ۔ ''ہماری شاعری'' کے بعد سے وہ تحقیق کی طرف پورے طور سے راغب ہو گئے تھے بلکہ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ ان کی تنقید میں بھی تحقیق کی جھلکیاں ملتی ہیں ۔ ''ہماری شاعری'' اور ''آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ'' تحقیقی تنقید کے زمرے میں آتی ہیں ۔ مسعود حسن رضوی کے تحقیق کے موضوعات میں اُردو ڈرامہ ، واجد علی شاہ ، مرثیہ ، انیس ، غالب اور فائز دہلوی کے علاوہ ایسے ہی دیگر شاعر اور لکھنے والے شامل ہیں ۔ ان کا یہ تحقیقی کام مختلف نوعیتوں کا ہے ۔ اس میں وہ مرتبِ متن اور حاشیہ نگار کی حیثیت سے بھی سامنے آتے ہیں ۔ ڈاکٹر گیان چند[1] نے ان کے ان تحقیقی کاموں کو چار قسموں میں تقسیم کیا ہے :

(۱) وہ کام جن میں انھوں نے کسی مصنف کی پوری کتاب کو جوں کا توں پیش کیا ۔ ان میں فیضِ میر ، مجالسِ رنگین ، دیوانِ فائز ، واجد علی شاہ کا ڈرامہ ''رادھا کنھیا کا قصہ (لکھنؤ کا شاہی اسٹیج میں شامل ہے) ، الدر سبھا (لکھنؤ کا عوامی اسٹیج میں شامل ہے) ، فسانۂ عبرت ، تذکرہ گلشنِ سخن اور ناٹک بزمِ سلیمان (نقوش ۔ اگست ۱۹۶۹ع) آتے ہیں ۔

(۲) وہ کام جن میں پوری کتاب ترتیب نہیں دی گئی بلکہ کسی مصنف یا تصنیف کا انتخاب پیش کیا گیا ہے ۔ ان میں ''روحِ انیس'' ، ''شاہکارِ انیس'' اور ''متفرقاتِ غالب'' شامل ہیں ۔

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب ۔ ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۱۳۲ - ۱۳۳ ۔

(۲) جن میں کسی مصنف کی تحریروں کو کسی نئی ترتیب سے پیش کرکے ان کی نوعیت بدل دی ہے ۔ ان میں ''رزم نامۂ انیس'' اور ''تذکرۂ نادر'' شامل ہیں ۔

مسعود حسن رضوی کی تصنیفات میں ''لکھنؤ کا عوامی اسٹیج'' ، ''لکھنؤ کا شاہی اسٹیج''[1] ، ''اسلاف میر انیس'' ، ''شاعر اعظم انیس'' ، ''واجد علی شاہ'' ''نگارشات ادیب'' ''ایرانیوں کا مقدس ڈرامہ'' کے علاوہ ''شرح نظم طباطبائی'' اور ''تنقید کلام غالب'' اور بچوں کے لیے نثر کی کتاب ''دبستان اُردو'' شامل ہیں ۔ اس کے علاوہ متفرق مضامین بھی ہیں جو ان موضوعات کے علاوہ دیگر موضوعات کا بھی احاطہ کرتے ہیں ۔

مسعود حسن رضوی کے ان تحقیقی کاموں کی روشنی میں جن موضوعات پر ان کے تحقیقی کام کا جائزہ لیا جائے گا ان میں میر ، غالب ، ڈرامہ ، واجد علی شاہ ، مرثیہ ، انیس ، تذکرے ، لکھنویات اور دیگر متفرق موضوعات شامل ہیں ۔ ان کے تجزیاتی مطالعے کے بعد مسعود حسن رضوی کے محققانہ اسلوب اور طریق کار اور بحیثیت محقق ان کے مقام و مرتبہ کا بھی جائزہ لیا جائے گا ۔

مسعود حسن رضوی کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لینے سے پیشتر ضروری ہو جاتا ہے کہ ان سے پہلے کی تحقیق کا سرسری مطالعہ کیا جائے اور پھر ان کے تحقیقی طریق کار پر گفتگو کر لی جائے ۔

''اُردو میں تحقیق کا سلسلہ ، بقول ڈاکٹر صفدر آہ ، خان آرزو سے شروع ہوتا ہے ۔ خان آرزو نے لغوی اور لسانی تحقیق کے ساتھ بقول خود سنسکرت اور فارسی کی حقیقت توافق کو دریافت کیا ۔''[2]

تحقیق کی اس روایت کو آگے بڑھانے میں محمد حسین آزاد اور شبلی کا بڑا ہاتھ ہے ۔ تحقیق کی جو روایت مسعود حسن رضوی تک پہنچی ہے اس میں مولوی عبد الحق ، حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبد الودود خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ان بزرگوں کے ہاں چند ایک خامیاں بھی پائی جاتی ہیں ۔ مثال

۱۔ دونوں کو یک جا کرکے ''اُردو ڈرامہ اور اسٹیج'' کے نام سے شائع کیا ۔
۲۔ ماہنامہ کتاب لکھنؤ ، دسمبر ۱۹۶۸ع ، ص ۵۰ ۔

کے طور پر بعض محققوں میں خوردہ گیری اور نکتہ چینی کا رجحان ملتا ہے لیکن اس کے برعکس ان کا کام اتنا اہم ہے کہ یہ اُردو تحقیق کے منفرد اور ناقابلِ فراموش ستون ہیں ۔ سید مسعود حسن رضوی ان سے قدرے مختلف ہیں ۔ جس طرح وہ متوازن مزاج نقاد ہیں اسی طرح یہی رویہ ان کی تحقیق میں بھی ملتا ہے اور ان کے ہاں تلخی ، خردہ گیری اور عیب جوئی نام کو بھی نہیں ہے ۔ وہ کسی مسئلے کے بارے میں حتمی رائے تک پہنچنے میں خاصی احتیاط سے کام لیتے ہیں ۔

مسعود حسن رضوی کے تحقیقی کارناموں میں ان کے ذاتی کتب خانے کو بڑی اہمیت ہے جس کا تفصیلی ذکر پہلے باب میں ہو چکا ہے ۔ اپنے محفوظ قدیم سرمائے سے مسعود حسن رضوی نے تحقیقی کام سرانجام دیے ہیں ۔

تحقیق میں مسعود حسن رضوی کا طریقِ کار کیا تھا ، اس سلسلے میں ڈاکٹر نیر مسعود بتاتے ہیں[1] :

"پہلا مرحلہ مواد کی فراہمی کا ہوتا تھا ۔ یہ مرحلہ ان کے ہاں سب سے لمبا تھا اور اس میں بیس تیس سال لگ سکتے تھے اور یوں وہ سب سے پہلے مواد فراہم کرتے تھے ۔ اس کے بعد جمع شدہ مواد کی ترتیب کا مرحلہ آتا تھا اور اس میں وہ خاصی مہارت رکھتے تھے ۔ تحقیقی احتیاطوں کے بارے میں ان کے چند رویے تھے ۔ ایک تو یہ کہ ہر قول کو پہلے غلط سمجھو اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ صحیح سمجھو یا یہ کہ خواہ مخواہ غلط نہ سمجھو ۔ دوسرے شواہد اور قرائن سے شہادتیں دو مگر پھر بھی حتماً صحیح نہ سمجھو ۔ سب سے اہم بات یہ کہ غیر ضروری طور پر ذمہ دارانہ بیان نہیں دینا چاہیے ۔ اس میں یہ احتیاط کی جائے کہ جو مسئلہ زیرِ بحث نہیں ، اس کے بارے میں نہ لکھا جائے ۔"

یوں یہ ایک طرح کا مسعود حسن رضوی کا تحقیقی منشور ہے جس کی روشنی میں انھوں نے کام کیا ۔ اس منشور کو پیشِ نظر رکھ کر جب ہم مسعود حسن رضوی کی تحقیق کو پرکھتے ہیں تو وہ ہمیں ہر مقام پر ان قواعد و ضوابط کی

۱۔ ڈاکٹر نیر مسعود سے گفتگو (ریکارڈنگ) لکھنؤ ، ۲ جون ۱۹۷۹ع ۔

پابندی کرتے نظر آتے ہیں ۔ مندرجہ ذیل صفحات میں ان کے اہم تحقیقی موضوعات کا جائزہ لیا جائے گا ۔

ادیب اور میر تقی میر :

میر تقی میر سے مسعود حسن کو خاصی عقیدت تھی ۔ ''ہماری شاعری'' میں میر کے خاصے حوالے ہیں اور تقریباً ۴۸ اشعار میر کی شاعری سے مثالوں کے ضمن میں دیے گئے ہیں ۔ میر کی تصنیف ''ذکرِ میر'' سے بھی حوالے موجود ہیں ۔ میر کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

> ''کون اُردو داں ہے جس کو قدرت نے ذوقِ سلیم دیا ہو اور وہ میر کو خدائے سخن نہ مانے ۔ کون فارسی خواں ہے جس نے ذکرِ میر ، فیضِ میر ، نکات الشعرا کا مطالعہ کیا ہو اور وہ میر کو فارسی کا زبردست انشا پرداز نہ جانے ۔''[۱]

مسعود حسن رضوی کی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی چار کاپیاں ایسی موجود ہیں جن میں میر کے کلام کا انتخاب کیا گیا ہے ۔ یہ انتخاب ''حدیثِ میر'' ، مرتبہ مقبول احمد لاری میں شامل ہے اور جس کے بارے میں خود مسعود حسن رضوی کا کہنا ہے کہ یہ انتخاب کئی دفعہ ہوا ہے ۔ میر کے بارے میں ان کی تحریروں کی تفصیل کچھ یوں ہے :

(۱) فیضِ میر ، مرتبہ و ترجمہ ۔

(۲) میر کی ایک اور تصنیف ، مجلہ مکتبہ حیدرآباد دکن ، اگست و ستمبر ۱۹۲۹ع ۔ (یہ مضمون فیضِ میر کے بارے میں ہے) ۔

(۳) حضرت میر کی اولاد ، ادب لکھنؤ ، دسمبر ۱۹۳۰ع ۔

(۴) خدائے سخن حضرت میر ، زمانہ کانپور ، دسمبر ۱۹۳۲ع ۔

(۵) میر اور نظیر کا ایک ایک ہم مضمون قطعہ (تقابلی مطالعہ) ، نگار ، نومبر ۱۹۳۶ع ۔

۱- ہماری شاعری ، ص ۱۰۷ ۔

(۶) میر کا ایک شعر اور حشویات (ایک تنقیدی بحث)، کلیم دہلی، نومبر ۱۹۳۶ع -

(۷) میر کی کہانی میر کی زبانی، مشمولہ حدیثِ میر -

(۸) میر کے لطیفے، مشمولہ نگارشاتِ ادیب -

اس کے علاوہ عرش فرزندِ میر ''نگارشاتِ ادیب'' میں شامل ہے۔ ''اُردو شاعری کا زریں عہد''، مطبوعہ علی گڑھ میگزین، دسمبر ۱۹۳۲ع میں اور ''شہر آشوب ـ ایک صنفِ سخن''، مشمولہ نگارشاتِ ادیب میں بھی میر کا تذکرہ موجود ہے۔ ان تحریروں میں مسعود حسن رضوی نے میر کو فارسی کے زبردست انشا پرداز، مورخ، فلسفی، شاعر کے طور پر زبردست خراج پیش کیا ہے۔ ایک جگہ میر کے کلام کی خصوصیات کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''میر کا کلام خلوص، معصومیت، درد مندی اور عبرت آگینی کا ایک بے نظیر مرقع ہے اور شاید اسی میں اس کی دل کشی اور دل نشینی کا راز پنہاں ہے۔''[1]

میر کے اشعار سے مرتب کی ہوئی ''میر کی کہانی میر کی زبانی'' بھی خاصی دلچسپ ہے۔ میر کے بارے میں مسعود حسن رضوی کا اہم کارنامہ ''فیضِ میر'' کی ترتیب و اشاعت ہے۔ ''فیضِ میر'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں :

''میر کی شاعری کو بخوبی سمجھنا ہو تو میر کو سمجھیے اور میر کو سمجھنا ہو تو ''ذکرِ میر'' اور ''فیضِ میر'' پڑھیے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر کے کلام کی تہ کو پہنچنے کے لیے ان دونوں کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ''ذکرِ میر'' اگر میر کے ماحول کا صحیح نقشہ ہے تو ''فیضِ میر'' ان کی سیرت کی سچی تصویر ہے۔''[2]

''فیضِ میر'' پر تفصیل سے بحث مترجم والے باب میں ہوگی۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو میر کے سلسلے میں مسعود حسن رضوی نے کم کام کیا ہے

۱- حدیثِ میر، مرتبہ مقبول احمد لاری، ص ۲۴۳ -

۲- فیضِ میر، ص ۱۲ -

مگر جتنا کچھ لکھا ہے اس سے میر کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔ خاص طور پر میر کی اولاد ، میر کے ذہنی رویے اور میر کے ماحول کا پتہ چلتا ہے ۔ خاص طور پر ''فیضِ میر'' ایک اہم کام ہے ۔

ادیب اور غالب :

مسعود حسن رضوی کو غالب سے بھی خاصا لگاؤ تھا ۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے انھوں نے غالب کو پڑھنا شروع کر دیا تھا ۔ اس زمانے کے حالات و واقعات کے بارے میں خود لکھتے ہیں :

''اسکول میں مولانا سید جواد صاحب اور کالج میں مولانا علی اصغر صاحب یہ دونوں شخصیتیں ایسی ملیں جو میرے لیے ناقابلِ فراموش ہیں ۔ دونوں اسلامی علوم کے عالم ، عربی کے فاضل اور فارسی کے شاعر تھے ۔ دونوں اُردو کے شاعروں میں میر انیس کے عاشق اور مرزا غالب سے بیزار تھے ۔ سید جواد صاحب غالب کی فارسی دانی کے قائل تھے مگر غالب کی شاعری پر مضحکہ کرتے تھے ۔ غالب کا یہ شعر بڑے مضحک انداز میں پڑھتے تھے :

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

اور ناسخ کے اس شعر پر وجد کرتے تھے :

ہمارا ہر نفس اک بادباں ہے
روانہ کشتیٔ عمرِ رواں ہے

ایک دفعہ میں نے غالب کی وہ غزل ان کو سنائی جس کا مطلع ہے :

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

کسی شعر کی تعریف نہ کی ۔ مگر جب میں نے مقطع پڑھا :

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

تو بے ساختہ کہہ اُٹھے ''ایسا کیوں نہیں کہتا یہ گو میے کیوں کہتا ہے''۔

مولانا علی اصغر صاحب غالب بیزاری میں سید جواد صاحب سے بھی بہت آگے تھے ؟ ایک مرتبہ مجھ سے پوچھا ''اردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے'' ۔ میں نے عرض کیا کہ کسی ایک شاعر کو ہر حیثیت سے تمام دوسرے شاعروں سے بہتر قرار دینا مشکل ہے ؟ اجازت ہو تو چند شاعروں کے نام لوں ۔ فرمایا اچھا ۔

میں نے کہا ، میر ، انیس ، غالب ۔ غالب کا نام سنتے ہی تند و تلخ لہجے میں بول اٹھے ''یہ میر اور انیس کے ساتھ غالب کا کیا جوڑ ۔ اس کو نہ اردو پر عبور نہ فارسی پر ۔ ہزل کی جگہ جد ہے ، جد کی جگہ ہزل ہے ۔ ایک بے امتیاز شخص تھا ۔'' ان دونوں فاضل اور شفیق استادوں کی صحبت سے کافی فیض پایا ، مگر غالب کے بارے میں ان کا ہم خیال کبھی نہ ہو سکا ۔''[1]

اسی بات کا تذکرہ انہوں نے اپنے مضمون ''مرزا غالب تب اور اب'' مشمولہ نگارشات ادیب ، صفحہ ۲۵۸ - ۲۵۹ میں بھی کیا ہے ۔

''امتحانِ وفا'' میں مسعود حسن رضوی نے غالب کے کئی شعر استعمال کیے ہیں ۔ مثلاً :

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر — ص ۲۳

کہتے ہیں ہے مکاں کو مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے[2] — ص ۳۲

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ اس کے رخ سے نگہ کامیاب ہے — ص ۳۶

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہگذر یاد آیا — ص ۳۸

۱۔ میری زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعات و شخصیات ، لکھنؤ ریڈیو ، نشریہ ۲ ستمبر ۱۹۶۰ء ۔

۲۔ یہ شعر اس طرح ہے :

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

مسعود حسن رضوی کو غالب فہمی میں کمال حاصل تھا ۔ وہ شعر کو پڑھ کر ہی معنی کی تہیں کھول دیتے تھے ۔ ڈاکٹر آفاق حسین نے اپنے مضمون[1] میں کئی مثالیں دی ہیں جن سے ان کی غالب کے کلام کی تشریح و توضیح پر گرفت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

غالب ، مسعود حسن رضوی کا خاص موضوع نہیں تھے ، بلکہ انھوں نے اس سلسلے میں کئی ایک ضمنی کام کیے ہیں ۔ البتہ انھوں نے تمام عمر غالب کا مطالعہ جاری رکھا ۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے اپنے ایک مضمون ''غالبیات اور مسعود حسنِ رضوی ادیب'' میں تحریر کیا ہے :

"غالب ، مسعود کا خصوصی موضوع نہیں تھے ، لیکن غالب کے متعلق ان کی تحریروں خصوصاً ''متفرقات'' کی وجہ سے ان کو غالب شناسوں کی صف میں جگہ مل گئی ۔"[2]

''ہماری شاعری'' میں میر کے بعد سب سے زیادہ اشعار غالب کے ہیں اور ان کی تعداد ۴۵ کے قریب ہے ۔ بہر کیف غالب کے سلسلے میں جو تھوڑا بہت تحقیقی کام مسعود حسن رضوی نے کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے :

(الف) متفرقاتِ غالب :

نظم طباطبائی اور تنقیدِ کلامِ غالب ۔

(ب) مضامین :

(۱) مرزا غالب کا کچھ غیر مطبوعہ کلام اور اس کی شانِ نزول ،
الناظر لکھنؤ ، دسمبر ۱۹۳۴ع ۔

(۲) مرزا غالب کی ایک ہنگامہ خیز مثنوی ،
زمانہ کانپور ، مارچ ۔ اپریل ۱۹۳۶ع ۔

(۳) غالب کے دو تعزیت نامے اور چنا جان ،
ماہِ نو کراچی ، فروری ۱۹۳۹ع ۔

۱۔ آج کل نئی دہلی ، فروری ۱۹۷۶ع ۔
۲۔ غالب نامہ ، ص ۱۲۷ ۔

(۴) غالب کے حالات میں پہلا مضمون ،
مشمولہ احوالِ غالب ، مرتبہ مختار الدین آرزو ۔

(۵) خطوطِ مشاہیر بنام ولایت و عزیز صفی پوری شاگردِ غالب ،
مشمولہ عیارِ غالب ، مرتبہ مالک رام ۔

(۶) شرح طباطبائی اور تنقیدِ کلامِ غالب ،
فروغِ اردو لکھنؤ ، غالب نمبر ۱۹۶۹ع ۔

(۷) فکرِ غالب (غالب کے ایک شعر کی شرح) ،
ماہنامہ کتاب لکھنؤ ، مارچ ۱۹۶۹ع ۔

(۸) مرزا غالب تب اور اب ،
ماہنامہ کتاب لکھنؤ ، اپریل ۱۹۶۹ع ۔

(۹) غالب کے ایک قصیدے پر واجد علی شاہ کا عطیہ ،
ہماری زبان ، علی گڑھ ، ۲۲ ستمبر ۱۹۷۱ع ۔

(۱۰) غالب کا ایک فارسی خط ، تحریک دہلی ، مئی ۱۹۶۲ع ۔

(۱۱) غالب کا ایک خط اور غالب کے نام دو خط ،
نیا دور لکھنؤ ، جنوری ۱۹۷۴ع ۔

(ج) تبصرے :

۱۔ قتیل اور غالب ، از سید انور علی فرید آبادی ۔

۲۔ ذکرِ غالب ، از مالک رام ۔

۳۔ لطائفِ غالب ، مؤلفہ مسز اے ۔ ایم شاہ ۔

مسعود حسن رضوی کی غالب سے عقیدت کے سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ یاس یگانہ چنگیزی ، غالب کے سخت مخالف تھے اور وہ مسعود حسن رضوی کو غالب کے طرف داروں میں شامل کرتے تھے ۔ یگانہ کی کتاب "غالب شکن" میں مسعود حسن رضوی کے نام ایک طویل خط ہے جو انھوں نے مسعود حسن رضوی کے خط کے جواب میں لکھا ہے ۔ مسعود حسن رضوی والا خط نہیں مل سکا ، مگر قیاس یہ ہے کہ اس خط میں مسعود حسن رضوی نے یگانہ کو سمجھایا ہوگا کہ غالب دشمنی ان کے حق میں مضر ثابت ہو رہی ہے ۔

اس خط کی مسعود حسن رضوی کی غالب سے دلچسپی کے سلسلے میں خاصی اہمیت ہے۔

ذیل میں غالب پر مسعود حسن رضوی کے کام کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

متفرقاتِ غالب :

متفرقاتِ غالب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۷ع میں رامپور سے شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۹ع میں کتاب نگر لکھنؤ نے شائع کیا۔ اس میں ۲۳ صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ بھی شامل ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں چند نئی چیزوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول مکتوبات اور حصہ دوم منظومات پر مشتمل ہے۔ یہ تمام چیزیں غیر مطبوعہ نہیں ہیں لیکن جن رسائل میں یہ شائع ہوئی تھیں وہ بھی بہت سے لوگوں سے اوجھل رہے۔ ان میں مثنوی "بادِ مخالف" قابلِ ذکر ہے۔ اس سلسلے میں اگر حواشی میں اختلافات کی نشاندہی ہو جاتی تو یہ بہتر صورت میں سامنے آ جاتی۔ بہرحال اس کتاب کے حوالے سے غالب اور ان سے متعلق جو چیزیں سامنے آئی ہیں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ مسعود حسن رضوی کے دو مضامین ''مرزا غالب کا کچھ غیر مطبوعہ کلام اور اس کی شانِ نزول'' اور ''مرزا غالب کی ایک ہنگامہ خیز مثنوی'' جو نگارشات ادیب میں بھی شامل ہیں، انھیں متفرقاتِ غالب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مقدمے میں ان تحریروں کی اہمیت اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اُن منابع اور ماخذات کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے جہاں سے یہ تحریریں لی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں :

"میرے کتب خانے میں ایک بیاض ہے جس میں مرزا غالب کے اڑتالیس فارسی خط، دو فارسی قطعے، ایک فارسی مثنوی اور ایک اردو غزل بھی شامل ہے۔ یہ کل خط ایسے لوگوں کے نام ہیں جو کلکتے میں مقیم تھے اور یہ سب نظمیں ایسی ہیں جو غالب نے کلکتے کے قیام کے زمانے میں کہی تھیں۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کسی کلکتے کے رہنے والے ہی نے یہ تمام چیزیں اس بیاض میں جمع کی ہیں۔''[1]

۱۔ متفرقاتِ غالب (دوسرا ایڈیشن)، ص ۸۔

مقدمے میں متعلقہ افراد کے حالات اور خطوط کی وجوہات بھی نہایت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں اور اختلافات کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے ۔ اس حوالے سے غالب کے سلسلے میں مسعود حسن رضوی نے جو نئی چیزیں پیش کی ہیں ، ان کی روشنی میں ان کا نام بھی غالب کے محققوں کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے ۔

شرح طباطبائی اور تنقید کلام غالب :

یہ کتاب ۱۹۷۳ع میں کتاب نگر لکھنؤ نے شائع کی ۔ ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں :

"مسعود حسن رضوی کی قلمی یادداشتوں میں ایک پرانی یاداشت ہے جس میں کچھ تنقیدی نکات درج کرنے کے بعد لکھا گیا ہے کہ مندرجہ بالا خیالات طباطبائی نے شرح دیوان غالب میں ظاہر کیے ہیں ۔ یہ یادداشت بظاہر "ہماری شاعری" کی تصنیف کے زمانے کی ہے ۔ ایک مدت کے بعد جب غالب صدی کے موقعے پر ماہنامہ "اردو" لکھنؤ نے اپنے غالب نمبر کے لیے مسعود سے کوئی مضمون مانگا تو انھوں نے شرح طباطبائی کے وہ بیانات بھی مرتب کر لیے تھے جن میں کلام غالب کے معائب ظاہر کیے گئے ہیں ۔ لیکن غالب صدی کے موقع پر ان کی اشاعت کو مناسب نہیں سمجھا ۔ چند سال گزر جانے کے بعد انھوں نے دونوں طرح کے بیانات کو جمع کرکے کتابی صورت میں شائع کر دیا ۔"[1]

کتاب میں ایک مختصر پیش نامہ بھی ہے جس میں مسعود حسن رضوی نے اس کتاب کی غرض و غایت بھی بیان کر دی ہے ۔ لکھتے ہیں :

"غالب کے اردو دیوان کی بہت سی شرحیں لکھی جا چکی ہیں ۔ ان میں مولانا سید علی حیدر نظم طباطبائی کی شرح کو خاص امتیاز حاصل ہے ۔ مولانا ایک مسلّم الثبوت عالم ، شاعر اور ناقد تھے ۔ وہ دیوان غالب کی شرح میں کلام غالب کی تشریح و تفہیم کے ساتھ ساتھ تنقید بھی

۱۔ غالب نامہ ، ص ۱۵۴ ۔

کرتے گئے ہیں ۔ ان کے مختصر لیکن نہایت اہم تنقیدی بیانات شرح کے ساڑھے تین سو صفحوں میں بکھرے ہوئے ہیں جن میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں ہے ۔ راقم نے ان کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر ان منتشر بیانات کو محاسن کلام اور معائب کلام کے دو بابوں میں مناسب عنوانوں کے تحت جمع کر دیا ہے ۔"[1]

مسعود حسن رضوی نے انھیں صرف مناسب ترتیب سے جمع کر دیا ہے ۔ اگر وہ اس تنقید پر مزید تنقید لکھتے تو اس سے غالب فہمی کے لئے در کھل جاتے اور اس طرح اس کتاب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ۔ بہر طور اس طرح غالب پر کام کرنے والوں کے لیے آسانی پیدا ہو گئی ہے ۔

متفرق مضامین :

ان مضامین میں ، جن کی فہرست اوپر کے صفحات میں پہلے ہی دی جا چکی ہے ، اکثر مضامین تحقیقی نوعیت کے ہیں ۔ غالب کے حالات میں پہلا مضمون تحقیقی ہے ، جس میں محمد حسین آزاد کا کہا ہوا قطعہ تاریخ وفات غالب بھی شامل ہے ۔ "غالب کے دو تعزیت نامے اور چنا جان" کی اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ اس سے حاتم علی بیگ مہر کی محبوبہ چنا جان کے بارے میں معلومات ملتی ہیں اور بعض خفیہ گوشوں سے پردہ اٹھتا ہے ۔ اسی طرح "غالب کے ایک قصیدے پر واجد علی شاہ کا عطیہ" ، "غالب کا ایک فارسی خط" اور "غالب کا ایک خط اور غالب کے نام دو خط" تحقیقی نوعیت ہی کے ہیں ۔

مسعود حسن رضوی نے یگانہ کو جو خط لکھا تھا اور تلاش بسیار کے بعد اس کا متن نہیں مل سکا اس میں بھی ان کی غالب سے دلچسپی کارفرما دکھائی دیتی ہے ۔ اگر یہ خط مل جاتا تو یگانہ کے خط سے تقابلی مطالعے سے ایک نئی صورت سامنے آ جاتی ۔ مسعود حسن رضوی یگانہ کے اس خط کا جو غالب شکن میں شامل ہے ، اپنے ایک مضمون "مرزا غالب تب اور اب" میں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱۔ نظم طباطبائی اور تنقید کلام غالب ، ص ۲ ۔

''اس موقع[1] پر میرے مرحوم دوست مرزا یگانہ چنگیزی کی تصویر میری نظروں میں پھر رہی ہے ۔ مرحوم نے اپنی کتاب میں غالب پر سخت ترین اعتراض کیے ہیں ، جو پہلے ''غالب شکن'' کے نام سے اور پھر بہت سے اضافوں کے ساتھ ''غالب شکن دو آتشہ'' کے نام سے شائع ہوئی ۔ مصنف کے تیور کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہیں ۔ یہ کتاب اصل میں ایک طویل خط ہے جو مرزا یگانہ نے میرے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا ۔ یگانہ مرحوم غالب کی مخالفت میں بہت بدنام ہوئے ۔ لیکن وہ ذاتی طور پر خود کو غالب کا مخالف نہیں ''غلبچیوں'' کا مخالف کہتے تھے ۔ ان کی مخالفانہ تحریروں کا مقصد خود ان کے قول کے موافق یہ تھا کہ غالب کے ان پرستاروں کو سبق دیا جائے جو غالب کو صحیح طور پر سمجھے بغیر ان سے اندھی عقیدت رکھتے ہیں ۔ ان کے کلام اور کردار کو ہر طرح کے عیوب سے مبرا سمجھتے ہیں اور ان کے سوا کسی دوسرے شاعر کے کمال کے قائل نہیں ۔''[2]

اس تناظر میں اگر غالب کے سلسلے میں مسعود حسن رضوی کے کام کا جائزہ لیں ، تو اگرچہ اس کی مقدار کم ہے مگر معیار میں کہیں اونچا ہے ۔ اگر مسعود حسن رضوی مستقل طور پر غالب کو بھی اپنا موضوع بناتے تو غالب کے بارے میں نئی باتیں سامنے آتیں ، مگر وہ تحقیقی کاموں میں اُلجھے رہنے کی بنا پر اس طرف توجہ نہ کر سکے ۔ اس پر خود حسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''جی تو میرا بھی چاہتا تھا کہ اپنی زبان کے اس مایۂ ناز شاعر کے شایانِ شان کچھ لکھوں لیکن اس شاعر کا یہ شعر اب میرے حسبِ حال ہے :

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے''[3]

۱- اس سے مراد غالب صدی تقریبات ہیں ۔
۲- نگارشاتِ ادیب ، ص ۲۶۰ ۔
۳- نگارشاتِ ادیب ، ص ۲۶۱ ۔

مسعود حسن رضوی نے غالب کے سلسلے میں جو تھوڑا بہت کام کیا ہے اس کی بدولت غالبیات میں ان کا نام ہمیشہ رہے گا ۔

ادب اور اردو ڈراما :

اردو ڈرامہ مسعود حسن رضوی کا خاص موضوع تحقیق ہے اور اس مد میں انھوں نے خاصا کام کیا ہے ۔ اردو ڈرامے کے آغاز کے سلسلے میں جس طرح تحقیق سے واجد علی شاہ کے ڈرامے ''رادھا کنھیا کا قصہ'' کو اردو کا پہلا ڈرامہ ثابت کیا ہے وہ اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ انھوں نے اس سے اس خیال کو بھی غلط ثابت کیا کہ امانت نہ تو اردو کا پہلا ڈرامہ نگار ہے اور نہ ہی اندر سبھا اردو کا پہلا ڈرامہ ۔

اردو ڈراما کے سلسلے میں اب تک ''لکھنو کا شاہی اسٹیج''، ''لکھنو کا عوامی اسٹیج'' اور ''اندر سبھا'' سامنے آچکی ہیں ، لکھنو کا شاہی اور عوامی اسٹیج کو ملا کر ایک کتاب ''اردو ڈرامہ اور اسٹیج'' بھی منظرِ عام پر آ چکی ہے ۔

مسعود حسن رضوی کو ڈرامے کے موضوع سے کب اور کیوں دلچسپی ہوئی ، اس کا جواب انھوں نے احتشام حسین کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے دیا ۔ انھوں نے کہا :

''مجھ کو واجد علی شاہ اور ان کے ادبی و فنی مشغلوں سے بلکہ ان کے عہد کے لکھنو سے بہت دلچسپی ہے ۔ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ معلومات فراہم کرتا رہا ہوں ۔ آج سے چھتیس برس پہلے ۱۹۲۴ع میں محمد عمر نور الہٰی صاحبان نے ''ہندوستان کا ڈراما'' کے عنوان سے ایک مقالہ[1] شائع کیا ۔ یہ مقالہ بہت محنت سے لکھا گیا تھا لیکن اس کی بنیاد افواہوں اور قیاسوں پر تھی ۔ اس مقالے میں اندر سبھا کے بارے میں لکھا گیا تھا کہ وہ اردو کا پہلا ڈرامہ ہے ۔ وہ اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے حکم سے لکھا گیا ۔ شاہی محل میں کھیلا گیا۔ خود بادشاہ اور اس کے درباریوں نے اس میں پارٹ کیا ۔ ان بے اصل

۱۔ یہ مقالہ رسالہ ''اردو'' اورنگ آباد دکن کے جنوری ۱۹۲۴ع کے شمارے میں شائع ہوا ۔

باتوں کو دیکھ کر لکھنو کے مشہور ادیب عبدالحلیم شرر نے ایک مضمون[1] شائع کر کے صحیح صورتِ حال پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس مضمون کی رد میں محمد عمر نور الٰہی نے ایک مقالہ[2] لکھا۔ کچھ دن بعد پھر ان دونوں صاحبوں نے ڈرامے کی ایک مبسوط تاریخ ''ناٹک ساگر'' کے نام سے شائع کی اور اس میں ''اندر سبھا'' کے بارے میں وہی سب باتیں لکھ دیں جو اپنے مقالے میں لکھ چکے تھے اور جن سے شرر صاحب اختلاف کر چکے تھے۔ شرر مرحوم نے جو کچھ لکھا تھا وہ اپنے ذاتی علم کی بنا پر لکھا تھا اس لیے انھوں نے اپنے بیانوں کے لیے کوئی ثبوت پیش نہ کیا تھا۔ اب اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اصل حقیقت مضبوط ثبوت کے ساتھ پیش کی جائے۔ اس غرض سے میں نے ۱۹۲۶ء میں ایک مقالہ[3] لکھا جس کا عنوان تھا ''اندر سبھا اور شرح اندر سبھا'' ۔ اردو ڈرامے سے خاص دلچسپی تو اس طرح پیدا ہوئی، مگر اس دلچسپی میں غیر معمولی اضافے کا ایک سبب اور ہوا۔ آل انڈیا ریڈیو کی فرمائش پر میں نے اودھ شاہی اسٹیج کے مختلف پہلوؤں پر پانچ تقریریں تیار کیں جو ۱۹۴۳ء کی مختلف تاریخوں میں نشر کی گئیں۔ اب اردو ڈراما اور اسٹیج کا ابتدائی دور میرے لیے ریسرچ کا خاص موضوع بن گیا۔''[4]

مسعود حسن رضوی نے ''لکھنؤ کا عوامی سٹیج'' میں ان تقریروں کا ذکر کیا ہے۔ یہ تقریریں ۹ اپریل، ۲۱ اپریل، ۲ مئی، ۱۰ مئی اور ۲۰ جون کو نشر ہوئیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد وہ اندر سبھا کے قدیم اور معتبر نسخوں کی تلاش میں لگے رہے۔

۱۔ یہ مضمون شرر مرحوم کے رسالہ ''دلگداز'' میں شائع ہوا۔

۲۔ یہ مقالہ ''ہزار داستان'' لاہور میں شائع ہوا۔

۳۔ یہ مقالہ رسالہ ''اردو'' اورنگ آباد دکن کے اپریل ۱۹۲۷ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

۴۔ سید مسعود حسن رضوی سے انٹرویو، از احتشام حسین، لکھنؤ ریڈیو، نشریہ ۲۸ جون ۱۹۶۰ء۔

اردو کا پہلا ڈرامہ نگار :

اردو ڈراما کے سلسلے میں سب سے متنازعہ فیہ مسئلہ یہ تھا کہ اردو کا پہلا ڈرامہ نگار کون ہے ؟ مولوی سید محمد نے (ارباب ِ نثر ِ اردو ، ص ۲۰۰) کاظم علی جوان کے شکنتلا ناٹک کو اردو کا پہلا ڈرامہ قرار دیا ہے ۔ دراصل یہ وہ ڈرامہ ہے جو نواز نے فرخ سیر کے عہد ِ حکومت (۱۷۱۳ع — ۱۷۱۹ع) میں لکھا تھا ۔ کاظم علی جوان نے للو لال جی کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کیا ۔ ڈاکٹر محمد اسلم قریشی نے اپنی کتاب ''ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر'' میں اس موضوع پر طویل بحث کی ہے جو صفحہ ۲۷۳ سے صفحہ ۲۹۳ تک ہے ۔ اس میں انھوں نے حافظ محمود شیرانی ، دتاتریہ کیفی ، رام بابو سکسینہ اور دیگر اصحاب سے اختلاف کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے :

''برعظیم پاک و ہند میں اردو تھیٹر کی ابتدا یا ابتدائی اردو ڈراموں کے ضمن میں نواز اور جوان کا نام شامل کرنا غلط ہے ۔ نواز یا جوان کی ''شکنتلا ناٹک'' کو بعض غلط فہمیوں کی بنا پر ڈراما قرار دیا جا رہا ہے حالانکہ یہ ڈرامے نہیں ہیں ۔''[1]

عشرت رحمانی 'شکنتلا' کے ترجمے کو اردو ترجمہ ہی تسلیم نہیں کرتے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''اس برصغیر میں سب سے پہلے شاہ فرخ سیر کے زمانے میں شکنتلا کا ترجمہ درباری شاعر نواز نے ۱۷۱۶ع میں برج بھاشا میں کیا ۔ بعض مورخین نے کسی مغالطے کی بنا پر اس کو اردو زبان کا ترجمہ بتایا ہے حالانکہ اُس وقت اردو رائج ہی نہ تھی ۔''[2]

مسعود حسن رضوی نے اپنے مضمون ''نواز اور شکنتلا'' میں اس مسئلے کے بارے میں خاصی تفصیل سے لکھا ہے اور مستند حوالوں سے جو نتائج نکالے وہ یہ ہیں :

۱- ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر ، از ڈاکٹر محمد اسلم قریشی ، ص ۲۹۲ ۔
۲- اردو ڈرامے کا ارتقاء ، از عشرت رحمانی ، ص ۴۵ ۔
۳- نگارشات ِ ادیب ، ص ۱۷ - ۱۸ ۔

۱- نواز ہندی یعنی برج بھاشا کا شاعر تھا اور ہندی تلفظ کے مطابق نواج تخلص کرتا تھا ۔

۲- نواج کی سکنتلا (بہ سین مہمل) ناٹک نہیں ہے ۔ ایک منظوم قصہ ہے جو ہندی کی مختلف بحروں میں بیان کیا گیا ہے ۔ ناٹک کی کوئی خصوصیت اس میں موجود نہیں ہے ۔ خود نواج اس کو ناٹک نہیں بلکہ کتھا یعنی قصہ کہتا ہے ۔

اس طرح مسعود حسن رضوی نے اس خیال کی بھی تردید کر دی کہ شکنتلا ناٹک اردو کا پہلا ڈرامہ ہے ۔ اس قضیے کا فیصلہ کرنے کے لیے انھوں نے کافی وقت صرف کیا اور تحقیق کے بعد واجد علی شاہ کو اردو کا پہلا ڈرامہ نگار قرار دیا ۔ لکھتے ہیں :

''واجد علی شاہ کے زمانے تک اردو میں ڈرامے کا وجود نہ تھا ۔ اس اہم صنفِ ادب کی بنیاد ڈالنے کا فخر ان کے لیے اُٹھ رہا تھا ۔ انھوں نے ولی عہدی کے دنوں میں رادھا کنھیا کی داستانِ محبت پر مبنی ایک چھوٹا سا ناٹک لکھا ، جو ہماری خوش قسمتی سے اب تک موجود ہے ۔ فنی اعتبار سے اس کا درجہ کچھ بھی ہو ، اردو کا پہلا ڈرامہ ہونے کی حیثیت سے وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔''[۱]

ڈاکٹر عطیہ نشاط نے اپنی کتاب ''اردو ڈراما ـــ روایت اور تجربہ'' میں مسعود حسن رضوی کے اس خیال کو تسلیم کرنے میں تامل سے کام لیا ہے مگر وہ اس کے خلاف کوئی واضح دلائل پیش نہیں کر سکیں ۔ البتہ ایک طرح سے وہ بھی واجد علی شاہ کو پہلا ڈرامہ نگار تسلیم کر گئیں ۔ لکھتی ہیں :

''واجد علی شاہ کی یہ کوششیں بذاتِ خود تو ڈراما نہیں کہی جا سکتیں لیکن ان سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان کے اندر ڈراما پروڈیوسر کی روح چھپی ہوئی تھی جو انھیں اس کی طرف اُکساتی رہتی تھی اور وہ اپنی طبیعت کی اُپج سے ایسی صورتیں نکالا کرتے تھے جو ڈرامے کا نقشِ اول کہی جا سکتی ہیں ۔''[۲]

۱- لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ، ص ۲۱ ۔

۲- اردو ڈراما ـــ روایت اور تجربہ ، از ڈاکٹر عطیہ نشاط ، ص ۵۸ ۔

اب جب کہ ڈرامہ اتنی ترقی کر چکا ہے ، مسعود حسن رضوی کی یہ بات ناقابلِ تردید ہے کہ واجد علی شاہ اردو کے پہلے ڈرامہ نگار تھے ۔ ذیل کے صفحات میں ان کے ڈرامے پر کام کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے ۔

''لکھنؤ کا شاہی اسٹیج'' :

''لکھنؤ کا شاہی اسٹیج'' پہلی بار ۱۹۵۷ء میں اور دوسری بار اضافہ مطالب کے ساتھ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی ۔ اس کا سببِ تالیف انھوں نے خود دیباچے میں بیان کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

''واجد علی شاہی ڈرامے اور اسٹیج پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی جا چکی ہے ، لیکن اگلے اہل قلم نے ناکافی معلومات کی بنا پر جو کچھ لکھا اس سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں . . . ضرورت تھی کہ اردو ڈرامے کی مستند تاریخ لکھی جائے . . . اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے راقم الحروف نے ماخذوں کی تلاش و دستیابی اور مواد کی فراہمی و ترتیب میں برسوں کا وقت صرف کرکے اردو ڈرامے اور اسٹیج کے پہلے دور کی مستند تاریخ تیار کر دی ہے ۔''[۱]

چنانچہ جب ہم کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب میں ان غلط فہمیوں کو مستند حوالوں اور ماخذوں سے دور کر دیا گیا ہے ۔ کتاب کے شروع میں ۲۷ ماخذوں اور نایاب حوالوں کی فہرست ان کی محنت اور عرق ریزی کی غمازی کرتی ہے ۔

لکھنؤ کا شاہی اسٹیج جن ابواب پر مشتمل ہے ، اس کی تفصیل یوں ہے : پہلے باب ''پس منظر'' میں ڈرامے کی ابتدا ، ناٹک کی قدامت ، ناٹک کا مقصد ، رام لیلا اور رہس اور قصہ خوانی وغیرہ پر بحث کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج الھی بنیادوں پر قائم ہوا ۔ دوسرے باب ''شاہی ڈرامے کے ابتدائی آثار'' میں نصیر الدین حیدر کے عہد میں ہونے والے تفریحی مشاغل کا تفصیل سے ذکر ہے اور یوں مسعود حسن رضوی نے دراصل اس عہد کو لکھنؤ کے شاہی اسٹیج کی تعمیر میں بنیادی اور اہم ترین پتھر قرار

۱۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ، ص ۲۳ - ۲۴ ۔

دیا ہے ۔ اس کے ساتھ ''شاہی اسٹیج کا معمار اعظم'' میں واجد علی شاہ کی تہذیبی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ ''شاہی اسٹیج کی ارتقائی منزلیں'' میں واجد علی شاہ کے جوگی بننے کو شاہی اسٹیج کی بنیاد قرار دیا ہے ۔ اور یہ پہلی منزل ہے ۔ دوسری منزل میں رہس کی حقیقت ، راس لیلا کے مختلف تصورات ، رہس کے شعبے، رہس کی صورتیں ، اس کا طرز ، اور اس کے لیے ہدایات وغیرہ بیان کی ہیں ۔ تیسری منزل زمانۂ ولی عہدی میں رہس کے جلسوں پر مشتمل ہے ۔ مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں :

''رہس ناٹک بھی ان کی توجہ سے محروم نہیں رہا ۔ وہی ولی عہدی کا زمانہ تھا کہ انھوں نے اس کے کئی اُستاد ملازم رکھے جنھوں نے اپنی واقفیتِ فن کے مطابق رادھا کنھیا کے ناٹک کا بہتر سے بہتر کھیل کئی لاکھ روپے کے صرف سے تیار کیا ۔''[1]

اس کا واجد علی شاہ نے خود اپنی مثنوی ''عشق نامہ'' میں ذکر کیا ہے ۔

''پہلا شاہی ناٹک'' میں مسعود حسن رضوی نے رادھا کنھیا کے قصے کو پہلا ڈرامہ قرار دیا ہے ۔ یہ ڈرامہ کب کھیلا گیا ؟ کافی بحث کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ ناٹک اُس جلسے میں پیش کیا گیا جو ۱۸۴۲ء اور ۱۸۴۳ء کے درمیان منعقد ہوا ۔ صحیح تاریخ کا تعین ابھی تک بھی نہیں ہو سکا ۔ اس کے بعد ''وقفہ'' کا جو عنوان قائم کیا گیا ہے ، اس میں بادشاہ کی تخت نشینی پر پری خانہ کی برخاستگی ، بادشاہ کی طویل بیماری اور پھر سے جلسوں کے آغاز کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اُن کے مطابق عہدِ شاہی میں تین جلسے ہوئے ۔ پہلے جلسے میں دریائے تعشق کی ڈرامائی تشکیل کی گئی ۔ دوسرے جلسے میں واجد علی شاہ کی مثنوی ''افسانۂ عشق'' کو ڈرامے کا روپ دیا گیا ۔ رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عبرت میں اس کی خاصی تعریف کی ہے ۔ امانت لکھنوی نے بھی اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

''سرخ دوپٹہ بہاری محفل میں تنتا ہے ۔ شفق کا جواب بنتا ہے ، جس میں سے نور چھنتا ہے ۔ زہرہ خصال ، مشتری جمال کس پھرتی سے ناچ ناچ کر اس کے تلے سے نکل جاتے ہیں ۔ گویا کہ برجِ آتشی سے ستارے

۱۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ، ص ۱۰۳ - ۱۰۴ ۔

چمک چمک کر باہر آتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ مثنوی حضرت کی پڑھی جاتی ہے،
میر حسن کی روح تازگی پاتی ہے ۔''[1]

رہس کا تیسرا جلسہ واجد علی شاہ کی مثنوی ''بحر الفت'' کا ڈراما تھا ۔ اس ڈرامے میں پہلی بار مکالموں میں نثر کا استعمال کیا گیا ۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو واجد علی شاہ نے یہ جلسے ترتیب دے کر لکھنؤ کے شاہی اسٹیج کی بنیادیں ڈالیں اور ڈرامے کی بھرپور روایت کی نہ صرف بنا ڈالی بلکہ اسے صحیح اور مضبوط بنیادوں پر اُستوار کیا ۔

مسعود حسن رضوی نے شاہی رہس کے ساز و سامان کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے ۔ کلکتے میں شاہی رہس کے باب میں واجد علی شاہ کے عالمِ غربت کے اس شوق کا ذکر کیا ہے، جس کی بنا پر انھوں نے مٹیا برج میں بھی جلسے کیے ۔ خاتمۂ کلام میں لکھتے ہیں :

''واجد علی شاہ اپنے زمانے میں ہندوستانی موسیقی، رقص اور ناٹک کے سب سے بڑے سرپرست تھے ۔ انھوں نے ان فنون کو ترقی دینے کے لیے اپنے محدود ذرائع کے اندر وہ سب کام کیے جن کے لیے ہمارے زمانے میں اُتر پردیش کی حکومت نے لکھنؤ میں ہندوستانی موسیقی کا کالج اور ہندوستان کی مرکزی حکومت نے دہلی میں سنگیت ناٹک اکاڈمی قائم کی ہے ۔''[2]

کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر رادھا کنھیا کا قصہ بھی شامل کر دیا گیا ہے ۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کا حسنِ ترتیب ہے ۔ کتاب کو اس حسن اور سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھتے وقت کسی قسم کی اُلجھن نہیں ہوتی ۔ بلکہ شاہی ڈرامے کی ساری چیزیں واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہیں ۔ جن بے شمار ماخذ کے حوالے دیے گئے ہیں، ان کا پڑھنا اور ان سے مطلوبہ

۱۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، ص ۱۶۳ ۔
لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، ص ۱۵۶ ۔
۲۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، ص ۲۲۳ ۔

مواد حاصل کرنا ہی ایک طرح کا کمال ہے اور بلاشبہ مسعود حسن رضوی نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ نقادوں نے مسعود حسن رضوی کو بڑی داد دی ہے اور اس کتاب پر جتنے بھی تبصرے ہوئے ہیں، ان میں ان کے اس تحقیقی کارنامے کو سراہا گیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ کے ۲۴ دسمبر ۱۹۵۸ع کے شمارے[1] میں ایک تبصرہ نگار لکھتا ہے:

"تحقیق اور تنقید کا کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کس طرح مختلف، غیر متوقع ماخذ سے معلومات ریزہ ریزہ کرکے جمع کی گئی ہیں اور ان کو مناسب موقعوں پر استعمال کرکے ایک مسلسل اور مربوط بیان کی شکل دی گئی ہے۔ کس طرح تاریخوں کے تعین میں مختلف بیانات کی صحت اور عدم صحت کو پیش‌نظر رکھا گیا ہے اور کس طرح ایک اصطلاح کے رموز و اسرار کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب تحقیق اور کاوش کا ایک غیر المعقول کارنامہ ہے۔"

صفی حیدر دانش نے ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے ۱۳ ستمبر ۱۹۶۰ع کو "لکھنؤ کا شاہی اسٹیج" پر تبصرہ[2] کرتے ہوئے اس کتاب کی تحقیقی خوبیاں بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

"اردو ڈرامے کے آغاز اور اس کی ابتدائی ترقی پر یہ غالباً پہلی کتاب ہے جو نہایت جانفشانی سے لکھی گئی ہے۔ یہ ایک تحقیقی تصنیف ہے جس میں مستند و معتبر تاریخی حوالوں سے مدد لے کر موضوعِ بحث پر عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب اردو ادب کے تحقیقی سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔"

اسی طرح ریڈیو پاکستان لاہور سے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ۲۷ اپریل ۱۹۵۹ع کو تبصرہ[3] کرتے ہوئے لکھا ہے:

۱- میرے پاس موجود ہے۔
۲- میرے پاس موجود ہے۔
۳- میرے پاس موجود ہے۔

"ادبی تحقیق کے صحیح اصولوں سے اس میں کام لیا گیا ہے ، لیکن اس کے باوجود یہ تحقیقی کتابوں کی طرح خشک نہیں ، بلکہ ناول اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپ ہے . . . اس میں صرف لکھنؤ کے شاہی اسٹیج کی داستان ہی نہیں ہے ، اُس زمانے کے تاریخی حالات ، معاشرتی ماحول ، تہذیبی فضا اور ادبی و فنی زندگی کی تصویر پیش کی گئی ہے ۔"

مختصر یہ کہ یہ کتاب لکھنؤ کے شاہی اسٹیج کے بارے میں بھرپور معلومات دینے کے ساتھ ساتھ لکھنوی تہذیب اور تمدن کے بارے میں گرانقدر پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے اور یوں مسعود حسن رضوی کے حسنِ ترتیب اور تحقیق و جستجو کی داد دینا پڑتی ہے ۔ یہ کتاب اردو ڈرامے کے ارتقاء کے سلسلے میں خاصی اہمیت کی حامل ہے ۔

لکھنؤ کا عوامی اسٹیج :

یہ کتاب امانت کی اندر سبھا کے متعلق ہے ۔ اُردو کا پہلا ڈرامہ نگار اور اُردو کے پہلے ڈرامے کے سلسلے میں گزشتہ اوراق میں گفتگو کی جا چکی ہے ۔ اس سلسلے میں بحث مباحثے کا خاصا چرچا رہا ۔ چنانچہ ڈاکٹر مسیح الزماں ، ڈاکٹر سید محمد عقیل ، ڈاکٹر عبد العلیم نامی ، عشرت رحمانی اور ڈرامے کے دوسرے بہت سے نقادوں نے اپنے اپنے خیالات کے مطابق اس پر قلم اُٹھایا ہے ۔ اس کا خلاصہ کچھ یوں بنتا ہے ۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں :

"سب سے پہلا اُردو ڈرامہ "اندر سبھا" ہے جس کو امانت شاگردِ ناسخ نے تصنیف کیا تھا ۔"[1]

سید بادشاہ حسین یہ نتیجہ نکالتے ہیں :

"بہرحال اُردو ڈرامے کی داغ بیل امانت کے ہاتھوں پڑی ۔"[2]

عشرت رحمانی لکھتے ہیں :

" "اندر سبھا" اُردو کا پہلا ناٹک یا منظوم ڈرامہ اس لحاظ سے تسلیم

۱۔ تاریخِ ادب اُردو ، از رام بابو سکسینہ ، مترجم محمد عسکری ، ص ۵۶۲ ۔
۲۔ اُردو ڈرامہ نگاری ، از سید بادشاہ حسین ، ص ۹۳ ۔

کیا جاتا ہے کہ وہ سلیس و فصیح اُردو کی تصنیف ہے۔"[1]

ڈاکٹر محمد اسلم قریشی نے اُردو میں ڈرامے کے آغاز کے سلسلے میں "پانچواں نظریہ"[2] میں امانت کی "اندر سبھا" پر کافی بحث کی ہے اور آخر میں مسعود حسن رضوی کی رائے درج کی ہے اور اس کو صحیح اور درست تسلیم کیا ہے۔

ان آراء کے درج کرنے کا مقصد یہ تھا تاکہ یہ دکھایا جائے کہ امانت کی اندر سبھا پر کافی بحث ہوتی رہی ہے۔ اس سلسلے میں "ہماری زبان" علی گڑھ میں جو مراسلے[3] اور مضمونچے شائع ہوئے، ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) امانت کی اندر سبھا، ڈاکٹر سید محمد عقیل، یکم نومبر، ۱۹٦٦ع۔

(۲) امانت کی اندر سبھا، ڈاکٹر سید محمد عقیل، ۸ نومبر ۱۹٦٦ع۔

(۳) امانت کی اندر سبھا، ڈاکٹر عبد العلیم نامی، ۸ دسمبر ۱۹٦٦ع۔

(۴) امانت کی اندرسبھا کے بارے میں، ساغر مہدی، ۲۲ دسمبر ۱۹٦٦ع۔

(۵) امانت کی اندرسبھا کے بارے میں، عبدالرشید، ۸ جنوری ۱۹٦٧ع۔

(٦) امانت کی اندر سبھا، کوکب قدر سجاد علی مرزا، یکم فروری ۱۹٦٧ع۔

(٧) امانت کی اندرسبھا کے بارے میں، ڈاکٹر سید محمد عقیل، یکم مارچ ۱۹٦٧ع۔

(۸) امانت کی اندرسبھا کے بارے میں، ڈاکٹر سید محمد عقیل، ۸ مارچ ۱۹٦٧ع (ایک مراسلہ)۔

(۹) اُردو کا پہلا ڈرامہ، ڈاکٹر عبد العلیم نامی، یکم مئی ۱۹٦٧ع۔

ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر عبد العلیم نامی نے مسعود حسن رضوی کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا۔ باقی تمام میں کسی نہ کسی طرح سے

۱۔ اُردو ڈرامے کا ارتقاء، از عشرت رحمانی، ص ۸۵۔
۲۔ ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر، از ڈاکٹر محمد اسلم قریشی، ص ۳۱۸۔
۳۔ یہ بحث ڈاکٹر مسیح الزمان کی مرتب کردہ کتاب "اندر سبھا" پر ڈاکٹر سید محمد عقیل کے تبصرے کے بعد شروع ہوئی۔

مسعود حسن رضوی کے نظریات کی تائید کی گئی ہے اور اب مسعود حسن رضوی کی رائے ۔ ــــــ

مسعود حسن رضوی نے لکھنؤ کا عوامی اسٹیج کے مقدمے میں اپنی تحقیق کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے :

+''عام طور پر لوگ امانت کو اردو کا پہلا ڈراما نگار اور ان کی ''اندر سبھا'' کو اردو کا پہلا ڈراما سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو کا پہلا ڈرامہ لکھنے ، کھیلنے اور اردو ڈرامے کے لیے پہلا تھیٹر تعمیر کرنے کا فخر اودھ کے آخری بادشاہ سلطان عالم واجد علی شاہ کو حاصل ہے ۔''[۱]+

اس سلسلے میں محمد عمر اور الٰہی ، جنھوں نے سب سے پہلے اس غلط فہمی کو جنم دیا تھا کہ امانت کی ''اندر سبھا'' پہلا ڈرامہ ہے اور اس میں خود واجد علی شاہ اور اس کے درباریوں نے بھی پارٹ کیا تھا ، مسعود حسن رضوی کو ۹ جون ۱۹۲۷ء کو ایک خط[۲] لکھا اور مسعود حسن رضوی کے خیالات سے اتفاق کیا ۔ محمد عمر لکھتے ہیں :

'' ''اندر سبھا'' اور ''شرح اندر سبھا'' کے متعلق آپ کا مضمون رسالہ اردو بابت اپریل ۱۹۲۷ء نظر سے گزرا ۔ یہ جھگڑا مدت سے چلا آتا ہے اور غالباً آپ نے اس کا دو ٹوک فیصلہ کر دیا ہے ۔ کاش آپ اُن دنوں توجہ فرماتے جب ہمارا مضمون (اس کا گزشتہ اوراق میں تذکرہ ہو چکا ہے) شائع ہوا تھا تو شاید صورتِ حال کچھ اور ہوتی ۔''

چنانچہ مسعود حسن رضوی نے یہ ہمیشہ کے لیے طے کر دیا کہ ''اندر سبھا'' اردو کا پہلا ڈرامہ نہیں ہے تاہم وہ اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کرتے ۔ لکھتے ہیں :

'' ''اندر سبھا'' اردو کا پہلا ڈرامہ نہیں ہے لیکن اس سے اس کی تاریخی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی ۔ وہ اردو کا پہلا ڈرامہ ہے جو عوامی

۱- لکھنؤ کا عوامی اسٹیج ، ص ۱۰ ۔
۲- میرے پاس موجود ہے ۔

اسٹیج کے لیے لکھا گیا اور کھیلا گیا۔ وہ اردو کا پہلا ڈرامہ ہے جو چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔"[1]

مسعود حسن رضوی نے جس تحقیقی جانکاہی سے "اندر سبھا" کے مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر صحیح ترین اور مکمل ترین صورت میں پیش کیا، خود اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں نے اس دشوار گزار وادی کی خاک چھان کر برسوں کی محنت میں "اندر سبھا" اور اس کے مصنف کے صحیح حالات پیش کر دیے ہیں۔ اب وسیع النظر نقادوں کا کام ہے کہ ان حالات کو سامنے رکھ کر تفصیلی جائزے کے لیے قلم اُٹھائیں اور ڈرامائی ادب میں "اندر سبھا" کا صحیح مقام متعین فرمائیں۔"[2]

"اندر سبھا" کے سلسلے میں جس محنت کا ذکر مسعود حسن رضوی نے خود کیا ہے اس کی تائید کرتے ہوئے ڈاکٹر احراز نقوی رقم طراز ہیں:

★ " "اندر سبھا" پر کام ان کی برسوں کی محنتوں کا نتیجہ ہے۔ "اندر سبھا" پر تمام نسخوں کی دریافت اور اس کے بعد امانت علی اور مداری لال کی "اندر سبھا" کے تمام لٹریچر کی بازیافت! بات یہیں پہ ختم نہیں ہوتی۔ "اندر سبھا" کے اداکاروں کی تلاش میں کنویں میں بانس ڈال دیے۔ کبھی نیلم پری کی کھوج ہے تو کہیں سبز پری کے گھر کے پھیرے ہیں۔ کالا دیو گھر پر بلایا جا رہا ہے اور جو مر گئے ہیں ان کے بیٹوں پوتوں سے یا اس عہد کے بڈھوں کے حافظوں کو کھودا جا رہا ہے . . . . وہ زنانے، وہ طوائفیں کال پھک، بال کارا ان کے جلو میں بیٹھے ہیں، ان سے بے تکلف ہو رہے ہیں، ان کو بے تکلف بنا رہے ہیں تاکہ "اندسبھا" پر تحقیق مکمل ہو جائے . . . . اسی چسکے میں جناب انھوں نے "اندر سبھا" کے بڈھے رہلا اداکاروں کو جمع کرکے "اندر سبھا" کا کھیل اپنی کوٹھی میں کروا لیا۔ بیسویں صدی میں

۱۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، ص ۱۱۔

۲۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، ص ۱۳۔

بیٹھ کر ''اندر سبھا'' کا معائنہ کر لیا ۔''[1]

اس سے مسعود حسن رضوی کی تحقیقی اُپج کا بھی پتہ چلتا ہے کہ کس طرح صحیح صورتِ حال تک پہنچنے کے لیے انھوں نے ہر پہلو سے کام لیا ۔ ''لکھنؤ کا عوامی اسٹیج'' میں امانت کو عوامی اسٹیج کا بانی قرار دے کر اس کے دیگر تصنیفی سرمائے کا بھی کھوج لگایا ہے ۔ اندر سبھا کے بارے میں جن موضوعات سے بحث کی گئی ہے ان میں اندر سبھا کا سالِ تصنیف ، اندر سبھا کے قدیم ایڈیشن ، اندر سبھا کا قصہ اور ماخذ ، اندر سبھا کے مقامات ، اندر سبھا کی زبان ، اندر سبھا کے کھیل پر ایک تقابلی نظر مطالعے کی چیزیں ہیں ۔ یہ سب مسعود حسن رضوی کی محنت اور تحقیقی عرق ریزی کا ثبوت ہیں ۔ مسعود حسن رضوی اس بات کو بھی سامنے لے آئے ہیں کہ اندر سبھا امانت کا طبع زاد کھیل نہیں بلکہ مختلف ماخذوں سے لیا گیا ہے ۔ مسعود حسن رضوی نے ان ماخذوں کی بھی نشاندہی کر دی ہے ۔ آخر میں شرح اندر سبھا اور پھر اندر سبھا کا متن دیا گیا ہے ۔ ''لکھنؤ کا شاہی اسٹیج'' کی طرح ''لکھنؤ کا عوامی اسٹیج'' پر بھی انھیں کافی داد ملی ۔ صفی حیدر دانش نے ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے ۱۰ فروری ۱۹۶ ع کو جو تبصرہ[2] کیا اس میں لکھتے ہیں :

''لکھنؤ کا عوامی اسٹیج'' در اصل تتمہ ہے فاضل مصنف کی اس تصنیف کا جس کا نام ''لکھنؤ کا شاہی اسٹیج'' ہے ۔ یہ بھی ایک گرانقدر تحقیقی کارنامہ ہے ۔ یہ اردو ڈرامہ کے آغاز کے بارے میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے ۔ تحقیقی محنت اور کاوش کے اعتبار سے اس کی افادیت مسلّم ہے ۔''

اس حوالے سے ''لکھنؤ کا عوامی اسٹیج'' اردو ڈرامہ پر ایک اہم تحقیقی کام ہے ۔

اندر سبھا :

مسعود حسن رضوی نے الگ سے بھی ''اندر سبھا'' کا ایک صحیح نسخہ شائع کیا جو پہلی بار ۱۹۶۸ع میں چھپا ۔ اس میں پیش نامے اور مقدمے کے

۱۔ راہِ سراب کے تنہا مسافر ، از ڈاکٹر احراز نقوی ، مرتبہ ڈاکٹر معمولہ انصاری ، ص ۶۶ ۔

۲۔ میرے پاس موجود ہے ۔

۱۵ صفحات اور متن کے ۹۴ صفحات ہیں ۔ اس میں بھی مختصر طور پر وہی عنوانات ہیں جو ''لکھنؤ کا عوامی اسٹیج'' میں ہیں ۔ ممتاز منگلوری نے ''اندر سبھا'' کا جو نسخہ ۱۹۶۶ء میں شائع کیا اس میں ایک طویل ضمیمہ بھی شامل ہے جس میں مسعود حسن رضوی کے مباحث ''اندر سبھا'' کی زبان ، ''اندر سبھا'' کے گیتوں کی زبان ، ''اندر سبھا'' کا سالِ تصنیف ، ''اندر سبھا'' کے قدیم ایڈیشن حرف بہ حرف شامل کیے گئے ہیں ۔ ڈاکٹر مسیح الزمان نے ۱۹۷۲ء میں ''اندر سبھا'' شائع کی اور اس کے مقدمے میں مسعود حسن رضوی کے قائم کردہ نظریات سے اتفاق کیا ۔

سید وقار عظیم نے ۱۹۵۶ء میں ''اندر سبھا'' مرتب کر کے شائع کی ۔ اس بارے میں ان کی مسعود حسن رضوی سے بھی خط و کتابت ہوئی جس کا ذکر خود سید وقار عظیم نے اپنے پیش لفظ میں کیا ہے ۔ ان کے مطابق مسعود حسن رضوی نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ وہ ابھی اس کام کو شروع نہ کریں کیونکہ انھوں نے جو ایڈیشن تیار کیا ہے وہ بہت جلد شائع ہوگا اور یہ ''اندر سبھا'' کا مستند نسخہ[1] ہوگا ۔ سید وقار عظیم نے مسعود حسن رضوی کے اس مشورے پر عمل نہ کیا اور ''اندر سبھا'' چھاپ دی اور اس میں درج معلومات مسعود حسن رضوی کے ''لکھنؤ کا عوامی اسٹیج'' سے لیں اور بعض جگہ صرف لفظی تبدیلیاں کر دیں ۔ اس تفصیل کے لیے ممتاز لیاقت کی مرتبہ کتاب ''بکف چراغ دارد'' ، ص ۱۳۴ سے ۱۴۴ تک دیکھی جا سکتی ہے ۔ بہر کیف مسعود حسن رضوی نے ''اندر سبھا'' کا ایک صحیح اور مستند نسخہ شائع کیا جو امانت پر کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ بنا ۔

اردو ڈرامہ اور اسٹیج :

اردو ڈرامہ اور اسٹیج میں لکھنؤ کا شاہی اور عوامی اسٹیج دونوں شامل ہیں ۔ یہ پہلی بار ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی اور دوسری بار اضافے کے ساتھ ۱۹۶۸ء میں چھپی ۔ اس کے دونوں حصوں پر الگ الگ مطالعہ پیش کیا جا چکا ہے ۔ اس کتاب پر مسعود حسن رضوی کو ساہتیہ اکادمی کی طرف سے ۱۹۶۰ء میں

۱۔ مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں ''اندر سبھا'' کے پانچ نسخے موجود تھے ۔

پہلا انعام ملا ۔ اس سلسلے میں احتشام حسین نے جو انٹرویو لیا تھا اس کی کچھ باتیں گزشتہ اوراق میں آ چکی ہیں ۔ یہاں کتاب کی اہمیت ، مسعود حسن رضوی کے تحقیقی کار اور ڈرامے کے بارے میں انٹرویو کی کچھ باتیں درج کی جاتی ہیں :

''احتشام حسین : آپ نے اپنی تحقیقات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ؛ ''لکھنؤ کا شاہی اسٹیج'' اور ''لکھنؤ کا عوامی اسٹیج'' ۔ آپ کے خیال میں اردو ڈرامے کے ارتقاء میں ان میں سے کس کو زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔ میرا مطلب اس سٹیج سے ہے جو مغربی اثرات سے وجود میں آیا ۔
مسعود حسن رضوی : شاہی اسٹیج کی اہمیت تو ظاہر ہے کہ اردو ڈرامے کی بنیاد اسی سے پڑی اور اس کے اثر سے اردو ڈرامے کا عوامی اسٹیج ظہور میں آیا ۔ شاہی اسٹیج پر کئی ڈرامے اتنے قیمتی اور شان دار ساز و سامان کے ساتھ کھیلے گئے جو عوامی اسٹیج کو کبھی میسر نہیں ہوا ۔ لیکن عوامی اسٹیج کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں ہے ، اس لیے کہ اس نے عوام میں ڈرامہ دیکھنے کا اتنا شوق پیدا کیا کہ بہت سی ناٹک منڈلیاں بن گئیں جو اُجرت پر ڈرامے کھیلنے لگیں اور میلوں ، تہواروں اور خوشی کی تقریبوں میں ناٹک دیکھنے دکھانے کا رواج عام ہو گیا ۔ عوام کے اس بڑھتے ہوئے شوق کو دیکھ کر بمبئی کے پارسیوں نے مغربی طرز کی جدید متعدد کمپنیاں بڑے بڑے سرمائے سے قائم کیں ۔ ڈرامے کی دلچسپی میں اتنا اضافہ ہوا کہ تفریح کے سارے سامان اس کے آگے ماند پڑ گئے ۔ ان کمپنیوں نے ''اندر سبھا'' کو بھی اپنے اپنے طور پر ترتیب دے کر پیش کیا ۔ واجد علی شاہ نے اپنی جن مثنویوں کے کھیل تیار کیے تھے ان میں سے ایک مثنوی ''دریائے تعشق'' کا پلاٹ لے کر ایک کمپنی نے ڈرامہ بنایا اور اس کو ''غزالہ ماہرو عرف نیرنگِ قاف'' کے نام سے پیش کیا ۔''[1]

احتشام حسین نے اردو ڈرامہ اور اسٹیج پر ساہتیہ اکادمی کے مجلے Indian Literature میں بھی اس پر سیر حاصل مضمون لکھا اور اس کے تمام پہلوؤں کا تفصیل سے جائزہ لیا ۔ لکھتے ہیں :

۱۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب سے انٹرویو ، از احتشام حسین ، لکھنؤ ریڈیو ، نشریہ ۲۸ جون ۱۹۶۰ع ۔

"On the one hand it puts forward the claim of Wajid Ali Shah as the first Urdu dramatist instead of Amanat who followed him, on the other it clears the various misunderstandings about the composition and production of Inder Sabha which has nothing to do with the royal palace and thirdly it includes an authentic and annotated version of Inder Sabha with copious notes about its linguistic and metric peculiarities alongwith several other important and relevant informations."[۱]

اسی طرح اس اہم تحقیقی کام کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ایک تبصرہ نگار نے لکھا :

"It is very exhaustive and comprehensive work. The author has explored to my knowledge all available sources on the particular aspect of literature and has left nothing to be desired."[۲]

اس کتاب کی سب سے بڑی اہمیت یوں بنتی ہے کہ بحیثیتِ مجموعی اس نے ہمارے ڈرامے کے تشنہ اور نامکمل باب کو حتی الوسع مکمل کیا اور لمحہٴ موجود تک اردو ڈرامے کے ارتقاء پر اس قدر مستند اور تفصیلی کتاب منظرِ عام پر نہیں آئی - یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریہ ہند نے اپنے ایک خط میں انہیں لکھا :

"آپ نے سچ یہ ہے کہ تحقیق کا حق ادا کیا ہے . . . . اس مستند تحقیقی کام پر میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں ۔"[۳]

یوں یہ کتاب اردو ڈرامے کی تاریخ پر مستند بھی ہے اور اس وقت تک حرفِ آخر بھی اور اسی ایک چراغ سے چراغ جلے ہیں -

---

۱- Indian Literature, vol. 3, April - Sep. 1960. p. 123.

۲- The Hindu (weekly) Madras, 25 June 1961.

۳- یہ خط میرے پاس موجود ہے -

ناٹک بزمِ سلیمان :

امانت کی تقلید میں بہت سے ناٹک لکھے گئے جن کا ذکر مسعود حسن رضوی نے ''لکھنؤ کا عوامی اسٹیج'' میں کیا ہے ۔ ان ناٹکوں میں مداری لال کی اندر سبھا ماہِ منیر ، بھیروں سنگھ عظمت کا جشنِ پرستان اور منشی خادم حسین افسوس کا ناٹک بزمِ سلیمان خاصی اہمیت کے حامل ہیں ۔ ناٹک بزمِ سلیمان کو مسعود حسن رضوی نے اپنے تحقیقی مقدمے کے ساتھ مرتب کرکے نقوش لاہور کے اگست ۱۹۶۹ع کے شمارے میں شائع کیا (یہ ابھی تک کتابی شکل میں چھپ کر سامنے نہیں آیا) ۔

مسعود حسن رضوی نے اس ناٹک کی نقل اپنے کتب خانے میں موجود نسخے سے تیار کی اور پھر کتابت کرائی ۔ اس بارے میں لکھتے ہیں :

''یہ نسخہ اس قدر خستہ اور اور مندرس ہے اور اس کی کتابت کا انداز ایسا ہے کہ اس کو صحیح پڑھنا اور اس کے اشعار کو صحیح ترتیب سے نقل کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے ۔ میں نے بہت دیدہ ریزی کے ساتھ آنکھوں سے زیادہ دماغ سے کام لے کر پہلے اس کو خود نقل کیا ، پھر کاتب سے لکھوایا ۔''[1]

مسعود حسن رضوی نے مقدمے میں اس کی خصوصیات بھی تحریر کی ہیں اور اس کے بارے میں بعض غلط فہمیوں کو بھی دور کر دیا ہے اور افسوس کے بارے میں کافی معلومات مہیا کی ہیں ۔ اس اعتبار سے اس کی بڑی اہمیت بنتی ہے اور یہ اردو ڈرامے کے ارتقا کے سلسلے میں کافی مدد دیتا ہے ۔

ادیب اور واجد علی شاہ :

مسعود حسن رضوی کو لکھنؤ اور اس کی چیزوں سے جذباتی لگاؤ تھا اور یہی سبب واجد علی شاہ اور انیس سے ان کی دلچسپی کا ہے ۔ واجد علی شاہ کو انگریزوں نے معزول کرکے کلکتہ بھیج دیا اور اودھ پر غاصبانہ قبضہ جمانے کی خاطر اس کے خلاف پروپیگنڈہ کیا گیا ۔ اس پر عیاشی اور عیش پرستی کے سنگین الزامات لگائے گئے اور اس کی شخصیت کو مسخ کرنے کے لیے کوئی دقیقہ

۱۔ نقوش ، لاہور ، اگست ۱۹۶۹ع ، ص ۵۲ ۔

فروگذاشت نہ کیا ۔ مسعود حسن رضوی نے اپنی ریڈیائی تقریروں ، مضامین اور دیگر تحریروں سے اس علم دوست بادشاہ کے خلاف پھیلائی ہوئی زہر ناکی کے اثرات کو زائل کرنے کی کوشش کی ۔ ''لکھنؤ کا شاہی اسٹیج'' میں انھوں نے واجد علی شاہ کی ثقافتی اور کلچرل سرگرمیوں کی تفصیل بیان کی ہے اور اس کی بھرپور ادبی و فنی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے ۔

انگریزوں اور ان کے طرفداروں نے جو مہم واجد علی شاہ کی کردار کشی کے سلسلے میں چلائی ، مسعود حسن رضوی نے اپنی تحریروں سے تصویر کادوسرا رخ پیش کیا اور شاہانِ اودھ خاص طور پر واجد علی شاہ کی عوامی خدمات کا ذکر کیا ۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروق لکھتے ہیں :

''واجد علی شاہ آخری تاج دارِ اودھ میں ہر قسم کے کیڑے ڈالے گئے اور اس کے مطعون کرنے میں انگریزی حکومت کے علاوہ بعض غیر متوازن اور کم سواد مورخ بھی شامل ہوگئے ۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیے اور اُن معترضین کی قلعی کھول دی ۔''۱

مسعود حسن رضوی نے واجد علی شاہ کے بارے میں کافی عرصے سے مواد اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا ۔ ان کی عمر بھر کی تحقیق کا ماحصل ''سلطانِ عالم واجد علی شاہ ۔ ایک تاریخی مرقع'' کے نام سے ایک کتاب ان کی وفات کے دو سال بعد ۱۹۷۷ع میں میر اکاڈمی لکھنؤ نے شائع کی ۔ یہ مستند اور اہم‌ترین کتاب ہے ۔

اس سے پہلے واجد علی شاہ کے بارے میں مسعود حسن رضوی نے کئی مقالے اور مراسلے لکھے جن کی تفصیل یہ ہے :

(۱) اردو کا پہلا ڈراما نگار : ہماری زبان ، علی گڑھ ، ۲۲ جون ۱۹۶۱ع ۔

(۲) واجد علی شاہ کی ایک مناجات : نیا دور ، لکھنؤ ، اگست ۱۹۶۵ع ۔

(۳) مثنوی عشق نامہ : مصنفہ واجد علی شاہ ، ہماری زبان ، علی گڑھ ، ۱۵ جنوری ۱۹۶۶ع ۔

۱۔ ماہنامہ آج کل ، نئی دہلی ، فروری ۱۹۷۶ع ، ص ۲۲ ۔

(۴) نواب یا بادشاہ : ہماری زبان علی گڑھ ، ۸ اپریل ۱۹۶۶ع -

(۵) مدرسہ قیصریہ مٹیا برج : بنا کردہ واجد علی شاہ ، ہماری زبان ، علی گڑھ ، یکم دسمبر ۱۹۶۶ع -

(۶) سلطان واجد علی شاہ ـ انسان ، مصنف ، شاعر : مشمولہ نذر مقبول ، مرتبہ خیر بھوروی ۱۹۷۰ع -

(۷) واجد علی شاہ ـ آخری بادشاہ اودھ (انگریزی) : سووینئر اودھ کلچرل کلب لکھنؤ ، ۱۹۷۲ع -

(۸) واجد علی شاہ (انگریزی) : سووینئر لکھنؤ کلچرل ایسوسی ایشن ، ستمبر ۱۹۷۴ع -

مسعود حسن رضوی نے مواد کی فراہمی کے لیے تیس سال کا عرصہ لگایا اور وہ آخر تک اس میں ہی لگے رہے ۔ ایک مراسلے میں لکھتے ہیں :

"اودھ کے آخری فرماں روا سلطان عالم واجد علی شاہ کی نجی زندگی ، ان کے علمی و ادبی مشاغل اور ان کی سرپرستیِ علوم و فنون پر ایک کتاب لکھنے کی غرض سے میں مدت تک مواد فراہم کرتا رہا ہوں ۔ اس سلسلے میں ان کی کثیر التعداد تصنیفات و تالیفات کی تلاش اور حصول کی کوشش کرتا رہا اور ان کے مضامین و مطالب کی تفصیل لکھتا رہا ہوں ۔ اُمید ہے کہ میری زیرِ تصنیف کتاب مستقبل قریب میں آ جائے گی ۔ واجد علی شاہ کی جو کتابیں دستیاب ہو چکی ہیں اور میرے کتب خانے میں موجود ہیں ان کی فہرست ذیل میں درج کرکے اُمیدوار ہوں کہ ان کے علاوہ اور کتابیں جن صاحبوں کے علم میں ہوں وہ مہربانی کرکے ان کے نام اور پتے سے مجھ کو براہِ راست یا بذریعہ 'ہماری زبان' مطلع کرکے شکر گزار فرمائیں ۔"[۱]

فہرستِ کتب میں ۵۳ کتب درج ہیں جو ان کے اپنے کتب خانے میں موجود تھیں ۔ اس کے علاوہ ۱۳ کتابیں ایسی بھی درج ہیں جو انھوں نے پٹنہ اور کلکتہ میں ملاحظہ کیں ۔ کتاب "واجد علی شاہ" میں ماخذوں کی فہرست

۱- ہماری زبان علی گڑھ ، ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۷ع ، ص ۶ -

میں ۲۵۵ کتابوں کے حوالے ہیں ۔ اس کتاب سے پہلے ان کا ایک طویل مضمون ''سلطان واجد علی شاہ ـــ انسان ، مصنف ، شاعر'' جو ٦٦ صفحات پر مشتمل ہے ، 'نذرِ مقبول' مرتبہ خیر بہوروی میں شامل ہے ۔ اصل مضمون شروع ہونے سے پہلے مسعود حسن رضوی نے ایک چھوٹا سا نوٹ بھی لکھا ہے جس سے اس مضمون کی وجہِ تسمیہ کا علم ہوتا ہے ۔ لکھتے ہیں :

''اودھ کے آخری مظلوم بادشاہ کے خلاف غرض مند پروپیگنڈہ بازوں کے گھڑے ہوئے بے بنیاد افسانے تو آپ نے بہت سنے ہوں گے ۔ اب ادبی تحقیق کے ایک صحرا نورد کی زبان سے تھوڑی سی حقیقت بھی سن لیجیے ۔ کیا عجب ہے کہ لایعنی تصورات کا غبار چھٹ جائے اور عیاشی اور عیش پرستی کا ایک مجسمہ انسانیت اور شرافت کا پیکر نظر آنے لگے ۔ یہ مقالہ صرف ایک مختصر تعارف ہے ۔ اگر اس ستر سال کے بوڑھے ادیب کی زندگی نے وفا اور تندرستی نے رفاقت کی تو شاید کثیر المقدار تحقیقی مواد کا کوئی اور حصہ بھی منظر عام پر آ جائے ۔''[۱]

اس مضمون میں تفصیل سے واجد علی شاہ کی ولادت ، تخت نشینی ، فوجی سرگرمیاں ، شکل و شمائل ، بے تعصبی ، بادشاہ کا تصنیف و تالیف میں انہماک ، مٹیا برج میں بادشاہ کے درباری شعراء اور شعر و سخن کی صحبتیں مستند اور معاصر حوالوں سے بیان کی گئی ہیں ۔ آخر میں بادشاہ کا 'نمونہ' کلام بھی درج کر دیا گیا ہے ۔ اس تناظر میں مسعود حسن رضوی نے واجد علی شاہ کو نیک انسان ، اعلیٰ منتظم ، باہمت سپاہی ، بہترین مصنف اور اعلیٰ صلاحیتوں کا شاعر ثابت کیا ہے اور اس غلط پراپیگنڈے کے اثرات کو زائل کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزوں یا ان کے طرفداروں نے ان کے خلاف کیا ۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے آ جائے تا کہ دونوں صورتوں کے پیشِ نظر غیر جانبدار قاری خود ہی فیصلہ کر سکے ۔ مسعود حسن رضوی کے اس مضمون کے خلاف ڈاکٹر ذکی کاکوروی نے اپنی کتاب ''مطالعہ'' میں ایک مضمون لکھا ۔ اس میں وہی مخالفانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے جو واجد علی شاہ کے دوسرے معترضین کا ہے ۔ تفصیل کے لیے اس کتاب[۲] کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے ۔

۱۔ نذرِ مقبول ، مرتبہ خیر بہوروی ، ص ۲ ۔
۲۔ مطالعہ از ڈاکٹر ذکی کاکوروی ۔

اس مضمون پر صرف ایک اعتراض یہ وارد کیا جا سکتا ہے کہ اس میں واجد علی شاہ کی یک رخی تصویر دکھائی گئی ہے اور صرف محاسن بیان کیے گئے ہیں اور معائب کو رہنے دیا گیا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ مسعود حسن رضوی کا لہجہ خاصا جذباتی ہے۔ لیکن مسعود حسن رضوی نے آغاز ہی میں اپنے مقصد کی وضاحت کر دی ہے اس لیے اس اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ان کا مقصود ہی یہی ہے کہ واجد علی شاہ کی خصوصیات ہی سامنے لائی جائیں یہی وجہ ہے کہ "واجد علی شاہ" میں بھی ان کا رویہ دفاعی ہے۔ انھوں نے حالات، واقعات اور شواہد کی روشنی میں واجد علی شاہ کی زندگی اور شخصیت کا عکس پیش کر دیا ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ ابتدائی حالات، طبعی خصوصیات اور ادبی خدمات پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ مظلومی، معزولی اور جلا وطنی کے بیانات پر محیط ہے۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:

"واجد علی شاہ کی نجی زندگی اس کتاب کا موضوع ہے۔ بادشاہ نے انتظامِ مملکت میں جو اصلاحیں کیں، رعایا کی فلاح و بہبود اور ملک کی سرسبزی و خوش حالی کے لیے جو جو کام سرانجام دیے، ان کا ذکر اس کتاب کے حدود سے باہر ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں بادشاہ کے ابتدائی حالات، طبعی خصوصیات اور ادبی خدمات کا بیان ہے اور دوسرے حصے میں بادشاہ کی مظلومی، معزولی اور جلا وطنی کی داستان ہے۔ کتاب میں کوئی بات بغیر مستند حوالوں کے نہیں لکھی گئی۔ اس قید نے مصنف کے کام کو بہت دشوار اور دیر طلب بنا دیا۔ تاریخ نگار اکثر کسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر واقعات میں رنگ آمیزی اور قطع و برید کر دیتا ہے۔ اس بنا پر راقم نے تاریخی ماخذوں سے زیادہ ان غیر تاریخی ماخذوں پر اعتماد کیا ہے جن میں واقعات کا بے غرض اور بے لوث بیان ملتا ہے اور خود بادشاہ کے بیانات کثرت سے پیش کیے ہیں۔"[1]

اس کتاب میں جو ۲۷۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، واجد علی شاہ کی زندگی اور اس کی علمی و ادبی شخصیت کے علاوہ اس کی فن کی سرپرستی کی داستان بھی بیان کی گئی ہے۔ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ایسا حکمران جس

۱۔ واجد علی شاہ، ص ۲۱۔

سے رعایا خوش ہو اور جو کثیر التعداد کتابوں کا مصنف ، پہلا ڈرامہ نگار ، ہندوستانی سٹیج کا بانی اور علمِ موسیقی پر کامل دسترس رکھنے والا ہو اس پر عیش پرستی اور عیاشی کے الزامات کسی طور پر بھی نہیں سجتے ۔ واجد علی شاہ انسان تھے اور بے عیب صرف خدا کی ذات ہے ۔ ان سے بھی فطری تقاضوں کے پیشِ نظر غلطیاں ضرور سرزد ہوئی ہوں گی مگر فرنگی حیلہ بازوں اور چال سازوں نے سازش کا ایسا جال بچھایا کہ اسے بدنام کر کے معزول کر دیا اور خود اودھ پر قابض ہو گئے ۔

یہ کتاب واجد علی شاہ کی اصل زندگی کا مکمل رخ پیش کرتی ہے ۔ مقبول احمد لاری نے اس کے پیش نامہ میں صحیح لکھا ہے :

"پروفیسر مسعود حسن رضوی کی یہ تصنیف مورخانہ دانش کے بوقلموں اظہار کی حامل ہے ۔ اس میں عقیدت و محبت کے ساتھ ساتھ تحقیقی نقطۂ نظر کی آمیزش بھی ہے اور علم و فراست کی حامل نکتہ آفرینی بھی . . . اس سوانحی کتاب کو ایک ایسے درِ شہوار سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جسے مسعود صاحب اپنی آخری عمر کی غواصی میں اس سمندر کی تہ سے نکال لائے ہیں اور جسے ان کے تجربے ، محنت اور کمال کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے ۔"[1]

مسعود حسن رضوی کی یہ کتاب واقعی ان کی تحقیقی کاوشوں کا نچوڑ ہے اور اپنے موضوع پر واحد کتاب ہے جس سے واجد علی شاہ کی اصل شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے ۔

ادیب اور مرثیہ :

مسعود حسن رضوی کو مرثیوں سے جو دلچسپی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مرثیوں کی تلاش میں انھوں نے اپنی ساری زندگی صرف کر دی اور اتنا مواد جمع کر لیا کہ زندگی میں اس کو سمیٹنا ان کے لیے مشکل ہوگیا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ کی صنف میں انھوں نے کتابی شکل میں کوئی جامع کام نہیں کیا ۔ تاریخِ مرثیہ پر انھوں نے ایک کتاب کا خاکہ بنایا

۱۔ واجد علی شاہ ، ص ۱۸ ۔

تھا جو نامکمل ہے ۔ اسے ضمیمے میں شامل کر دیا گیا ہے ۔ البتہ تاریخِ مرثیہ کے سلسلے میں جو مضامین انھوں نے لکھے وہ قابلِ قدر ہیں اور تحقیق کی عمدہ مثالیں۔

اُردو مرثیے کے ساتھ ساتھ فارسی مرثیے پر بھی انھوں نے کام کیا ہے ۔ مسعود حسن رضوی کی مرثیے سے دلچسپی کے بارے میں علی جواد زیدی لکھتے ہیں :

''مسعود صاحب اب سے باسٹھ برس پہلے خاص محرم کے مہینے میں پیدا ہوئے تھے ۔ آپ کو مرثیوں سے جو خاص شغف ہے اس میں ادبی لگاؤ کے ساتھ ساتھ شاید تاریخِ پیدائش کو بھی دخل ہے ۔ مسعود صاحب نہ تو خود مرثیہ گو ہیں نہ مرثیہ خواں ، لیکن مرثیے کی تاریخ و تفسیر و تنقید پر آپ کی تحقیق حرفِ آخر کا مرتبہ رکھتی ہے۔ . . مرثیوں کی تحقیق اس لیے بھی مشکل تھی کہ پہلے اس طرف بالکل ہی توجہ نہیں کی گئی ۔ مسعود صاحب کے ایامِ شباب میں لکھنؤ میں مرثیہ ایک زندہ صنف تھا . . . پھر اس صنف کو زوال شروع ہوا اور اب تو اسے ختم ہی سمجھیے ۔ انھوں نے مرثیہ کے نایاب ذخیروں کو دستبردِ زمانہ سے محفوظ کرکے اپنے قیمتی کتب خانے میں یک جا کر لیا ہے ۔''[1]

مرثیے کی طرف ان کا رجحان کیوں ہوا؟ اس کے بارے میں خود انھوں نے جی ایم شاہ کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا :

''میری ابتدائی زندگی ایسی سوسائٹی اور ایسے گھرانے میں ہوئی جہاں علم و ادب کا ہر وقت چرچا رہتا تھا اور مرثیے کا ذوق عام تھا ۔ خاص کر کلامِ انیس نہ صرف پڑھا جاتا تھا بلکہ اکثر اوقات موضوعِ گفتگو بھی رہتا تھا ۔ میری تربیت خاص کر میری نانی صاحبہ مرحومہ کے سایۂ عاطفت میں ہوئی جو میر انیس کے ایک عزیز شاگرد میر سلامت علی کی صاحبزادی تھیں ۔ ان کے بڑے بھائی میر عبدالعلی کے تعلقات بھی میر انیس کے خاندان سے بہت گہرے تھے اور میری تعلیمی رہنمائی بہت کچھ ان کی مرہونِ منت ہے ۔ انیس جب کوئی مرثیہ شاگردوں میں تقسیم کرتے تھے تو سب سے پہلے وہ میر سلامت کو ملتا

۱ - آپ سے ملیے ، از علی جواد زیدی ، ص ۸۱ - ۸۲ -

تھا جسے نقل کرنے کے بعد وہ دوسرے شاگردوں کو دے دیتے تھے۔ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مرثیے کثیر تعداد میں میرے ان بزرگوں کے پاس موجود تھے۔ کلامِ انیس سے ذوق پیدا ہونے کے بعد میں نے خود بھی اس کا گہرا مطالعہ کیا اور ان کے کمالِ شاعری سے متاثر ہوا۔ میرے خیال میں جہاں تک اخلاق، بیانیہ اور رزمیہ شاعری کا تعلق ہے، میر انیس اپنی خصوصیات میں بے مثال ہیں اور غالباً بے مثال ہی رہیں۔ جس صنفِ سخن نے اس پائے کا شاعر پیدا کیا، اس صنف سے میری وابستگی فطری ہے۔ اس موضوع پر تحقیقی کام کرنے کی محرک ایک چیز اور بھی ہوئی اور وہ یہ ہے کہ اردو شاعری کے تمام اصناف فارسی کے اصناف سے ماخوذ ہیں اور اردو کسی صنفِ سخن میں فارسی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اردو کے پاس ایک صنفِ سخن ایسی بھی ہے جس میں فارسی شاعری اس کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتی اور وہ ہے مرثیہ۔ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے ضرورت تھی کہ فارسی مرثیے کی ابتدا اور ارتقا سے بحث کی جائے۔ چنانچہ اس موضوع پر میری مبسوط کتاب[1] عنقریب شائع ہونے والی ہے۔"[2]

مسعود حسن رضوی نے مرثیے کے سلسلے میں جو کام کیا، اس کی تفصیل تین حصوں میں یوں ہے:

(الف) فارسی مرثیہ و عزاداری:

(۱) ایران میں مرثیہ گوئی کی ابتدا و چند مرثیہ گو، مشمولہ روئداد ادارہ معارفِ اسلامیہ لاہور، ۱۹۲۸ع

(۲) قاچاری عہد میں ایران میں عزاداری، پیامِ اسلام لکھنؤ، دسمبر ۱۹۳۶ع

۱۔ مسعود حسن رضوی کے مسودات میں میں نے ایسا کوئی مسودہ نہیں دیکھا۔
۲۔ اہلِ قلم سے ملاقات۔ مسعود حسن رضوی سے گفتگو: جی ایم شاہ، لکھنؤ ریڈیو، نشریہ ۲۶ فروری ۱۹۶۷ع۔

(۳) ایران کی محترمی شبیہیں یا تعزیے ، سرفراز لکھنؤ ، اکتوبر ۱۹۳۸ع
(۴) ایران میں عزاداری اور مرثیہ گوئی ، (صفوی عہد سے پہلے) ، پیام اسلام لکھنؤ ، اکتوبر ۱۹۳۸ع ، ماہنامہ انیس لاہور ، اکتوبر ۱۹۴۹ع
(۵) مقبل اصفہانی ، پیام نو لکھنؤ ، جون ۔ جولائی ۱۹۶۵ع
(۶) ایرانیوں کا مقدس ڈراما ، نسیم بکڈپو ، لکھنؤ ۱۹۶۶ع

(ب) اردو مرثیہ :

(۱) قطب شاہی عہد کی عزاداری ، سرفراز لکھنؤ ، محرم نمبر ، ۱۹۳۶ع
(۲) سلام الفت ، سرفراز لکھنؤ ، ۱۹۳۷ع
(۳) حیدری مرثیہ گو ، نیا دور لکھنؤ ، اگست ۱۹۶۳ع
(۴) کرم علی مرثیہ گو ، تحریر نئی دہلی ، جنوری ۔ مارچ ۱۹۶۷ع
(۵) مسکین مرثیہ گو ، آج کل ، نئی دہلی ، مئی ۱۹۶۷ع
(۶) تاریخ مرثیہ کا ایک باب
عہد محمد شاہ (۱۱۳۱ھ - ۱۱۶۱ھ) ، مشمولہ ارمغان مالک، مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ، ۱۹۷۱ع
(۷) دلگیر مرثیہ گو کا مذہب اور ہندوؤں کے اسلامی نام ، نیا دور لکھنؤ ، جولائی ۱۹۷۲ع
(۸) دلی میں مرثیہ گوئی کا آخری دور ، تحریر نئی دہلی ، اکتوبر۔دسمبر ۱۹۷۳ع
(۹) نانک مرثیہ گو ، نیا دور لکھنؤ ، اپریل ۱۹۷۳ع
(۱۰) مراثی ریختہ ، تحریر نئی دہلی ، اپریل ۔ جون ۱۹۷۴ع

(ج) متفرقات :

(۱) واقعۂ کربلا اور اس کے نتائج ، ادب ، لکھنؤ ، مئی ۱۹۳۱ع
(۲) حسینی قربانی اور اس کی یادگار ، لکھنؤ ریڈیو ، نشریہ ۱۷ اگست ۱۹۴۲ع

(۳) حسینی اخلاق ، کوکب ، جولائی ۱۹۲۶ع

(۴) محمد علی شاہ بادشاہ کا ایک خواب ، پیام نو ، لکھنؤ ، جون - جولائی ۱۹۶۸ع

فارسی مرثیہ ، جیسا کہ خود انہوں نے اپنے انٹرویو میں بتایا ، ان کی تحقیق کا موضوع بن گیا ۔ ''ایران میں مرثیہ گوئی کی ابتدا اور چند مرثیہ گو'' اس سلسلے کا اہم مضمون ہے ۔ مسعود حسن رضوی ''ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور'' کے اجلاس منعقدہ ۱۰ ، ۱۱ ، ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ع میں شامل نہ ہو سکے تھے مگر مقالہ بھیج دیا تھا جو ''روئداد معارف اسلامیہ'' شائع شدہ ۱۹۳۸ع میں موجود ہے ۔ یہ مضمون ۸۳ صفحات پر محیط ہے ۔ اس مضمون میں فارسی کے صرف ان مرثیوں سے بحث کی گئی ہے جو واقعۂ کربلا اور شہادت امام حسین سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اس مضمون میں ایران میں نوحہ و ماتم کا آغاز معز الدولہ دیلمی کے عہد حکومت ۳۵۲ھ میں ثابت کیا گیا ہے اور اس کے لیے اس زمانے کی مستند معاصر تاریخوں اور دیگر اہم کتب مثلاً ابن کثیر وغیرہ سے حوالے دے کر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ دیلمی سلطنت کے اختتام تک تمام شہروں میں شیعہ محرم کے پہلے عشرے میں عزاداری کیا کرتے تھے ۔ سلجوقیوں کے عہد میں بھی عزاداری جاری رہی ۔ ایران میں مرثیہ گوئی کی بنیاد کے سلسلے میں ان کا قیاس ہے کہ اس کی بنیاد دیلمیوں کے زمانے میں پڑی ۔ اس بارے میں لکھتے ہیں :

> ''واقعات کربلا کے متعلق فارسی زبان میں سب سے قدیم نظم جو میری نظر سے گزری ہے ، وہ حکیم سنائی غزنوی کی مشہور صوفیانہ و اخلاق مثنوی حدیقۃ الحقیقہ معروف بہ حدیقۂ سنائی میں شامل ہے . . . . اس کے باب الثانی میں "ذکر الحسین'' ، ''صفۃ قتل الامیر السید الحسین بن علی'' اور ''صفۃ الکربلا'' کے عنوانوں کے تحت جو اشعار لکھے گئے ہیں ان کے مجموعے کو مرثیہ کہہ سکتے ہیں ۔''[۱]

اس بحث کے نتیجے میں وہ شیخ آذری کے کہے ہوئے مرثیے کو سب سے پہلا باقاعدہ فارسی مرثیہ قرار دیتے ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایران میں مرثیہ گوئی کا عام رواج صفویوں کے عہد حکومت میں ہوا ۔ چنانچہ

۱- روئداد معارف اسلامیہ لاہور ۱۹۳۸ع ، ص ۳۲۰ - ۳۲۱ -

صفوی عہد میں مرثیے کا تفصیل سے جائزہ پیش کیا ہے ۔ فارسی مرثیے پر یہ مقالہ تحقیقی نوعیت کا ہے اور اس سے ایران میں مرثیہ گوئی کے آغاز و ارتقاء کا پتہ چلتا ہے ۔ فارسی مرثیے کی تحقیق کے ساتھ ساتھ مسعود حسن رضوی نے ایران میں عزاداری کا بھی کھوج لگایا ہے اور اپنے مضامین میں اس کی مختلف رسوم اور رواجوں کا تذکرہ کیا ہے ۔ قاچاری عہد میں ایران میں عزاداری ، ایران کی محترمی شبیہیں یا تعزیے اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں ۔ اس موضوع پر مسعود حسن رضوی نے ایک مستقل کتاب ''ایرانیوں کا مقدس ڈراما'' لکھی جو اس موضوع کا بھرپور احاطہ کرتی ہے ۔ اس کتاب میں عزاداری ، شبیہیں اور اسی قسم کی دوسری متعلقات کے بارے میں فرانسیسی ، جرمن اور لاطینی زبانوں میں موجود معلومات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے ۔ ہندوستان میں تعزیے کا مفہوم حضرت امام حسین کے روضے کی نقل بنانا ہے ۔ ایران میں اس کا مفہوم دوسرا ہے یعنی واقعاتِ کربلا کو ڈرامے کی طرح اسٹیج پر پیش کرنا ۔ اس معنی میں تعزیہ یعنی ایرانیوں کا مقدس ڈرامہ ہی اس کا موضوع ہے ۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ ایک معتبر اور نادر دستاویز ہے اس لیے کہ اس موضوع پر پہلے کچھ بھی نہیں لکھا گیا ۔ ایران کے سفر کے دوران میں انھیں وہاں سے کئی تعزیت نامے ملے جن کے نمونے بھی انھوں نے درج کیے ہیں ۔ کتاب کے آخر میں تعزیوں کے زوال کے اسباب پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اسی طرح دیگر مضامین میں بھی عزاداری کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں ۔ ان سب میں ان کی مذہبی رواداری کا بھی پتہ چلتا ہے ۔

اردو مرثیے کے ضمن میں مسعود حسن رضوی نے بعض مرثیہ گوؤں پر مضامین بھی لکھے ہیں ۔ ان میں حیدری ، کرم علی ، مسکین ، ثالک اور دیگر شامل ہیں ۔ ان مرثیہ نگاروں کے حالات و واقعات کے علاوہ ان کے مرثیوں کا تفصیل سے ذکر کرکے مرثیے میں ان کا مقام اور مرتبہ بھی متعین کیا گیا ہے ۔ خاص طور پر دلگیر کے نام کے سلسلے میں غلط فہمیوں اور اعتراضات کو دور کر دیا گیا ہے ۔

اردو مرثیے کی تاریخ کے بارے میں مسعود حسن رضوی کے تین مضامین اہم ہیں :

(۱) تاریخِ مرثیہ کا ایک باب عہدِ محمد شاہ (۱۱۳۱ھ - ۱۱۶۱ھ) ۔

(۲) دلی میں مرثیہ گوئی کا آخری دور ۔
(۳) مراثیٔ ریختہ ۔

زمانی ترتیب کے اعتبار سے اور مرثیے کا ارتقائی جائزہ لینے کے لیے پہلے ''مراثیٔ ریختہ'' کا جائزہ لیا جائے گا ۔ پھر ''تاریخِ مرثیہ کا ایک باب'' کا مطالعہ ہوگا اور آخر میں ''دلی میں مرثیہ گوئی کا آخری دور'' پر بحث ہوگی ۔ اس طرح عہدِ قدیم سے لے کر دلی کے مرثیہ گوئی کے آخری دور کے ایک تفصیلی تجزیاتی مطالعے کے حوالے سے مرثیہ کی ارتقائی منازل سامنے آ جائیں گی ۔

مراثیٔ ریختہ کے آغاز میں مسعود حسن رضوی رقم طراز ہیں :

''راقمِ حروف کے عظیم ذخیرۂ مراثی کے نوادر میں شمالی ہند کے قدیم ترین اردو مرثیوں کا ایک کافی ضخیم مجموعہ ہے جس کے دو قلمی نسخے موجود ہیں ۔ ایک نسخہ کامل ہے ، دوسرا دونوں طرف سے ناقص ۔ کامل نسخے کا سر ورق غائب ہے اس لیے نہ اس مجموعے کا نام معلوم ہو سکا نہ اس کے مؤلف کا ۔ لیکن اس کے ایک سے زیادہ نسخوں کی موجودگی بتاتی ہے کہ یہ کسی شخص کی نجی بیاض نہیں ہے بلکہ ایک مستقل کتاب ہے ۔''[1]

مسعود حسن رضوی نے اس بیاض کو سامنے رکھ کر ، جس کا لکھنے والا محمد مراد نامی شخص ہے اور محمد شاہ کے عہد کا ہے ، مراثیٔ ریختہ پر یہ مضمون لکھا ہے ۔ اس میں مرثیوں کی تعداد ۱۵۰ ہے جن میں ۱۲۳ مرثیے اردو میں اور ۲۷ فارسی زبان میں ہیں ۔ مرثیوں کی قدامت کے بارے میں مسعود حسن رضوی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ مرثیے ریختہ کی چار مروجہ صورتوں میں ہیں ۔ ان مرثیوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں :

اس میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ یہ مرثیہ گو میر جعفر سے قدیم تر ہیں اور غالباً گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں گزرے ہیں ۔ گویا ان کے مرثیے شمالی ہند کی قدیم ترین اردو نظمیں ہیں ۔''[2]

۱- تحریر ، نئی دہلی ، اپریل تا جون ۱۹۷۱ع ، ص ۴ ۔
۲- تحریر ، نئی دہلی ، ص ۱۱ ۔

مرثیوں کی ہیئت کے بارے میں رقم طراز ہیں :

اردو کے ۱۱۳ مرثیے ، جو اس جلد میں شامل ہیں ، ان میں سے ایک مثلث ، دو مثنوی ، چھ مربع ، گیارہ مخمس اور ۹۳ قصیدے کی شکل کے ہیں ۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ اتنے مرثیوں میں مسدس ایک بھی نہیں ہے ۔''[1]

مسعود حسن رضوی نے مرثیے کے مضامین ، ان کی زبان اور رسمِ خط کے بارے میں بھی تفصیل بیان کی ہے ۔ یوں ۹۲ صفحات میں ان مرثیوں کی عمومی حیثیت پر بحث کی ہے ۔ اس کے بعد مرثیہ نگاروں کے حالات اور نمونۂ کلام دیا ہے ۔ ایسے مرثیہ نگاروں میں اصلاح ، قربان علی ، قاسم ، خادم ، سعید ، کلیم ، صادق ، محب ، ہدایت ، افضل ، عبداللہ اور غلام سرور شامل ہیں اور ان کی تعداد ۱۲ بنتی ہے ۔ ضمیمے میں مراثیٔ اصلاح درج کر دیے گئے ہیں ۔

اس طرح یہ مراثیٔ ریختہ کا ایک تحقیقی جائزہ ہے ۔ کہیں کہیں مرثیہ نگاروں کے بارے میں سرسری طور پر رائے کا اظہار کیا گیا ہے ۔

اس سلسلے کی دوسری کڑی تاریخِ مرثیہ کا ایک باب عہدِ محمد شاہ (۱۱۳۱ھ - ۱۱۶۱ھ) ہے ۔ یہ مضمون مراثیٔ ریختہ کے بعد کے دور کا مطالعہ پیش کرتا ہے ۔ مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں :

''شمالی ہند میں اردو ادب کی باقاعدہ تاریخ محمد شاہ کے عہد سے شروع کی جاتی ہے ۔ لیکن اردو کے بہت سے شاعر اس عہد سے پہلے گزر چکے تھے ۔ ان میں بیشتر شعراء مرثیہ گو تھے جن کے نام اور کلام سے ہماری ادبی تاریخ اب تک ناواقف ہے ۔ میرے کتاب خانے کے ذخیرۂ مراثی میں ان قدیم مرثیہ گویوں کے ۱۱۳ مرثیے موجود ہیں ۔ یہ مرثیے شمالی ہند میں اردو شاعری کے دورِ اول کی نمائندگی کرتے ہیں . . . . ان مرثیہ گویوں کی زبان ہندی اور فارسی کی معجونِ مرکب تھی ۔ محمد شاہی عہد کے شاعروں نے یہ مخلوط زبان ترک کر دی ۔''[2]

۱- تحریر ، نئی دہلی ، اپریل تا جون ، ۱۹۷۱ع ، ص ۱۲ ۔
۲- ارمغانِ مالک ، مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ، ص ۱۰۹ ۔

اس مضمون میں مسعود حسن رضوی نے شاہ مبارک آبرو سے اس عہد کا آغاز کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

''محمد شاہی عہد سے پیشتر کے مرثیہ گویوں کا خطاب خواص سے تھا۔ اس عہد کے مرثیہ گویوں کے مخاطب عوام ہیں ، اس لیے وہ عوامی زبان میں مرثیہ کہتے ہیں۔ یہی ان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد سے پیشتر کے مرثیوں میں بالعموم واقعاتِ کربلا کی طرف صرف اشارے ملتے ہیں۔ کسی واقعے کا اجمالی بیان بھی نہیں ملتا۔ اس عہد کے مرثیوں میں واقعات کا بیان بھی اختصار کے ساتھ کیا جانے لگا۔''[۱]

اس مضمون میں آبرو ، یک رنگ اور حاتم کے مرثیوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ محمد شاہی عہد کے جن دیگر مرثیہ نگاروں کے مختصر حالاتِ زندگی اور مرثیوں کے نمونے درج کیے گئے ہیں ، ان میں السان ، فضلی ، کرم علی ، مسکین ، حزین و غمگین (مسکین کے بھائی) خلیل ، آشمی ، ہوشدار ، ندیم ، امانی اور ظہور شامل ہیں۔ جہاں تک ان کی زبان کا تعلق ہے ، اس پر دکنی اثرات نمایاں ہیں۔

تیسری کڑی ''دہلی میں مرثیہ گوئی کا آخری دور'' ہے جو سودا اور ان کے ہم عصر مرثیہ گویوں پر مشتمل ہے۔ اس میں سودا کے مرثیوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مہربان شاگردِ سودا ، تقی ، میر تقی میر ، قائم اور سکندر کے مرثیوں کا تذکرہ ہے۔ خاتمۂ کلام میں مسعود حسن رضوی مجموعی طور پر اپنی رائے دیتے ہوئے رقمطراز ہیں :

''شمالی ہند میں اس وقت شاعری اور مرثیہ گوئی کا مرکز دہلی تھا اور مرثیہ اپنی تاریخ کے تین دوروں سے گزر چکا تھا۔ پہلا دور محمد شاہ کے عہد سے پہلے ختم ہو گیا . . . . دوسرا دور محمد شاہ کے طویل تقریباً تیس سالہ عہد کے ساتھ شروع ہوا اور اسی پر ختم ہوا . . . . مرثیہ گوئی کا تیسرا دور سودا سے شروع ہوکر دہلی کی شعری مرکزیت

۱۔ ارمغانِ مالک ، مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ، ص ۱۱۰۔

کے ساتھ ختم ہوا۔ سودا کی اصلاحی تحریک نے مرثیے میں بھی ان تمام اصول و قواعد کی پابندی لازم کر دی جو دوسرے اصنافِ سخن میں ملحوظ رکھے جاتے تھے۔ اس طرح مرثیے میں وہ ادبی شان پیدا ہو گئی جس نے ترقی کرتے کرتے انیس و دبیر کے سے فن کار پیدا کر دیے اور مرثیے کو اردو شاعری کی ایک اہم صنف بنا دیا۔''[۱]

اس طرح دیکھا جائے تو مسعود حسن رضوی نے اُردو مرثیے کی تاریخ مربوط شکل میں پیش کر دی اور یوں انیس و دبیر سے پہلے مرثیے کی روایت اور اس کی ارتقائی صورت سامنے آ گئی ہے۔ ان تینوں مضامین کو اگر کتابی شکل میں لایا جائے تو قدیم اردو مرثیے کی ایک جامع تصویر سامنے آ سکتی ہے اور مرثیے پر کام کرنے والوں کے لیے یہ مواد ایک جگہ فراہم ہو سکتا ہے۔ تحقیقی اعتبار سے اردو مرثیے پر تاریخ و ارتقاء کے حوالے سے مسعود حسن رضوی کا یہ کام خاصی اہمیت اور افادیت کا حامل ہے جو اردو مرثیے کی تحقیق و تدوین کے سلسلے میں بھرپور معلومات فراہم کرتا ہے۔

ادیب اور انیس :

انیس سے مسعود حسن رضوی کو خاص دلچسپی بلکہ عقیدت تھی۔ گزشتہ اوراق میں ان کی انیس اور مرثیے سے دلچسپی کا ذکر ہو چکا ہے۔ انیس اور دبیر کے دور سے مرثیے کا تعلق براہِ راست عوام سے ہوا اور اس طرح مرثیے کی جدید روایت کا بھی آغاز ہوا۔ انیس مسعود حسن رضوی کا خاص موضوع ہے۔ انیس ہی کے حوالے سے کہیں کہیں دبیر کا بھی ذکر ہوا ہے۔ لیکن ان کی پوری توجہ میر انیس پر ہی مرکوز رہی ہے۔ انیس پر جو کام انھوں نے کیا ہے، اس کے حوالے سے اگر یہ کہا جائے کہ انیس کی دریافت کا سہرا مسعود حسن رضوی کے سر ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ علی جواد زیدی لکھتے ہیں :

''مسعود صاحب بیسویں صدی کے ''انیسیے'' تھے۔ آپس میں لڑانے کے لیے نہیں، بلکہ وہ انیس کے کھلم کھلا طرفدار تھے اور دبیر کو ان کے مرتبے کا شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ اس معاملے میں وہ شبلی کے ہمنوا تھے۔ کسی بات میں بھی دبیر کی فوقیت تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔''[۲]

۱۔ تحریر، نئی دہلی، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۳ء، ص ۳۸۔

۲۔ نیا دور، لکھنؤ، مسعود حسن رضوی نمبر، مارچ اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۱۳۔

مولانا شبلی نعمانی نے موازنۂ انیس و دبیر لکھ کر ایک طرح انیس شناسی کی بنیاد ڈال دی تھی - مسعود حسن رضوی نے بھی شبلی کی طرح انیس شناسی کی آخری حدوں کو چھوا - انیس کے مرثیوں کی تدوین ، تحقیق ، اشاعت ، انیس اور اس کے متعلقات یہاں تک کہ مزارِ انیس کی تعمیر اور انیس صدی تقریبات کی تجویز تک میں وہ پیش پیش رہے - اس حوالے سے ان سے بڑھ کر اور کوئی انیس شناس نہیں - انیس کے سلسلے میں انھوں نے جو کام کیا ، اس میں روحِ انیس (۱۹۳۱ع) شاہکارِ انیس (۱۹۴۷ع) رزم نامۂ انیس (۱۹۵۷ع) شاعرِ اعظم انیس (۱۹۶۹ع) اسلافِ میر انیس (۱۹۷۰ع) انیسیات (۱۹۷۶ع) اور مختلف مضامین شامل ہیں - ان کاموں کے حوالے سے مسعود حسن رضوی نے انیس کو کئی منفرد رخوں سے پیش کیا - مالک رام لکھتے ہیں :

''انیس کے ہم‌عصر انیسیوں میں اور مسعود صاحب میں ایک فرق تھا - جن لوگوں نے انیس کی زندگی میں ان کی حمایت کا اعلان کیا ، انھوں نے ان کی زبان ، پڑھنے کے انداز اور مرثیے کے در و بست کو پسند کرکے ایسا کیا تھا - یہ حمایت بہت حد تک جذباتی تھی - وہ اپنی ذات تک بے شک مطمئن تھے کہ اپنے حریفوں کے مقابلے میں انیس بہتر مرثیہ گو اور مرثیہ خواں ہیں - لیکن اگر ان سے دریافت کیا جاتا کہ انیس کی عظمت کے کیا اسباب ہیں ؟ انھوں نے مرثیے کے ذریعے سے علم و ادب کی کیا خدمت کی ہے ؟ اُن کے مرثیوں کی فنی خوبیاں کیا ہیں ؟ تو یقیناً وہ ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر رہتے - مسعود صاحب نے انھی سوالوں کا جواب دیا اور یہی ان کا اپنے پیش رؤں سے ما بہ الامتیاز ہے -''[1]

شبلی نے ''موازنۂ انیس و دبیر'' میں انیس کو بہتر شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے - لکھتے ہیں :

''الفاظ میں فصاحت ، سلاست ، روانی ، بندش میں چستی اور چستی کے ساتھ بے تکلفی ، دلآویزی اور برجستگی ، لطیف اور نازک تشبیہات اور استعارات ، اصولِ بلاغت کے مراعات ــ ان تمام اوصاف میں سے کون سی

۱- ماہنامہ آج کل ، نئی دہلی ، فروری ۱۹۷۶ع ، ص ۲۴ -

چیز مرزا دبیر میں پائی جاتی ہے ۔ فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی ۔ بندش میں تعقید اور اخلاق تشبیہات اور استعارات اکثر دور از کار ، بلاغت نام کو نہیں ۔ کسی چیز یا کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں ۔ خیال آفرینی اور مضمون بندی البتہ ہے ، لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکتے ۔''[1]

گویا دوسرے لفظوں میں یہ ساری خصوصیات میر انیس میں پائی جاتی ہیں ۔ مسعود حسن رضوی نے بھی شبلی کی طرح میر انیس کے کلام کے حوالے سے اس کی عظمت کا لوہا منوایا ہے ۔ میر انیس کے مرثیوں کا جو ذخیرہ ان کے پاس تھا وہ اور کسی کے پاس نہیں ۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی میر انیس کے مرثیوں کی تلاش و جستجو ، بندوں اور مصرعوں کی ترتیب اور الفاظ کی در و بست میں گزار دی ۔ لکھنؤ کے سوز خوانوں اور مرثیہ خوانوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جس سے مسعود حسن رضوی نہ ملے ہوں ۔ یوں انیس کا صحیح کلام ترتیب دینے میں انھوں نے ساری زندگی صرف کر دی ۔ ذیل میں انیس پر ان کے کاموں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے ۔

روحِ انیس :

روحِ انیس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۱ع میں چھپا ۔ اب تک اس کے چار اور ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۔ طبع دوم (۱۹۵۶ع) طبع سوم (۱۹۶۴ع) طبع چہارم (۱۹۶۸ع) اور طبع پنجم (۱۹۷۲ع) میں سامنے آیا ۔ یہ مجموعہ میر انیس کے بہترین مرثیوں ، سلاموں اور رباعیوں کا مرقع ہے ، جو متعدد قلمی نسخوں کے باہمی تقابل کے بعد مقدمے ، فرہنگ اور حاشیوں کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے ۔ اپنی محنت اور عرق ریزی کا ذکر کرتے ہوئے دیباچے میں لکھتے ہیں :

''میر انیس کے تمام کلام کو پڑھ کر جو مرثیے ، سلام اور رباعیاں بہترین معلوم ہوئیں ، ان میں سے سات مرثیے ، پندرہ سلام اور پینتیس رباعیاں ایک جلد کے لیے منتخب کیں ۔ ایک ایک مرثیے کے جتنے جتنے قدیم اور معتبر قلمی نسخے فراہم ہو سکے ، ان کا باہمی مقابلہ کرکے ہر مرثیے کی تصحیح کی ۔''[2]

۱۔ موازنۂ انیس و دبیر ، از شبلی نعمانی ، ص ۲۵۶ ۔
۲۔ روحِ انیس ، طبع اول ، ص ۲ ۔

مقدمے میں حضرت امام حسین کی شہادت ، اشخاصِ مرثیہ ، میر انیس کے حالاتِ زندگی کے علاوہ ان کے کلام پر مختصر تبصرہ بھی کیا گیا ہے ۔ اور اس میں میر انیس کی واقعہ نگاری ، جزئیات نگاری ، منظر نگاری ، جذبات نگاری اور سیرت نگاری کے علاوہ دیگر خصوصیات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے ۔ طبع اول میں فرہنگ اور حاشیے آخر میں دیے گئے ہیں مگر طبع دوم میں انھیں ذیلی حاشیوں میں لایا گیا ہے اور فٹ نوٹ کی صورت میں لکھا گیا ہے ۔ اس سے قارئین کے لیے آسانی اور سہولت پیدا ہوگئی ہے ۔ طبع اول میں ۳۵ رباعیاں تھیں ۔ طبع سوم میں پندرہ رباعیوں کا اور اضافہ کیا گیا ہے اور طبع چہارم میں بیس رباعیاں اور شامل کی گئی ہیں ۔ اس طرح اس مجموعے میں اب رباعیوں کی تعداد ستر ہے ۔

ڈاکٹر گیان چند ''روحِ انیس'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''مرثیوں کو نہ صرف واقعات کے تاریخی تسلسل کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے ، بلکہ کمالِ شاعری اور زورِ سخن کے درجہ بدرجہ اضافے کے اعتبار سے بھی ۔''۱

روحِ انیس سے میر انیس کے حالات ، کلام ، واقعاتِ کربلا اور اس کا مکمل پس منظر ، میر انیس کے کلام پر تنقید ، انیس کے کلام میں انفرادیت کے عناصر ، انیس کے صنائع بدائع اور دیگر متعلقہ معلومات کا پتہ چلتا ہے ۔ مقدمے کے ایک حصے ''واقعاتِ کربلا اور اس کے اسباب و نتائج'' کو امامیہ مشن لکھنؤ نے الگ کتابچے کی صورت میں شائع کیا ہے ، جس سے اس کی اہمیت و افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ اس تناظر میں صحیح متن کے ساتھ میر انیس کا کلام مرتب کرکے مسعود حسن رضوی نے میر انیس کے کلام میں نئی معنویت پیدا کی ہے ۔

شاہکار انیس :

میر انیس کا ایک مرثیہ ہے : ع

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب ــ ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۱۲۹ ۔

یہ روحِ انیس میں بھی شامل ہے ۔ ''شاہکارِ انیس'' اسی بے مثال مرثیے کا شاندار مصور ایڈیشن ہے ۔ اس مرثیے کی کتابت لکھنؤ کے مشہور خطاط مرزا محمد جواد مرحوم نے کی اور یہ نہ صرف ترتیب کے اعتبار سے شاندار ہے ، بلکہ طباعت کے اعلیٰ معیار کو چھوتا ہے ۔ اس میں احتشام حسین اور مسعود حسن رضوی کے مقدمے بھی شامل ہیں جو انیس فہمی کے نئے در کھولتے ہیں ۔ مسعود حسن رضوی نے جو مقدمہ لکھا ہے ، اس میں انیس کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے ۔ اس مقدمے کے دو حصے ہیں ۔ ایک میں ابتدا سے انیس تک صنفِ مرثیہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں اس مرثیے کا تجزیہ کیا گیا ہے ۔ یہ مقدمہ انیسیات میں بھی شامل ہے ۔ مسعود حسن رضوی نے اس مرثیے کا جس ژرف نگاہی ، تنقیدی شعور اور نفسیاتی بصیرت کے ساتھ تجزیہ کیا ہے ، اس اعتبار سے اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے ۔ اس میں جو مقامات دکھائے گئے ہیں ان میں صبح کا منظر ، گرمی کی شدت کا بیان ، گھوڑے کی تعریف ، ندائے غیب یا دل کی آواز ، مراثیٔ انیس میں اخلاق تعلیم اور مراثیٔ انیس کے لیے معیارِ تنقید شامل ہیں ۔ ''شاہکارِ انیس'' صوری اور معنوی اعتبار سے واقعی ایک شاہکار ہے ۔

رزم نامۂ انیس :

''رزم نامۂ انیس'' ۱۹۵۷ع میں پہلی بار شائع ہوا ۔ یہ خود مسعود حسن رضوی کے ذہن کی پیداوار ہے ۔ اس میں بارہ سو چون بند ہیں جس میں حضرت امام حسین کی ولادت سے شہادت تک مراثیٔ انیس کے بہترین اقتباسات ترتیب دیے گئے ہیں اور ان کو اس طرح مربوط اور منظم کیا گیا ہے کہ کہیں بھی جھول نظر نہیں آتا ۔ اس کا سببِ ترتیب بتاتے ہوئے مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں :

> ''میر انیس کے مرثیوں میں رزمی عناصر کو دیکھ کر اور اُن کے شاعرانہ کمال کا اندازہ کرکے میری طرح بہتوں کو یہ تمنا ہوتی ہے کہ کاش اس شاعرِ اعظم نے کربلا کے عظیم واقعے پر ایک طویل رزمیہ نظم تصنیف کی ہوتی جو ہماری شاعری کی عظمت میں اضافہ کرتی اور جسے ہم دنیا کی عظیم رزمیہ نظموں کے مقابلے میں پیش کر سکتے ۔ میری یہی تمنا آخرکار اس کی متقاضی ہوئی کہ انیس کے مرثیوں سے

مناسب اقتباسات منتخب کرکے انھیں اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ایک مسلسل رزم نامہ وجود میں آ جائے ۔ یہ کام جتنا آسان اور سہل الحصول معلوم ہوتا تھا اُتنا ہی دشوار اور صبر آزما نکلا ۔ مناسب اقتباسات کی جستجو میں مراثیٔ انیس کے ضخیم مجلدات کا بار بار مطالعہ کرنا پڑا اور ان متفرق اقتباسات سے ایک مسلسل نظم مرتب کرنے کی کوشش میں بڑی دماغ سوزی اور دیدہ ریزی کرنا پڑی ۔"[۱]

مقدمے میں مسعود حسن رضوی نے اس کام کی مشکلات کا ذکر کیا ہے اس لیے کہ اس میں خاصی احتیاط کی ضرورت تھی تاکہ کہیں کوئی تضاد، تناقص یا عدمِ مطابقت کا احساس پیدا نہ ہو اور متفرق اجزاء اس طرح جوڑے جائیں کہ پیوند دکھائی نہ دیں ۔ اس اہم مگر دشوار کام کو مسعود حسن رضوی نے بڑی خوبی سے نبھایا ہے اور اس میں جو تسلسل، روانی، مطابقت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اس سے مسعود حسن رضوی کی ذہنی اور جسمانی محنت اور عرق ریزی کا علم ہوتا ہے ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے تبصرے سے اس کی اہمیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔ لکھتے ہیں :

"سید مسعود حسن رضوی اس وقت شاید میر انیس کے کلام کے بہترین شارح و ترجمان اور ان کی عظمت و ناموری کے عظیم ترین نقیب ہیں . . . انھوں نے انیس کے سینکڑوں مرثیوں سے چھانٹ کر ایک مسلسل اور خاصی طویل رزمیہ نظم ترتیب دی ہے . . . یہ کام اس نوک پلک کے ساتھ انجام دینا کہ نہ انیس کی عظمت پر کہیں حرف آنے پائے اور نہ کلام میں کہیں جھول پیدا ہونے پائے، آسان نہ تھا ۔ اس کی ہمت وہی کر سکتا تھا جو ایک طرف نفسیاتِ بشری کی این و آں کا رمز شناس ہو، دوسری طرف شعر و ادب کی نزاکتوں پر نظر رکھتا ہو اور تیسری طرف انیس کا حافظ ہو ۔ اور حافظ کیا معنی، یہ کہیے کہ کلامِ انیس اس کے رگ و ریشے میں بس چکا ہو ۔ یہ مرتب صاحب ٹھہرے ان ساری شرطوں کے جامع ۔۔ قدرةً ان کے ہاتھوں یہ کام اس حد کو پہنچ گیا جو اس کے پہنچنے کا حق تھا ۔ رزم نامہ اب ایک مرتب و مکمل شکل میں ہے اور اس سے جتنا کمال اصل شاعر کا نکلتا

۱۔ رزم نامۂ انیس، صفحہ ج ۔

ہے اس سے کچھ ایسا دب کر پلہ مرتب کا بھی نہیں رہتا ۔"۱

اس سے بہتر انداز میں مسعود حسن رضوی کو ان کی محنت کی داد نہیں دی جا سکتی ۔ رزم نامہ انیس کی تقلید میں خبیر لکھنوی نے رزم نامہ دبیر مرتب کیا مگر اسے رزم نامہ انیس سے کیا نسبت ہو سکتی ہے ۔ مسعود حسن رضوی نے رزم نامہ انیس اور رزم نامہ دبیر کا ایک تقابلی مطالعہ موضوعات کے اعتبار سے ترتیب دیا جو غیر مطبوعہ شکل میں ہے اور اسے ضمیمے میں شامل کر دیا گیا ہے ۔

شاعر اعظم انیس :

یہ انیس پر ۴۸ صفحات پر مشتمل مختصر کتابچہ ہے جو ۱۹۷۶ع میں یادگار انیس کمیٹی لکھنؤ نے شائع کیا ۔ اس میں میر انیس کا مختصر تعارف ہے جس میں ان کے خاندانی حالات اور ان کے مرثیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ انیس کے بارے میں شبلی نعمانی ، حالی ، امداد امام اثر ، سر تیج بہادر سپرو ، نظر لکھنوی ، پروفیسر اعجاز حسین ، کلیم الدین احمد اور حامد حسن قادری کی تحریروں سے اقتباسات بھی دیے گئے ہیں ۔ آخر میں کلام انیس کا انتخاب ہے جس میں چند رباعیاں ، چند سلاموں کے منتخب اشعار اور مرثیوں کے چند اقتباسات ہیں ۔ اس کتابچے سے عام لوگوں کو انیس کے مقام و مرتبے سے خاصی آگاہی ہوتی ہے ۔

اسلاف میر انیس :

اسلاف میر انیس ۱۹۷۱ع میں چھپی ۔ یہ کتاب مسعود حسن رضوی کی اعلیٰ تحقیقی کاوش کی مظہر ہے اور اس کا انتساب تعمیری تحقیق کے قدر شناسوں کے نام ہے اور یہ ایک استعارہ ہے اور اس سے ان محققوں پر طنز کیا گیا ہے جو خردہ گیری اور نکتہ چینی کا رویہ اپناتے ہیں اور دوسروں کے عیب اور غلطیاں نکالنے میں عمریں صرف کر دیتے ہیں ۔ اس کتاب میں میر انیس کے پردادا میر ضاحک سے لے کر میر انیس کے والد میر خلیق تک اسلاف میر انیس کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور میر ضاحک ، میر حسن ، میر احسن خلیق ،

۱۔ ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ ، اگست ۱۹۵۸ع ، ص ۵ ۔

میر احسان مخلوق اور میر مستحسن خلیق کا ذکر شامل ہے ۔ ضمیمے میں کلیاتِ میر حسن کا نادر دیباچہ بھی درج کر دیا گیا ہے ۔ یہ کتاب تحقیقی اعتبار سے خاصے کی چیز ہے اور اس حوالے سے اسلافِ انیس کے بارے میں نادر اور نایاب معلومات سامنے آ گئی ہیں اور کوئی گوشہ مخفی نہیں رہا ۔

انیسیات :

انیسیات میر انیس کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً رسائل و اخبارات میں شائع ہوتے رہے ۔ ان مضامین کی نوعیت سے انیس پر مسعود حسن رضوی کے کام کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اس میں شامل بیشتر مضامین تحقیقی ہیں البتہ کہیں کہیں تنقیدی آراء بھی نظر آ جاتی ہیں ۔ میر انیس کا مختصر تعارف ، میر انیس کی علمی استعداد ، میر انیس کی سیرت ، میر انیس کے کچھ چشم دید حالات ، میر انیس کے دو اُستاد ، میر انیس کا سفرِ حیدرآباد ، میر انیس کا سفر حیدرآباد کا روزنامچہ ، میر انیس کی بیماری ، میر انیس کی وفات ، اُردو مرثیہ ابتدا سے انیس تک ، میر انیس کے کلام میں صنعتوں کا استعمال ، میر انیس کی غزل گوئی ، میر انیس و دبیر کا تقابل ، میر انیس کے نادر خطوط اور اسی طرح کے دوسرے مضامین شامل ہیں ۔

''میر انیس کا سفرِ حیدرآباد'' اور ''میر انیس کے سفرِ حیدرآباد کا روزنامچہ'' تحقیقی اعتبار سے خاصے کی چیزیں ہیں ۔ ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسعود حسن رضوی ہر ضروری نکتے پر نظر رکھتے تھے ۔ یوں انیس فہمی اور انیس شناسی کے ضمن میں اس کتاب کے مضامین کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور 'انیسیات' اپنے موضوع پر قابلِ قدر کتاب ہے ۔

خاتمۂ کلام :

انیس پر مسعود حسن رضوی کے اس کام کے تجزیاتی مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگرچہ انیس پر انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے ، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی طرف سے انیس پر ایک جامع کتاب کی ضرورت تھی ۔ دراصل انھوں نے مواد کی فراہمی ، انیس کے مرثیوں کی تلاش اور صحیح متن کی ترتیب میں اتنا وقت صرف کر دیا کہ پھر ان میں ہمت نہ رہی کہ وہ اس سارے سرمائے کو سمیٹ سکیں ۔ پھر بھی جو کچھ سامنے آیا ہے اس کی بدولت ایک فردِ واحد کا تحقیق کی چند خصوصیات کے ساتھ اتنا کچھ کر لینا بڑے

کارنامے سے کم نہیں ۔ سید نجم الدین نقوی نے مسعود حسن رضوی کی زندگی ہی میں انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا :

"مسعود صاحب کو کیوں نہ فضیلت دی جائے کہ انھوں نے انیس پر ایمان لانے کے بعد آج تک اُسے محکم رکھا ۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آج تک اقرار باللسان ، ایقان بالقلب اور اثبات بالعمل کا ثبوت دے رہے ہیں ۔"[۱]

ڈاکٹر سلام سندیلوی اپنی کتاب "مراثیٔ انیس میں جذباتی تاویل" کے بارے میں مسعود حسن رضوی کے ایک خط کا جون ۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کو لکھا گیا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"میری نظر میں اس خط کی بڑی وقعت ہے کیونکہ یہ خط ایک ایسے شخص نے لکھا ہے جو ساری دنیا میں میر انیس کا سب سے بڑا رمز شناس ہے اور اس خط کو میں اپنی ڈی لٹ کی ڈگری سے زیادہ ارفع اور بلند تصور کرتا ہوں ۔"[۲]

اس تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیس کی دریافت اور بازیافت کے سلسلے میں مسعود حسن رضوی نے جو تحقیقی کام کیا ہے وہ لائق صد تحسین ہے اور انیسیات میں بے پناہ اضافہ ہے ۔

ادیب اور تذکرہ نگاری :

اُردو میں تذکروں کی بڑی اہمیت اور افادیت ہے ۔ قدیم تذکروں سے لے کر آبِ حیات تک جتنے بھی تذکرے لکھے گئے ان کی سوانحی ، تنقیدی اور ادبی اہمیت بنتی ہے ۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بقول :

"ادبی تاریخ و تنقید یا تحقیق و سوانح نگاری کا کوئی کام تذکروں سے بے نیاز رہ کر نہیں کیا جا سکتا ۔"[۳]

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب ــ ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۱۸۸ ۔

۲۔ نیا دور لکھنؤ ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ ۔ اپریل ۱۹۷۷ء ، ص ۶۲ ۔ ۶۳ ۔

۳۔ اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ، از ڈاکٹر فرمان فتح پوری ، ص ۹۳ ۔

اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی یہ بات درست ہے :

"بلا شبہ یہ تذکرے ہماری ادبی تاریخ کا قیمتی سرمایہ اور ہماری قدیم معاشرت اور تہذیب کی بڑی قابلِ قدر یادگاریں ہیں ۔ ان کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔"[۱]

مسعود حسن رضوی بھی تذکروں کی اہمیت کے قائل تھے اور ان کے کتب خانے میں کئی تذکرے قلمی شکل میں موجود تھے اور تذکروں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا ۔ اس کے باوجود اس مد میں انھوں نے زیادہ کام نہیں کیا بلکہ نہ ہونے کے برابر کیا ہے ۔ اول تذکرۂ نادر کو مدون کیا ۔ دوم تذکرۂ گلشنِ سخن کو مرتب کیا اور سوم جواہر سخن حصہ دوم پر نظر ثانی کی ۔ ذیل میں ان کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے ۔

تذکرۂ نادر :

ناسخ کے شاگرد مرزا کلب حسین خاں نادر غیر معمولی قابلیت کے شخص اور شاعر تھے ۔ دیوانِ غریب نادر کے مخمسوں کا ضخیم مجموعہ ہے ۔ اس کے شروع میں چند طبع زاد مخمس نعت و منقبت میں ہیں ۔ اُن کے بعد تقریباً پانچ سو شاعروں کی غزلوں کو مخمس کیا ہے اور ان سب شاعروں کے ضروری حالات مختصراً مخمسوں کی پیشانی پر لکھ دیے ہیں ۔ یہ سب شعراء نادر سے اصلاح لیتے تھے ۔ دیوانِ غریب کا ایک نسخہ مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں بھی تھا جس کو سامنے رکھ کر انھوں نے تذکرۂ نادر مدون کیا ۔ وہ خود لکھتے ہیں :

"یہ کتاب (دیوانِ غریب) کمزور کاغذ پر چھاپی گئی تھی جو اب اپنی عمر پوری کر چکا ہے ۔ حالت یہ ہو گئی ہے کہ ذرا بے احتیاطی سے ورق اُلٹا اور اس کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں رہ گیا ۔ کتاب کی یہ نازک حالت دیکھ کر اپنے اتنے بہت سے شاعروں کو گمنامی سے بچانے کی خواہش بے اختیار میرے دل میں پیدا ہوئی اور میں نے اس کو ایک تذکرے کی صورت میں مرتب کرکے تذکرۂ نادر اس کا نام رکھ دیا ۔

۱۔ شعرائے اُردو کے تذکرے ، از ڈاکٹر سید عبداللہ ، ص ۱۱۱ ۔

شاعروں کے جو حالات نادر نے لکھے ہیں وہ بے کم و کاست لے لیے گئے ہیں اور ان کے لگائے ہوئے مصرعے چھوڑ کر ہر شاعر کی ایک غزل کے مطلع و مقطع سمیت پانچ پانچ شعر لیے گئے ہیں ۔ نادر نے خود بھی بیشتر غزلوں کے صرف پانچ پانچ شعروں پر مصرعے لگائے ہیں ۔ تذکرۂ نادر میں ایسے بہت سے شاعروں کا مختصر حال اور نمونۂ کلام مل جائے گا جن کا ذکر اور کہیں نہیں ملتا ۔ بعض نامور شعراء جو غزل گو کی حیثیت سے معروف نہیں ہیں ، اُن کی غزلیں بھی اس تذکرے میں موجود ہیں ۔ مثلاً ضمیر ، خلیق ، انیس و دبیر ، انس ، مونس — یہ تذکرہ ہماری ادبی تاریخ کے ایک دور کے لیے معتبر ماخذ کا کام دے سکتا ہے ۔''[1]

مسعود حسن رضوی نے ۱۲ صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں نادر کی شاعری اور اس کی تصنیفات کا ذکر کیا گیا ہے ۔ تذکرۂ نادر کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس کی بنا پر بہت سے شاعر گوشۂ گمنامی میں جانے سے بچ گئے ۔ دوسرے مسعود حسن رضوی نے اس کی نئے سرے سے تدوین کر کے تحقیقی اعتبار سے اسے خاصے اور حوالے کی چیز بنا دیا ہے ۔ ایک تبصرہ نگار کے بقول :

''اس طور سے بہت سے شاعروں کے حالات اور کلام کو ، جن کا ذکر دوسری جگہ دستیاب نہیں ہوتا ، محفوظ کر دیا ہے ۔ اُردو شعراء کے تذکروں میں یہ ایک نادر اضافہ ہے ۔''[2]

تذکرۂ گلشنِ سخن :

مردان علی مبتلا لکھنوی کا تصنیف کردہ تذکرہ گلشنِ سخن (۱۱۰۴ھ) ، مسعود حسن رضوی نے مرتب کر کے ۱۹۶۵ع میں شائع کرایا ۔ اس تذکرے کا ایک نسخہ ان کے پاس تھا اور دوسرا نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود تھا ۔ مسعود حسن رضوی نے ''شعرائے اُردو کا ایک قدیم تذکرہ'' کے عنوان سے رسالہ ''ہمایوں'' دسمبر ۱۹۳۲ع میں ایک مضمون شائع کرا کے ، اس تذکرے کا

۱- تذکرۂ نادر ، ص ۱۶ - ۱۵ -
۲- ہماری زبان علی گڑھ ، ۱۵ فروری ۱۹۵۸ع ، ص ۱۶ -

پہلی مرتبہ تعارف کرایا ۔ مولوی عبدالحق نے ان سے اس تذکرے کو مرتب کرنے کو کہا اور نسخۂ رامپور کی ایک نقل بھی بھجوا دی ۔ مسعود حسن رضوی نے دونوں نسخوں کو سامنے رکھ کر ۱۹۶۳ع میں اسے مرتب کیا اور ۱۹۶۵ع میں انجمن ترقیٔ اُردو علی گڑھ نے اسے شائع کیا ۔

مسعود حسن رضوی نے ۱۵ سے ۴۸ صفحات پر مشتمل ایک طویل مقدمہ[1] بھی تحریر کیا ۔ گلشنِ سخن اس عہد کے دوسرے تذکروں کی طرح فارسی زبان میں ہے اور اس میں شاعروں کے حالات کم اور اُن کے کلام کا انتخاب زیادہ ہے ۔ مسعود حسن رضوی نے دونوں نسخوں کے بعض اختلافات کو بھی درج کر دیا ہے ۔ مبتلا کے بارے میں مکمل معلومات دی گئی ہیں اور اس کے کلام کا جائزہ بھی لیا گیا ہے ۔

گلشنِ سخن میں ۳۱۸ شعراء کا ذکر ملتا ہے ۔ تذکرہ نگار نے غزل کے علاوہ مثنوی ، قصیدہ اور مرثیہ کہنے والوں کا حال بھی درج کر دیا ہے جس سے اس تذکرے کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔ مسعود حسن رضوی نے اس تذکرے کو صرف مرتب کر دیا ہے حالانکہ وہ اس پوزیشن میں تھے کہ حواشی بھی لگاتے اور شعراء کے حالات و کلام کے سلسلے میں اختلافات کی نشاندہی بھی کرتے ۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی باتیں رہ گئی ہیں ۔ اس سلسلے میں مشفق خواجہ کا ایک اہم مضمون ''تذکرہ گلشنِ سخن پر ایک نظر'' سہ ماہی اُردو کراچی کے جولائی ۱۹۶۷ع کے شمارے میں چھپا ۔ اس میں متن کے غلط اندراجات کی نشاندہی کی گئی ہے ۔ اسی طرح اس کے سال تصنیف پر بھی کافی بحث موجود ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ ۱۱۹۴ھ میں نہیں بلکہ اس کے کئی سال بعد لکھا گیا ۔ مشفق خواجہ نے اسے خلیل کے تذکرے گلزارِ ابراہیم کا سرقہ قرار دیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

''جہاں تک میں نے غور کیا ہے ، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مبتلا نے گلزار ابراہیم سے سرقے کی حد تک استفادہ کیا ہے اور نہایت ہوشیاری سے گلزارِ ابراہیم کے بیانات کو اپنا لیا ہے ۔ اور شعراء کے

۱- نیا دور لکھنؤ ، ۲۶ جنوری ۱۹۶۴ع کے شمارے میں مبتلا کے بارے میں جو مضمون شائع ہوا وہ بھی شامل ہے ۔

حالات عمداً اس انداز سے لکھے ہیں کہ جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ گلزار ابراہیم کے وجود سے بالکل بے خبر ہے۔ یہاں تک کہ اس نے علی ابراہیم خلیل کے شاعرانہ وجود سے بھی انکار کر دیا ہے۔"[۱]

مشفق خواجہ نے گلشنِ سخن اور گلشنِ ابراہیم کے تقابلی مطالعے سے اپنی بات کو ثابت کیا ہے۔

مسعود حسن رضوی نے مشفق خواجہ کی اس تعمیری تنقید کو سراہا اور ۳ ستمبر ۱۹۶۷ع کو ان کے نام ایک خط میں بعض تفاصیل لکھیں۔ خاص طور پر سرقے کی حد تک استفادہ کرنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

"ایک نہایت اہم سوال یہ ہے کہ آپ نے کس بنیاد پر مبتلا کو گلزار ابراہیم کا خوشہ چیں قرار دیا ہے۔ گلزارِ ابراہیم ۱۱۹۸ھ میں اختتام کو پہنچا۔ خود مؤلف تذکرہ نے دیباچے میں لکھا ہے .... گلشنِ سخن اس سے چار سال پیشتر وجود میں آ چکا تھا۔ اس صورت میں جتنی ہم مضمون عبارتیں آپ نے دونوں تذکروں سے نقل کی ہیں ان سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گلزار ابراہیم میں گلشنِ سخن سے خوشہ چینی کی گئی ہے، نہ کہ بالعکس۔ ڈاکٹر محمد انصاراللہ نے اپنے مضمون "تذکرۂ گلشنِ سخن" شائع شدہ قومی زبان کراچی اگست ۱۹۶۹ع میں ان غلطیوں کی نشاندہی کر دی ہے جو مبتلا سے ہوئیں اور آخر میں لکھا ہے: "یہ یقینی طور پر پروفیسر صاحب کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے گلشنِ سخن کو چھاپ دیا اور اس سے اہلِ علم کو استفادے کا موقع حاصل ہوا۔"[۲]

حقیقت یہ ہے کہ مسعود حسن رضوی نے اس تذکرے پر وہ توجہ صرف نہیں کی جو اُنھیں کرنی چاہیے تھی۔ مشفق خواجہ نے حواشی کا جو مشورہ دیا ہے وہ بھی خاصا وقیع ہے۔ علاوہ ازیں مبتلا کی غلطیوں کی نشاندہی بھی ضروری تھی۔ اس کے باوجود بھی مسعود حسن رضوی کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے یہ تذکرہ چھاپ دیا۔ اب بھی اگر اس پر نظرثانی کی جائے تو یہ خاصے کی چیز

۱- رسالہ اُردو کراچی، جولائی ۱۹۶۷ع، ص ۱۳۸ -
۲- قومی زبان کراچی، اگست ۱۹۶۹ع، ص ۳۱ -

بن سکتا ہے ۔ اس حالت میں بھی ان کی محنت کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی ۔ مشفق خواجہ نے بھی اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے :

”جناب ادیب نے متن کی تیاری میں جو محنت کی ہے اس کی داد کچھ وہی دے سکتے ہیں جنھیں اس قسم کے کاموں کا تجربہ ہے ۔“[۱]

گلشن سخن پر جو اعتراضات مشفق خواجہ نے کیے ہیں ان کے لیے عطا کاکوی کی مرتب کردہ کتاب تذکرۂ گُل و گلزار مطبوعہ جولائی ۱۹۶۸ع بھی دیکھی جا سکتی ہے ۔ بہر طور گلشن سخن کو دنیائے ادب کے سامنے پیش کرنے اور اردو تذکرہ نگاری میں تحقیق کی نئی راہیں کھولنے کا سہرا مسعود حسن رضوی کے سر ہے ۔

جواہر سخن ، جلد دوم :

مولوی محمد مبین چڑیا کوٹی کا مرتب کردہ یہ تذکرہ ہندوستانی اکادمی الہ آباد نے ۱۹۳۵ع میں شائع کیا ۔ اکادمی کی ہدایات پر مسعود حسن رضوی نے اس پر نظرثانی کی ۔ حجم کے اعتبار سے یہ باقی جلدوں سے زیادہ ضخیم ہے ۔ مسعود حسن رضوی نے اس پر خاصی محنت کی ، اس کا اظہار دیباچہ میں بھی انھوں نے کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

”شعراء کے حالات و سنین وغیرہ میں مؤلف کتاب کی تحقیق پر اعتماد کرکے صرف غیر ضروری باتیں حذف کر دیں ۔ عبارت میں لفظی ترمیم کر دی ۔ بیان کی ترتیب میں ضروری تغیر کر دیا اور بعض شعراء کے خصوصیات کلام از سر نو لکھے . . . . کتاب کے مسودے میں جہاں بہت کچھ حذف کر دیا گیا ہے وہاں تھوڑا سا اضافہ بھی کیا گیا ہے ۔ حضرت میر سے مجھ کو دلی عقیدت اور ان کے کلام کی میری نظر میں جو وقعت ہے اس نے مجھے مجبور کیا کہ اس شاعر اعظم کے جو بلند پایہ اشعار نظر انداز ہو گئے ہیں انھیں انتخاب میں شامل کر دوں . . . . مگر میری کم فرصتی نے اس کا موقع نہ دیا . . . . میں نے اس کتاب پر نظرثانی کرنے میں بہت سا وقت صرف کیا اور بہت کچھ حذف و

۱- رسالہ اردو کراچی ، جولائی ۱۹٦۷ع ، ص ۱۳۴ ۔

اضافہ کیا ۔ پھر بھی یہ انتخاب ایسا نہ ہوا جیسا میرا جی چاہتا تھا ۔"[1]

اسی طرح اس دور کی خصوصیات مسعود حسن رضوی نے خود لکھی ہیں اور یہ گیارہ صفحات پر مشتمل ہیں ۔

ادیب اور لکھنویات :

لکھنؤ کے تہذیبی ، تمدنی ، سیاسی ، سماجی اور علمی و ادبی غرض کسی بھی شعبۂ حیات پر نظر ڈالیں ، اس کا اپنا ایک انداز اور اپنا ایک رنگ ڈھنگ ہے ۔ اس کے پس منظر میں وہ مزاج اور میلانِ طبع کارفرما ہے جو اودھ کے خطے میں بسنے والے لوگوں سے عبارت ہے ۔ عبدالحلیم شرر کی کتاب گزشتہ لکھنؤ اس کا بھرپور استعارہ ہے ۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں :

"اب اس ماحول کا جائزہ لیں تو یہ محض کتاب کا کام نہیں بلکہ گزشتہ لکھنؤ بلیغ اشاریہ ہے ۔ نوابوں کا لکھنؤ ، بانکوں اور خوباں کا لکھنؤ ، عزاداری اور تعزیوں کا لکھنؤ ، طوائفوں کا لکھنؤ ، مشاعروں اور بٹیروں کی پالی کا لکھنؤ ، الغرض روشن اور چمکیلا لکھنؤ اپنے معاشی اور اخلاقی تضادات سمیت واقعی ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ اور مسلم تہذیب کے بجھتے ہوئے چراغ کی آخری بھڑک ثابت ہوا ۔"[2]

مسعود حسن رضوی کو اس لکھنؤ سے عشق تھا ۔ ان کی وطن سے محبت کا تھوڑا سا ذکر باب اول میں کیا جا چکا ہے ۔ لکھنؤ سے عشق اور محبت کی وجہ سے انھیں لکھنؤ کی ہر چیز عزیز تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ انیس اور واجد علی شاہ ان کا خاص موضوع رہے ۔ مسعود حسن رضوی نے شاہانِ اودھ کی علم دوستی ، ادبی ذوق ، لکھنؤ کی تہذیبی اہمیت اور لکھنؤ کے تمدن کے کئی پہلوؤں پر قلم اُٹھایا ۔ ایک جگہ خود لکھتے ہیں :

۱۔ جواہرِ سخن ، جلد دوم ، ص ۱ ، ۲ ۔

۲۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (آٹھواں ایڈیشن) ، از ڈاکٹر سلیم اختر ، ص ۱۱۴ ۔

”مجھے لکھنؤ سے ، اُس مرحوم لکھنؤ سے جو ہمارے علوم و فنون کا سرچشمہ ، ہماری تہذیب و تمدن کا مرکز اور ہماری زبان و ادب کا ٹکسال تھا ، قلبی محبت ہے اور اس کی علمی و ادبی خدمتوں کو منظرِ عام پر لانے میں مجھے دلی مسرت ہوتی ہے ۔“[۱]

لکھنؤ کی تہذیبی اور ادبی حیثیتوں پر کافی کام ہوا ہے ۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین کی لکھنؤ کی تہذیبی میراث ، ”بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب ۔ اپنے تہذیبی پس منظر میں“ از مرزا جعفر حسین ، لکھنؤ کی لسانی خدمات از ڈاکٹر حامداللہ ندوی اور اسی قبیل کی دوسری کتابیں اس کی علمی و ادبی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں ۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی سے لکھنؤ سکول پر تفصیل سامنے آئی ۔ شاہانِ اودھ کے زمانے میں لکھنؤ کو جو عروج حاصل ہوا اور اسے جو مرکزیت حاصل ہوئی اس کی بنا پر زندگی کے ہر شعبے میں لکھنویت چھا گئی ۔ مسعود حسن رضوی نے بھی لکھنؤ کی مختلف حیثیتوں پر کئی قابلِ قدر اور معلومات افزا مضامین لکھے جن میں گزشتہ لکھنؤ اور لکھنؤ کے نقوشِ ماضی کو اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اسی سلسلے میں ڈرامہ ، واجد علی شاہ ، مرثیہ اور انیس بھی شامل ہیں ۔

لکھنویات کے سلسلے میں مضامین کی تفصیل یہ ہے :

(۱) لکھنؤ کے شاہی کتب خانے اور مطبعے (غدر سے پہلے) : ادبی دنیا ، نوروز نمبر ، ۱۹۳۲ع ۔

(۲) لکھنوی ادب کا سماجی پس منظر ۔ شاہانِ اودھ کا مذہب : ریڈیو لکھنؤ ، نشریہ ۷ ، اکتوبر ۱۹۷۱ع ۔

(اس مضمون پر نظرثانی کرکے اس کا عنوان ”اردو ادب پر شاہانِ اودھ کے مذہبی رجحانات کا اثر“ رکھا ہے) ۔

(۳) آج کل کا لکھنؤ : ریڈیو لکھنؤ ، نشریہ ۱۱ مارچ ۱۹۳۲ع ۔

(۴) لکھنوی ادب کا سماجی پس منظر ۔ واجد علی شاہ کا اثر : غیر مطبوعہ ۔

(۵) اودھ کے تفریحی مشغلوں میں ڈرامائی عناصر : نیا دور لکھنؤ ، جولائی ۱۹۵۶ع ۔

۱۔ شاعر آگرہ ، دسمبر ۱۹۴۸ع ، ص ۹ ۔

(٦) اردو ڈرامہ اور دربار اودھ : آج کل ، ڈرامہ نمبر ، جنوری ۱۹۵۹ء -

(۷) لکھنؤ میں اردو ناٹک کی ابتدا : مشمولہ گپت ابھی لندن گرلتھ ، ۱۹۶۶ء -

(۸) شہروں کی کہانی : لکھنؤ ، غیر مطبوعہ -

(۹) لکھنؤ کے نقوش ماضی : پیام نو لکھنؤ ، ۱۴ ، ۲۱ جون ۱۹۷۰ء -

(۱۰) لکھنؤ کا شاہی کتب خانہ : نیا دور لکھنؤ ، اگست ۱۹۷۰ء -

(۱۱) شاہی دسترخوان کے کھانے : لوائے ادب بمبئی ، ۱۵ اپریل ۱۹۷۴ء -

ان مضامین میں نمبر ۲ ، ۴ ، ۵ ، ٦ ، ۷ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج میں کسی نہ کسی طور پر شامل ہیں - باقی مضامین میں مسعود حسن رضوی نے لکھنؤ کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں - غدر سے پہلے لکھنؤ کے شاہی کتب خانے اور مطبعے میں مسعود حسن رضوی نے ڈاکٹر اسپرنگر کی فہرست کے بارے میں معلومات درج کی ہیں - اسی طرح لکھنؤ کے شاہی کتب خانہ میں موجود کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے -

شہروں کی کہانی :

لکھنؤ اور لکھنؤ کے نقوش ماضی میں لکھنؤ شہر کی وجہ تسمیہ اور اہل لکھنؤ کے مشاغل کا ذکر ہے - آج کل کا لکھنؤ میں گزشتہ اور موجودہ لکھنؤ کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے - یوں مسعود حسن رضوی نے لکھنؤ کی تہذیبی اور ادبی اہمیت اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے - ان مضامین سے نادر اور نایاب معلومات ملتی ہیں اور یہ سارے مضامین لکھنؤ سے مسعود حسن رضوی کی جذباتی وابستگی اور دلی لگاؤ کے بھی مظہر ہیں -

ادیب اور متفرق موضوعات :

مسعود حسن رضوی نے ان موضوعات کے علاوہ جن کا جامع تذکرہ گزشتہ اوراق میں کیا گیا ہے ، کچھ اور موضوعات پر بھی قابل قدر کام کیا ہے جو اپنی اپنی انفرادی حیثیت میں خاصی اہمیت کے حامل ہیں - ایسے متفرق کاموں میں مجالس رنگین ، فسانۂ عبرت ، اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ، فائز دہلوی اور اس کا دیوان ، دبستان اردو اور نگارشات ادیب شامل ہیں - ذیل میں مسعود حسن رضوی کے ان تحقیقی کاموں کا تفصیل سے جائزہ لیا جاتا ہے -

مجالس رنگین :

مسعود حسن رضوی نے سعادت یار خاں رنگین کی کتاب مجالس رنگین مرتب کرکے فاضلانہ مقدمے کے ساتھ ۱۹۲۹ء میں شائع کی ۔ یہ شائع شدہ نسخے سے مرتب کی گئی ہے ۔ اس سے قبل ان کا ایک مقالہ ''بیان رنگین'' ادب لکھنؤ کے نومبر ۱۹۲۹ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے ۔ اس مقالے کی سب باتیں مقدمے میں آ گئی ہیں ۔ لکھتے ہیں :

''مجالس رنگین تہذیب دلچسپ اور پر از معلومات کتاب ہے ۔ اس میں بہت سے ان شاعروں کا حال مل جاتا ہے جن کے بیان سے اکثر تذکرے خالی ہیں اور چونکہ رنگین کے تمام بیانات چشم دید ہیں اس لیے مستند بھی ہیں . . . . اس کتاب سے رنگین کے زمانے کے مذاق شعر ، اس دور کے لوگوں کی طبیعت اور اس عہد کی معاشرت کے بعض پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔''[1]

اس کتاب سے خود رنگین کے بارے میں بھی بہت سی معلومات مل جاتی ہیں ۔ کتاب کے بارے میں مسعود حسن رضوی ایک جگہ مقدمے میں لکھتے ہیں :

''مجالس رنگین یقیناً نثر کی پہلی کتاب ہے جو رنگین کے قلم سے نکلی ۔ ان کی تصنیفات کی طویل فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی نثر کی آخری کتاب بھی ہے ۔ ان کی کسی دوسری نثر کی تصنیف کا پتہ اب تک نہیں چلا ۔''[2]

مسعود حسن رضوی کا یہ بیان درست نہیں ہے ۔ ڈاکٹر صابر علی خاں[3] نے رنگین کی کئی اور نثری کتابوں اخبار رنگین ، امتحان رنگین اور تجربۂ رنگین کا ذکر کیا ہے ۔ مجالس رنگین میں مقدمے کے بعد ۷۰ صفحات کا متن ہے اور اس کے بعد رجال اور بلاد کے ناموں کا ایک مفید اشاریہ بھی ہے جو کتاب کی اہمیت کو اور بڑھا دیتا ہے ۔ مسعود حسن رضوی نے اسے مرتب کرکے عمدہ کام کیا ہے ۔

۱۔ مجالس رنگین ، مرتبہ مسعود حسن رضوی ، ص ۲ - ۱ ۔
۲۔ مجالس رنگین ، مرتبہ مسعود حسن رضوی ، ص ۴ ۔
۳۔ سعادت یار خاں رنگین ، از ڈاکٹر صابر علی خاں ، ص ۲۰۳ ۔

فسانۂ عبرت :

رجب علی بیگ سرور کی کتاب فسانۂ عبرت مسعود حسن رضوی نے مرتب کی ہے ۔ مختصر دیباچے میں سرور کی تمام تصانیف کے بارے میں ضروری معلومات درج کر دی گئی ہیں ۔ اس کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں مسعود حسن رضوی خود لکھتے ہیں :

''پہلے کے چھپے ہوئے نسخے میں سرخیاں بہت کم ہیں ۔ عبارت پاروں میں منقسم نہ تھی ۔ اوقاف کے نشانات معدوم تھے ۔ یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ کون بیان کہاں سے شروع اور کہاں پر ختم ہوتا ہے اور اکثر مقاموں پر کلام کا ربط اور عبارت کا مطلب سمجھنے میں دقت ہوتی تھی ۔ یہ سب نقائص دور کر دیے گئے ہیں ۔ بہت سے لفظ مشکوک تھے جن میں سے بعض کی قیاسی تصحیح کر دی گئی ہے اور بعض مجبوراً بجنسہ نقل کر دیے گئے ہیں ۔ بعض واقعات کی تاریخیں غلط تھیں اور بعض جگہ ہجری اور عیسوی تاریخوں میں مطابقت نہ تھی ۔ جہاں تک ممکن ہوا ان کی تصحیح و تطبیق کر دی گئی ہے ۔ کہیں کہیں ایک بیان کے دو ٹکڑوں کے بیچ میں کوئی دوسرا بیان داخل تھا ۔ اب وہ ٹکڑے یکجا کر دیے گئے ہیں اور ایسا کرنے سے ایک آدھ فقرہ جو بے ضرورت ہو گیا تھا حذف کر دیا گیا ہے ۔''[۱]

اس سے مسعود حسن رضوی کی محنت اور عرق ریزی کا پتہ چلتا ہے اور اس طرح انھوں نے فسانۂ عبرت کو جدید اور نئے طریقے سے از سرِ نو مرتب کیا ہے ۔ اس پر ڈاکٹر گیان چند نے اعتراض کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

''میرے نزدیک مرتبِ متن کا کام مصنف کے اصل الفاظ تک پہنچنا ہے ، اُنھیں مانجھنا یا چمکانا نہیں ہے ۔ اُسے مصنف کے فن کے حسن و قبح دونوں کو ہوبہو پیش کر دینا چاہیے تاکہ ہم مصنف کی ذہنی اُلجھنوں اور جذباتی ارتقاء کا صحیح اندازہ کر سکیں ۔''[۲]

۱۔ فسانۂ عبرت ، مرتبہ مسعود حسن رضوی ، ص ۸ - ۷ ۔
۲۔ مسعود حسن رضوی ادیب ۔ ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۱۵۵ ۔

یہ اعتراض مناسب ہے اور ترتیبِ متن کے سلسلے میں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا یا کم از کم حواشی میں اختلاف کو درج کر دینا چاہیے تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

"سید مسعود حسن رضوی نے محنت کرکے اسے پھر سے چھاپا۔ محنت اس معنی میں کہ اس کی نئی ترتیب و تہذیب اور حذف و ترمیم میں انھیں وقت خاصا صرف کرنا پڑا.... چھ صفحے کا دیباچہ بجائے خود دلآویز ہے۔"[۱]

قومی آواز لکھنؤ کے تبصرہ نگار لکھتے ہیں :

"اب فسانۂ عبرت ادب اور تاریخ کا ایک نادر ماخذ بن کر سامنے آیا ہے۔"[۲]

بہر طور مسعود حسن رضوی نے فسانۂ عبرت کو جدید طرز پر مرتب کرکے اسے نئی تفہیم کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

فائز دہلوی اور دیوانِ فائز :

دیوانِ فائز کی دریافت کا سہرا مسعود حسن رضوی کے سر ہے۔ آبِ حیات میں بھی اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔ مسعود حسن رضوی کو اس کا علم ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ ہوا۔ خود لکھتے ہیں :

"کوئی بیس برس ہوئے کہ فائز کا ضخیم کلیات چند روز میرے پاس رہا۔ میں نے اس کے مالک کو کچھ معاوضہ دے کر اس کا وہ حصہ نقل کر لیا جو اردو کلام پر مشتمل تھا اور پورے کلیات پر نظر ڈال کر کچھ یادداشتیں لکھ لیں اور چند ضروری اقتباس لے لیے.... کچھ زمانے کے بعد فائز کے چند رسالے دستیاب ہوئے۔ ان یادداشتوں، اقتباسوں اور رسالوں کی مدد سے میں نے فائز اور اُن کی شاعری پر ایک

۱- ہفتہ وار صدقِ جدید لکھنؤ، یکم اگست ۱۹۵۸ء۔
۲- قومی آواز لکھنؤ، ۱۳ جنوری ۱۹۵۸ء۔

مقالہ لکھا ۔"[1]

اس کے بعد انھوں نے جامعہ ملیہ کے کتب خانے میں فائز کے دیوانوں کا مطالعہ کیا اور خاصی محنت سے بعض چیزیں لکھیں ۔ لکھتے ہیں :

"فائز کے خاندان کی کڑیاں جوڑنے میں جو دقتیں پیش آئیں اور اس کے لیے جتنی محنت کرنا پڑی اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا . . . ۔ فائز کے اردو دیوان کی قرأت ، تصحیح اور تحشیہ بھی اچھا خاصا صبر آزما کام نکلا ۔ متروک اور نامانوس الفاظ کے علاوہ اس کے رسمِ خط کی بعض خصوصیتوں نے اس کا پڑھنا دشوار کر دیا تھا ۔ بڑی دیدہ ریزی اور مغز کاری کے بعد بھی چند لفظ صحیح نہیں پڑھے جا سکے ۔"[2]

مسعود حسن رضوی نے اس میں فائز پر بھرپور طریقے سے مواد فراہم کیا ہے اور فائز کی زندگی کا ہر گوشہ الھی کی تحریر سے منظرِ عام پر لائے ہیں ۔ اس اعتبار سے اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس سے فائز کے ساتھ ساتھ محرکاتِ شعری ، ہم عصر شعراء ، فائز کا عہد اور حزیں ، زٹلی ، آبرو ، حاتم اور عطا وغیرہ کے بارے میں بھی مفصل معلومات ملتی ہیں ۔

قاضی عبدالودود نے اس کتاب پر طویل تبصرہ کیا جو معاصر I میں شائع ہوا ۔ اس تبصرے میں بعض غلطیوں کی نشاندہی کی گئی تھی ۔ خاص طور پر فائز کی وفات ، فائز ولی کا ہمعصر ، حاتم اور اس طرح کے دوسرے شعراء سے فائز کے تعلقات کے بارے میں اعتراضات شامل ہیں ۔ مسعود حسن رضوی نے ان اعتراضات کو خندہ پیشانی سے قبول کیا اور ۱۹۶۵ء میں جو دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ، اس میں کئی اضافے اور ترامیم کیں ۔ مسعود حسن رضوی نے قاضی عبدالودود کے مشوروں کا اعتراف بھی کیا ہے ۔ قاضی عبدالودود کا یہ تبصرہ ان کی کتاب "عیارستان" شائع شدہ ۱۹۵۷ء میں بھی شامل ہے ۔ مگر جیسا کہ دیباچے میں انھوں نے خود لکھا ہے کہ اسے ازسرِ نو لکھا گیا ہے ۔ اس تبصرے میں قاضی عبدالودود نے ان کے اس کام کو سراہا بھی ہے ۔ لکھتے ہیں :

۱۔ فائز دہلوی اور اس کا دیوان ، مؤلفہ و مرتبہ مسعود حسن رضوی ، ص ۲ ۔
۲۔ ایضاً ، ص ۵-۴ ۔

"یہ بات بے خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس قسم کی دوسری کتابیں جو انجمن ترقیٔ اُردو نے شائع کی ہیں ، ان میں بہت کم ایسی ہیں جن کے مرتبین نے اتنی تلاش و تحقیق سے کام لیا ہے ۔ ان کا ہر دعویٰ قابلِ قبول نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے بعض بیانات پر اضافہ کیا جا سکے مگر کتاب کی ترتیب میں جو جانفشانی انھوں نے کی ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے ۔"[۱]

مسعود حسن رضوی نے فائز کو پہلا صاحبِ دیوان شاعر قرار دیا ہے ۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے ایک مضمون[۲] میں ، جو انھوں نے ۲۷ اپریل ۱۹۷۷ء کو لکھا اور جو ریڈیو پاکستان لاہور سے بعد میں نشر بھی ہوا ، مسعود حسن رضوی کے اس قیاس کو غلط قرار دیا ہے ۔

مسعود حسن رضوی نے فائز کے دیوان کی اشاعت سے شمالی ہند میں اُردو شاعری کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا ہے ۔ شمالی ہند میں اُردو شاعری کے سلسلے میں یہ ایک اہم دستاویز ہے ۔ فائز کو پہلا صاحبِ دیوان شاعر نہ بھی قرار دیا جائے تب بھی اس کتاب کے حوالے سے فائز اور دیگر ہمعصر شعراء کے بارے میں جو معلومات سامنے آئی ہیں وہ بذاتِ خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے ۔ قاضی عبدالودود جیسے محقق جو کسی کی تعریف نہیں کرتے انھوں نے بھی مسعود حسن رضوی کو اس کام پر داد دی ہے ۔ اس کتاب کے حوالے سے مسعود حسن رضوی نے ایک اہم تحقیقی کام سرانجام دیا ہے اور جس خوش اسلوبی سے ترتیب کا معیار بلند کیا ہے وہ قابلِ تقلید بھی ہے ۔

دبستانِ اردو :

یہ کتاب ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی ۔ اسے انگریزی اور دیسی مدرسوں کے چھوٹے درجوں کے لیے اصولِ تعلیم کو مدِنظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے ۔ دیباچے میں مسعود حسن رضوی نے ان مقاصد کی نشاندہی کر دی ہے جن کے تحت یہ کتاب تالیف کی گئی ہے ۔ اس میں شامل اکثر مضامین انھوں نے خود لکھے ہیں ۔ کتاب میں نظم و نثر کے ۵۴ مضامین ہیں اور ۱۳۱ صفحات پر محیط

۱۔ عیارستان ، از قاضی عبدالودود ، ص ۱ ۔
۲۔ غیرمطبوعہ مضمون میرے پاس موجود ہے ۔

ہے ۔ کتاب کے تمام اسباق آسان الفاظ اور سادہ اسلوب میں لکھے گئے ہیں ۔ مؤلف کے لکھے ہوئے مضامین کے ایک دو اقتباس دیکھیے :

''درخت بھی خدا کی ایک نعمت ہے ۔ اس سے طرح طرح کے فائدے حاصل ہوتے ہیں ۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر درخت نہ ہوتے تو ہمارا کام نہ چلتا ۔'' (ص ۷۰)

''نور جہاں کی بات چیت کا انداز بہت اچھا تھا ۔ بات کرتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں ۔ حاضر جواب ایسی تھی کہ مشکل سے مشکل بات کا فوراً جواب دیتی تھی ۔ پھر جواب بھی ایسا کہ اور لوگ سوچتے سوچتے تھک جائیں مگر ویسا جواب نہ بن پڑے ۔'' (ص ۱۱۵)

''تاج محل فنِ تعمیر کا ایک معجزہ ہے ۔ نہ زبان اس کی تعریف کر سکتی ہے نہ قلم اس کی تصویر کھینچ سکتا ہے ۔ اس عمارت کو بنے ہوئے ہوئے تین سو برس ہو چکے ہیں مگر اب بھی وہ آب و تاب ہے کہ گویا آج ہی بن کر تیار ہوئی ہے ۔ دنیا کے گوشے گوشے سے لوگ اس کی زیارت کو آتے ہیں ۔'' (ص ۱۲۸)

اسباق کے آخر میں سوال و جواب کے لیے مشقیں بھی دی گئی ہیں ۔ بچوں کے لیے لکھنا آسان نہیں مگر مسعود حسن رضوی نے ایسا سادہ اسلوب اختیار کیا ہے جو ایسے مضامین کے لیے مناسب ہے ۔

نگارشاتِ ادیب :

اس کتاب میں جو ۱۹۶۹ع میں شائع ہوئی تنقیدی اور تحقیقی دونوں طرح کے مضامین شامل ہیں ۔ بعض تنقیدی مضامین میں بھی تحقیقی عنصر زیادہ ہے ۔ مختلف موضوعات پر مشتمل مضامین میں سے بہت سے ایسے ہیں جو کسی نہ کسی طرح گزشتہ اوراق میں کی گئی گفتگو میں شامل ہیں ، تاہم دیوانِ افسوس : ایک قدیم نسخہ ، میر عشق اور اصلاحِ زبان ، شہر آشوب : ایک صنفِ سخن ایسے تحقیقی مضامین ہیں جن سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ مسعود حسن رضوی کے معیار کو مدِنظر رکھتے ہوئے مجھے یہ کتاب ہلکی نظر آتی ہے ،

بہرطور بعض مضامین کے حوالے سے جو رسائل میں ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے اور اب اس میں یک جا ہو گئے ہیں اس کی اہمیت ضرور بنتی ہے۔

مسعود حسن رضوی کا محققانہ طریقِ کار اور اسلوب :

مسعود حسن رضوی کے تحقیقی کارناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا اپنا ایک تحقیقی مزاج تھا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ مستند حوالوں اور ناقابلِ تردید دلائل سے چیز کو سامنے لایا جائے۔ نہ تو کسی کی غلطیاں نکالی جائیں اور نہ ہی کسی کی عیب جوئی کی جائے بلکہ شواہد سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے دکھا دیا جائے۔ اس اعتبار سے وہ خود بھی بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے اور نام لیے بغیر صحیح اور اصل صورتِ حال کی وضاحت کر دیتے تھے۔ جی۔ ایم۔ شاہ کے ایک سوال کے جواب میں کہ تحقیق و تدوین کے سلسلے میں کن اصولوں کو آپ لازمی قرار دیتے ہیں، مسعود حسن رضوی نے بتایا :

> ''ایک ادبی تحقیق کرنے والے کو بڑی احتیاط سے کوئی بات کہنا چاہیے۔ اس کے قلم سے نکلی ہوئی ایک غلط بات ہزاروں لاکھوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر سکتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا اصول سچائی ہونا چاہیے اور سچائی کی تلاش میں اپنے مقدور بھر کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیے۔ زود نویسی اور زیادہ نویسی کسی محقق کا طرۂ امتیاز نہیں بلکہ سب سے بڑا عیب ہے اس لیے کہ ایسی حالت میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور محقق اکثر ادھوری سچائی تک پہنچ سکتا ہے جو بیشتر حالات میں غلط بیانی سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ محقق کوئی افسانہ نویس نہیں ہوتا کہ اپنے ذہن سے باتیں گھڑتا چلا جائے، اس کی ہر بات کسی مستند ماخذ پر مبنی ہونی چاہیے۔ اس کے لیے مستند اور غیر مستند ماخذوں میں امتیاز ضروری ہے۔''[۱]

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے تحقیقی طریقِ کار کی وضاحت مسعود حسن رضوی نے یوں کی ہے :

۱- اہلِ قلم سے ملاقات : مسعود حسن رضوی سے انٹرویو، جی۔ ایم۔ شاہ، لکھنؤ ریڈیو، نشریہ ۲۶ فروری ۱۹۶۷ع۔

"میں دوسروں کی غلطیاں نکالنے اور ان کے بیانات کو غلط ثابت کرنے کے لیے دلیلیں پیش کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا ۔ میرا اصول یہ ہے کہ اپنی تحقیق کے نتائج کو ایسے معتبر حوالوں اور مضبوط دلیلوں کے ساتھ پیش کر دیا جائے جن کی رد ممکن نہ ہو اور جن سے دوسروں کی غلطیاں خود بخود واضح ہو جائیں ۔"[1]

اسی طرح مالک رام کے نام ۱۴-۱۵ دسمبر ۱۹۶۶ع کے ایک خط[2] میں اپنے تحقیقی طریق کی وضاحت یوں کی ہے :

"تحقیق کرنے والوں کے سامنے دو طریقِ کار ہیں ۔ ایک یہ کہ دوسروں کی غلطیاں نکالی جائیں اور ان کی غلط بیانیوں پر لے دے کی جائے ۔ دوسرا یہ کہ اپنی بات ایسی دلیلوں سے کہی جائے جس سے غلط بیانیوں کی خود بخود تردید ہو جائے ۔ پہلے طریقِ کار سے بیشتر لوگ مرعوب ہو جاتے ہیں اور اس قسم کی تحریروں کو بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں ۔ دوسرے طریقِ کار کی اہمیت و افادیت محسوس کرنے والے اہلِ نظر خال خال ہی ہوتے ہیں ۔ بدقسمتی سے میں نے دوسرا طریقِ کار اختیار کیا ہے جس کو تعمیری تحقیق کہنا چاہیے ۔ ادبی تحقیق اور ادبی احتساب میں بہت فرق ہے ۔ نکتہ چینی ، خردہ گیری ، رد و قدح کو بھی تعمیری تحقیق کا درجہ نہیں دیا جا سکتا لیکن جو لوگ ایسی چیزوں کو تحقیق سمجھتے ہیں ان کو اس جانفشانی و مغز کاری ، دیدہ ریزی ، تجزیہ و استدلال کے آثار نظر نہیں آتے جو تعمیری تحقیق کے عناصر ترکیبی ہیں ۔"

یوں مسعود حسن رضوی نے اپنے آپ کو تعمیری تحقیق کا نمائندہ کہا ہے اور جن خامیوں کی انھوں نے نشاندہی کی ہے وہ ان میں کہیں بھی نظر نہیں آتیں ۔ مسعود حسن رضوی نے جن تحقیقی اصولوں کا ذکر کیا ہے وہ خود بھی اس پر کاربند رہے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق کے اعلیٰ معیار پر ان کی تحریریں پورا اترتی ہیں ۔

۱- نگارشات ادیب ، ص ۱۷ ۔
۲- میرے پاس موجود ہے ۔

تحقیق کے ادق مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے بھی ان کا انداز دلکش اور اسلوبِ نگارش دلچسپ ہوتا ہے ۔ وہ اپنی تحقیقی نثر کو بوجھل نہیں بناتے بلکہ ایک طرح کی خوشگوارہت پیدا کرتے ہیں ۔ وہ اپنے تحقیقی نتائج کو محض زورِ بیان اور عقلی دلائل کے بل بوتے پر نہیں منواتے بلکہ شواہد و ماخذات کی روشنی میں ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ زیرِ بحث مسئلہ خود بخود سلجھتا چلا جاتا ہے اور یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کسی کی غلطیوں کی نشاندہی بھی کر رہے ہیں اور صحیح صورت بھی واضح کرتے جاتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحقیقی تحریروں میں بڑا وزن ہے ۔

بحیثیتِ محقق مقام و مرتبہ :

بحیثیت محقق مسعود حسن رضوی کا مقام اور مرتبہ بہت بلند ہے ۔ وہ اُردو کے سرِ فہرست محققوں میں شمار ہوتے ہیں ۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کی یہ بات صحیح ہے :

''دورِ حاضر میں ہندوستان اور پاکستان میں ان کی ٹکر کا کوئی محقق نہیں ۔''[1]

مسعود حسن رضوی کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ حد سے زیادہ محتاط تھے اور اُس وقت تک کوئی چیز سامنے نہ لاتے جب تک انھیں سو فی صد یقین نہ ہوتا کہ یہ ہر طرح سے مکمل ہے اور اس میں کوئی جھول نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا بہت کم کام سامنے آیا ہے ۔ ان کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو تصنیفات و تالیفات کے ڈھیر لگا دیتا ۔ اور پھر اُنھیں تو کہیں باہر جانے کی ضرورت بھی نہ تھی ، خود ان کے اپنے کتب خانے میں بے شمار قلمی مواد موجود تھا ۔ مگر حد درجہ احتیاط ان کے آڑے آئی ۔ اس بارے میں علی عباس حسینی کا بیان حقیقت پر مبنی ہے ۔ لکھتے ہیں :

''باریک بینی ، نفاست پسندی اور سلیقہ مندی ان کی فطرت و طبیعت ہے . . . ۔ تحقیق کے معاملے میں یہی باریک بینی اکثر دیر کا باعث ہوتی ہے ۔ ہر کام میں محقق کی خوردبین ساتھ رہتی ہے ۔ ذرا ذرا سی بات

۱۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ (چوتھا ایڈیشن) از ڈاکٹر سلام سندیلوی ، ص ۶۳۹ ۔

جو عام طور سے نظر انداز کر دی جاتی ہے ، ان کے لیے کلکتہ ، پٹنہ ، حیدر آباد اور علی گڑھ کے سفر کا بہانہ بن جاتی ہے ۔ جب تک وہ مکمل تحقیق کر کے اپنے آپ کو مطمئن نہ کر لیں گے ۔ مضمون نامکمل رہے گا ۔ سینکڑوں مکمل تحقیقی کام اب تک محض اس لیے زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکے کہ ان میں کوئی پتی مشکوک سی ہے ۔''[۱]

ڈاکٹر شارب ردولوی مسعود حسن رضوی کے اسی رویے کے بارے میں لکھتے ہیں :

''تحقیقی ذمہ داری کے سلسلے میں قاضی عبدالودود کے بعد اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب ہیں ۔ انھوں نے بھی اپنی زندگی اُردو ادب کی تحقیق کے لیے وقف کر دی ہے . . . ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تحقیق کے ساتھ تنقید کو بھی نگاہ میں رکھتے ہیں اور کسی فن پارے کو تحقیق کے ساتھ پیش کرتے ہوئے اس کی قدر و قیمت اور اس خاص عہد میں اس کے مقام کا تعین بھی کرتے ہیں ۔ تنقید و تحقیق میں یہ توازن بہت کم محققین کے یہاں نظر آتا ہے ۔''[۲]

مسعود حسن رضوی کو بہت سے نقادوں نے اپنے اپنے طور پر ان کے مختلف تحقیقی کاموں پر داد دی ہے ۔ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں :

''سید مسعود حسن رضوی نے ''اردو کا شاہی اسٹیج'' میں واجد علی شاہ پر اور ''اردو کا عوامی اسٹیج'' میں امانت پر عالمانہ تحقیق کی ۔''[۳]

سید علی جواد زیدی نے ''اُردو تحقیق کے چند سنگِ میل اور ستون'' میں مسعود حسن رضوی کے تحقیقی کارناموں کا تفصیل سے جائزہ لیا ۔ لکھتے ہیں :

''جہاں تک تحقیق کے میدان میں رہنمائی کا تعلق ہے ، ہمارے سامنے ہندوستان میں چار محققین کے نام بیک وقت آ گئے ہیں : قاضی عبدالودود ،

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب ــ ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۲۸ ۔
۲۔ جدید اردو تنقید ، از ڈاکٹر شارب ردولوی ، ص ۴۲۹ - ۴۳۰ ۔
۳۔ ماہنامہ آجکل نئی دہلی ، اردو نمبر ، اگست ۱۹۶۸ء ، ص ۱۸ ۔

مالک رام ، امتیاز علی عرشی ، سید مسعود حسن رضوی ادیب . . .
مسعود حسن رضوی کی تحقیق کا محور لکھنؤ ہے ۔ اگرچہ مرثیوں اور انیس ہی کو ان کی اہم ترین تحقیق کا موضوع ہونا چاہیے تھا ۔ لیکن ابھی تک جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں اردو ڈرامہ اور اسٹیج ان کا بڑا کارنامہ ہے ۔ اس میں انھوں نے وسعتِ مطالعہ اور دقتِ نظر کا ثبوت دیا ہے . . . ۔ مسعود صاحب کی تحقیق میں پھیلاؤ اور وسعت ہے اور وہ تحقیق کے ساتھ ہی قدیم طرز کے اصلاحی نقدِ ادب پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں . . . ۔ مسعود صاحب ہمارے اُن محققین میں ہیں جن کا اثر ان کی زندگی ہی میں محسوس کیا جانے لگا ہے ۔''[1]

اور واقعی یہ درست ہے کہ مسعود حسن رضوی کی زندگی ہی میں اُنھیں وہ مقام مل گیا جس کے وہ بجا طور پر مستحق بھی تھے ۔ مظفر علی سید نے اپنے مضمون ''اُردو ادب اور تحقیق'' میں ان کے بارے میں صحیح تجزیہ پیش کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

''ان کے ہاں خوردہ گیری اور تفصیل پرستی کے رجحانات بھی نہیں ملتے ، بلکہ وہ تو رد و قدح کے کام سے کوئی دلچسپی رکھتے نظر نہیں آتے ۔ آج سے کوئی تیس پینتیس برس پہلے جب اندر سبھا کے بارے میں بحث چل رہی تھی تو انھوں نے چپکے سے امانت کی لکھی ہوئی ایک ایسی نثری تحریر پیش کر دی جس سے سارا قضیہ از خود صاف ہوگیا ۔ یہی مزاج اور دستاویزی انداز اُن کی مرتب کی ہوئی کتابوں میں ملتا ہے ۔ اور ان کے مضامین کی سنجیدگی اور متانت کا ایک خراب پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ ان کے نام اور کام سے بالعموم بے توجہی برتی جاتی ہے ۔''[2]

اس کی وجہ مسعود حسن رضوی کی اپنی طبیعت اور مزاج ہے کہ وہ چپکے چپکے کام میں لگے رہتے ہیں اور کسی صلے کی پرواہ نہیں کرتے ۔ اس تناظر میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسعود حسن رضوی ایک محتاط محقق ، اعلیٰ تحقیقی

۱۔ ماہنامہ آجکل نئی دہلی ، اردو تحقیق نمبر ، اگست ۱۹۶۷ع ، ص ۶۳ - ۶۷۔
۲۔ نقوش ، اگست ۱۹۶۰ع ، ص ۲۳۹ ۔

مزاج رکھنے والے اور اردو تحقیق کے اہم ترین سنگ میل اور ستون ہیں۔ ان کے معیار تحقیق پر ان کے سوا کوئی اور پورا اُترتا دکھائی نہیں دیتا اور یہی ایک منفرد اور بڑے محقق کی پہچان اور شناخت ہے جو انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز اور ممیز کرتی ہے۔ مسعود حسن رضوی نے تحقیق کی مد میں جو کام کیے ہیں اور جس طرح قلمی نوادرات کو منظر عام پر لائے ہیں ان کے مطالعے سے ان کی اہمیت اور واضح ہوتی ہے اور مسعود حسن رضوی کے مقام و مرتبہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے تعمیری تحقیق کی جو روایت قائم کی ہے آج کی موجودہ تحقیق ان کے دکھائے ہوئے راستوں پر چل رہی ہے۔ ان کے تحقیقی کارناموں کی بدولت انھیں تحقیق کا معمار اعظم اور تعمیری تحقیق کے دبستان کا بانی قرار دیا جا سکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

پانچواں باب

ادبی شخصیت کا تنوّع

نقاد اور محقق کے علاوہ مسعود حسن رضوی متنوع ادبی شخصیت کے حامل تھے۔ وہ استاد بھی تھے اور ماہرِ قواعد زبان بھی، وہ تبصرہ نگار بھی تھے اور دیباچہ نگار بھی، مراسلہ نگار بھی تھے اور مکتوب نگار بھی، شاعر بھی تھے اور مترجم بھی، انگریزی مضمون نگار بھی تھے اور مدیر بھی۔ ان تمام شعبوں میں ان کی خدمات ایسی ہیں جنھیں کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ان کی مختلف حیثیتوں کا ترتیب وار جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس کی ترتیب کچھ یوں ہے:

۱- بحیثیتِ اُستاد۔

۲- بحیثیتِ ماہرِ قواعدِ زبان۔

۳- بحیثیتِ تبصرہ نگار و دیباچہ نگار۔

۴- بحیثیتِ مکتوب نگار۔

۵- بحیثیتِ مترجم۔

۶- بحیثیتِ شاعر۔

۱۔ بحیثیتِ اُستاد

مسعود حسن رضوی ۱۹۲۲ء میں ایل۔ ٹی کی سند حاصل کرنے کے بعد جولائی ۱۹۲۲ء ہی میں گورنمنٹ ہائی اسکول فتح گڑھ میں ٹیچر مقرر ہوئے اور چالیس دن تک ٹیچری کی اور پھر اسی سال لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے جونیئر لیکچرر کی اسامی پر ان کی تقرری ہوئی اور ۳۲ برس تک لکھنؤ یونیورسٹی میں درس و تدریس کے پیشے سے منسلک رہنے کے بعد ۱۵ جون ۱۹۵۴ء کو ریٹائر ہوئے۔ معلمی کے اس طویل ترین دور میں وہ جونیئر لیکچرر سے صدر

شعبۂ اردو و فارسی کے عہدے تک پہنچے اور بی ۔ اے و ایم ۔ اے کی کلاسوں کو اردو و فارسی کی تعلیم دی ۔ اس دورانیے میں ان کی شاگردی میں کئی نسلیں آئیں ۔ ان کے شاگردوں میں بعض نے ان کی زندگی ہی میں ادبی کام کے حوالے سے بڑا نام کمایا ۔ کچھ لوگ ان کے ماتحت رہے اور یوں ان کی علمی و ادبی تربیت مسعود حسن رضوی کے زیرِ سایہ ہوئی ۔ خود ان کے دو بیٹوں ڈاکٹر اختر مسعود رضوی اور ڈاکٹر نیر مسعود رضوی نے تحقیقی کام کیے ۔ خاص طور پر ڈاکٹر نیر مسعود ان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں ۔ اس پس منظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایسے خوش بخت اساتذہ میں شامل ہیں ، جن کے سامنے ان کے گلستان میں پرورش پانے والے پودے پروان چڑھے اور قد آور درخت بنے ۔ مسعود حسن رضوی کے ایسے شاگردوں میں سید وقار عظیم ، ڈاکٹر عبادت بریلوی ، وزیرالحسن عابدی ، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ، ڈاکٹر نذیر احمد ، ڈاکٹر محمد حسن ، علی جواد زیدی ، ڈاکٹر نسیم قریشی ، پروفیسر مشرف انصاری اور کئی معروف ادیب و نقاد شامل ہیں ۔

مسعود حسن رضوی کے تحقیقی و تنقیدی ورثے کو سامنے رکھتے ہوئے بات کی جائے تو یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ اردو کے ہر طالب علم نے ان کی تصانیف سے استفادہ کرکے اپنے علم میں اضافہ کیا اور یہ سلسلہ جاری و ساری ہے ۔ یہاں زیادہ تفصیل سے مسعود حسن رضوی کے درس و تدریس کے انداز ، ان کے شاگردوں کے تاثرات اور کلاس میں ان کے رویوں کے علاوہ اس کے متعلق دیگر امور کے بارے میں لکھا جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ مسعود حسن رضوی سے اکتسابِ فیض کرنے والوں کا بھی تذکرہ ہوگا ۔

علی عباس حسینی نے مسعود حسن رضوی کے بارے میں بڑی خوبصورت بات کہی ہے :

> ''معلم ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ بڑے بڑے درجوں کو قابو میں رکھنے میں کامیاب ہوئے ۔''[1]

مسعود حسن رضوی کو اپنے شاگردوں سے بڑی محبت تھی ۔ ڈاکٹر اختر مسعود رضوی اس سلسلے میں دو روایتیں بیان کرتے ہیں ۔ وہ بتاتے ہیں :

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب ۔ ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۵۲ ۔

''ایک دفعہ ابا ٹہل رہے تھے اور ٹہلتے ہوئے مجھ سے باتیں کر رہے تھے ۔ اچانک وہ خاموش ہوگئے اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے ۔ ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا ۔ میں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا نذیر احمد کا خط ہے اور وہ سخت بیمار ہے ۔ اسی طرح ان کے ایک شاگرد کا دماغ خراب ہو گیا اور وہ پاگل ہوگیا ۔ ابا اُسے گھر لے آئے اور جب تک وہ تندرست نہ ہوا ، اُسے اپنے گھر پر ہی رکھا ۔''

مسعود حسن رضوی بی ۔ اے اور ایم ۔ اے کو اردو اور فارسی پڑھاتے تھے ۔ اُس زمانے میں فارسی انگریزی میں پڑھائی جاتی تھی ۔ ان کے کاغذات میں جابجا ایسی تحریریں ملتی ہیں ، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کلاسیکی ادب مثلاً اخلاقِ ناصری ، غزلیاتِ حافظ ، قصائدِ خاقانی ، وقائع نعمت خاں عالی اور عرفی کی تخلیقات کے فارسی الفاظ و فقرات کے انگریزی میں معنی اور متبادل الفاظ نوٹ کرتے رہتے تھے ، تا کہ درس دیتے وقت کلاسیکی فارسی ادب کی صحیح اور لفظ بہ لفظ تشریح کر سکیں اور طالب علموں پر مفاہیم کی ہر سطح واضح ہو جائے۔ اسی طرح تاریخ و ادبیاتِ فارسی کے نوٹس لکھوانے کے لیے انھوں نے خود کئی جلدوں میں انگریزی زبان میں نوٹس تیار کر رکھے تھے ، جو بجائے خود فارسی ادب کی تاریخ و تنقید کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ درس و تدریس کے بارے میں ان کے ایک شاگرد ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں :

''اُستادِ مکرم کو شعر فہمی میں عجیب ملکہ حاصل تھا ۔ بی ۔ اے آنرز میں غزلیاتِ عرفی اُن سے پڑھنے کا موقع ملا ۔ وہ عرفی کے اشعار کی جس طرح تشریح کرتے اس سے اس شاعر کا فکر و فن پوری طرح روشن ہو جاتا ۔ ان کا طرزِ بیان نہایت روشن ، واضح اور عالمانہ ہوتا ۔ دورانِ گفتگو میں مختلف ادبی و شعری اصطلاحات کے دقیق فرق کو جس خوبی سے بیان کرتے وہ انھیں کا حصہ ہے ۔ اگر ان کے لیکچر کو ہو بہو قلمبند کیا جاتا تو ایک اعلیٰ درجے کی کتاب تیار ہو جاتی ۔ ان کی کتاب ''ہماری شاعری'' کی ساری خوبیاں ان کے لیکچر سے واضح ہو جاتی تھیں ۔ نثر کے مطالب دل نشیں انداز میں بیان کرنے میں کم لوگوں کو ان کی طرح پایا ۔ میں نے بی ۔ اے آنرز میں کاظم زادہ کی معروف کتاب ''رہبر نژادِ نو'' ان سے پڑھی ۔ اس کتاب کے سلسلے میں ان کے بتائے ہوئے نکات آج تک ذہن نشین ہیں ۔ پروفیسر مسعود

حسن رضوی نے اس کتاب کو پڑھانے کا حق ادا کر دیا تھا۔"[۱]

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی اس سلسلے میں بتاتے ہیں :

"میں نے عرفی کی غزلیں ان سے پڑھیں۔ ایک ایک شعر سمجھا کر معانی بتاتے تھے جس سے طالب علموں کا مذاقِ شعری بھی ترقی کرتا تھا۔"[۲]

مسعود حسن رضوی کی شعر فہمی کے بارے میں ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں :

"۱۹۵۷ع سے ۱۹۵۹ع تک یوسف حسین موسوی کا شاگرد رہا۔ ایک بار وہ کلاس میں سلمان ساوجی کا ایک قصیدہ پڑھا رہے تھے۔ ایک شعر کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لیے میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے اس کا مطلب واضح کر دیا، مگر مطلب بتانے کے بعد غالباً ان کے دماغ میں اس شعر کے سلسلے میں کوئی نیا نکتہ پیدا ہوا، اس لیے انھوں نے مجھے خط لکھ کر بلایا جو ۲۰ مارچ ۱۹۵۸ع کو مجھے لکھا۔ اس خط کی آخری سطر ملاحظہ ہو: "صرف سلمان کے ایک شعر کے بارے میں ایک بات کہنا ہے"۔ جب میں فارسی میں ایم۔ اے کر رہا تھا، اس وقت ایک بار پھر ایسا واقعہ پیش آیا۔ میں پروفیسر صاحب سے عرفی کی ایک غزل پڑھ رہا تھا۔ غزل پڑھنے کے بعد میں اپنے گھر چلا آیا۔ پروفیسرصاحب نے اپنے نوکر کے ذریعے مجھے بلوا بھیجا۔ میں اُسی وقت مرزا صاحب (مسعود صاحب کا نوکر) کے ساتھ ادبستان چل پڑا۔ وہاں پروفیسر صاحب میرے منتظر تھے۔ انھوں نے فرمایا "عرفی کے اس شعر کا مطلب اُس وقت میں بخوبی واضح نہیں کر سکا تھا۔ آپ کے جانے کے بعد میرے ذہن میں کچھ نئی باتیں آئیں اس لیے میں نے آپ کو زحمت دی۔"[۳]

غرض مسعود حسن رضوی پڑھاتے ہوئے ہر نکتہ بیان کرتے تھے اور بعد

۱۔ مسعود حسن رضوی۔ ذات و صفات، مرتبہ سالک رام، ص ۷۶ - ۷۷ -
۲۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی سے گفتگو (ریکارڈنگ) لکھنؤ، ۲۸ مئی ۱۹۷۹ع -
۳۔ نیا دور لکھنؤ، مسعود حسن رضوی نمبر، مارچ - اپریل ۱۹۷۷ع، ص ۵۶ -

میں بھی وہ اس بارے میں سوچتے رہتے تھے اور جب کوئی نیا لکتہ سامنے آتا ، اُسے بلا جھجک بیان کر دیتے تھے ۔ ان کے پڑھانے کا انداز نہایت دلآویز اور دلکش ہوتا تھا ۔ ان کے طرز گفتگو کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسن رقم طراز ہیں :

''مسعود صاحب کی گفتگو ایسی صحیح ، دلچسپ اور برمحل ہوتی تھی کہ ان کی باتیں سننے ہی سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا تھا ۔ کلاس میں ان کی گفتگو کی یہ کیفیت لیکچر کو دو آتشہ کر دیتی تھی ۔ کلاسیکی شاعری میں لفظ کی جو اہمیت ہے ، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور مسعود صاحب لفظ کے رمز شناس تھے ۔ اس طرح پڑھاتے تو ایک ایک لفظ کی تہ تک پہنچتے اور ان کے تلازمے سمجھاتے اور اس کے زور بیان کا راز بتاتے ۔''[1]

مسعود حسن رضوی کے بہت سے ایسے شاگرد بھی ہیں ، جو شاعر اور ادیب کی حیثیت سے معروف نہیں ، بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں منتخب ہیں ۔ مسعود حسن رضوی کے ایسے شاگردوں سے میں نے ان کے طریق تدریس اور بحیثیت اُستاد کے گفتگو کی ۔ کے ۔ کے ۔ باتھر آکاش وانی لکھنؤ کے سٹیشن ڈائریکٹر ہیں ۔ ان سے مسعود حسن رضوی کے انداز تدریس کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا :

یہ ۱۹۴۲ع کی بات ہے ۔ میں بی ۔ اے آنرز فارسی کا طالب علم تھا ۔ کلاس ان کے کمرے میں جاتی تھی ۔ مسعود حسن صاحب فارسی پڑھاتے تھے اور میں ۱۹۴۲ع سے ۱۹۴۴ع تک یعنی دو سال ان کا شاگرد رہا ۔ ان کے پڑھانے کا اپنا خاص طریقہ تھا ۔ تازہ سبق پڑھانے سے پہلے کل کے سبق کا تھوڑا سا جائزہ لیتے تھے ۔ مثنوی پڑھاتے ہوئے مثنوی کیا ہے پر گفتگو کرتے ۔ خصوصیات بتاتے اور پھر اشعار لڑکوں سے پڑھواتے ۔ تلفظ کی غلطیاں ٹھیک کراتے ۔ تلفظ کی غلطی سے ان کی طبیعت مکدر ہو جاتی تھی ۔ ایک طالب علم سے کہا کہ تم نے غلط پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے کر دیے ۔ اصلاح کرنے کے بعد پھر پڑھواتے ۔ ان کے اپنے فارسی پڑھنے کے طریق میں عجیب بات تھی ۔

۱- ہماری زبان ، نئی دہلی ، ۲۲ دسمبر و یکم جنوری ۱۹۷۶ع ، ص ۱۲ -

ایرانی لہجہ دینے کی کوشش کرتے اور طلبہ کو تلقین کرتے کہ وہ بھی فارسی اس طرح بولیں جیسے ایرانی بولتا ہے ۔ مسعود حسن رضوی سبق سے نہیں ہٹتے تھے ۔ سوال کرنے کی بھی دعوت دیتے تھے ۔ فرماتے ''بیٹا پوچھ لو جو کچھ نہیں آتا ۔ میں دریا بہہ رہا ہوں ، جیسا برتن لاؤ بھر لو'' وقت کی بے حد پابندی کرتے تھے ۔''[1]

ڈاکٹر عبادت بریلوی اس بارے میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں :

''میں یونیورسٹی میں ۳۸ - ۱۹۳۹ع میں بی ۔ اے میں داخل ہوا ۔ اردو آنرز میں تھا ۔ اُس زمانے میں مسعود صاحب غالب پڑھاتے تھے ۔ فن پر لیکچر دیتے تھے ۔ اشعار کی باقاعدہ تشریح کراتے تھے ۔ غالب کی منتخب غزلیں پڑھایا کرتے تھے ۔ زبانی لیکچر اس طرح ہوتا تھا کہ سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی ۔ ویسے بھی کلاس میں اتنا رعب ہوتا تھا کہ سوال کرنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی تھی ۔ ایم ۔ اے میں فارسی جدید اور اردو میں اقبال پڑھاتے تھے ۔ غالب بھی ان کے ذمے تھا ۔ پڑھانے میں بہت شگفتہ اور شاداب انداز ہوتا تھا ۔ لیکچر دینے سے پہلے پان کھاتے اور پھر بیٹھ کر پڑھانا شروع کر دیتے اور یوں گل افشانیِ گفتار دیکھنے کی ہوتی تھی ۔ تنقیدی بصیرت کے ساتھ وہ باریکیاں بیان کرتے کہ لطف آ جاتا ۔ آہستہ آہستہ بولتے تھے تیز نہیں پڑھاتے تھے ۔ پورا وقت پڑھاتے تھے اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ زیادہ وقت لیا ہو ۔ ان کے کلاس روم میں دو چھوٹی صراحیاں رکھی رہتی تھیں اور ہر طالب علم کو پانی پینے کی اجازت تھی ۔ لیکچر کے دوران اگر کوئی طالب علم پانی پینے کے لیے اُٹھتا تو مسعود صاحب کسی طور سے بھی ڈسٹرب نہیں ہوتے تھے ۔''[2]

مسعود حسن رضوی کے ایک اور شاگرد محمد خلیق ، جو ریڈیو پاکستان ملتان کے سٹیشن ڈائریکٹر ہیں ، بتاتے ہیں :

۱- کے ۔ کے ۔ بالھر سے گفتگو ، لکھنؤ ، ۷ مئی ۱۹۷۹ع ۔
۲- ڈاکٹر عبادت بریلوی سے گفتگو ، لاہور ، ۲ دسمبر ۱۹۸۱ع ۔

''میں نے ۱۹۴۱ع میں بی ۔ اے میں داخلہ لیا ۔ ۱۹۴۴ع میں بی ۔ اے آنرز اور ۱۹۴۵ع میں ایم ۔ اے فارسی کیا ۔ مسعود صاحب فارسی پڑھاتے تھے ۔ لکھے ہوئے نوٹس پڑھتے جاتے تھے اور ان کی رفتار اتنی سست ہوتی تھی کہ حرف بہ حرف نوٹس لیے جا سکتے تھے ۔ طلبہ لیکچر کے دوران سوال بھی پوچھتے تھے اور لیکچر کے بعد مسعود صاحب زبانی گفتگو کرتے تھے ۔ سبق کے اختتام پر وہ بتا دیتے تھے کہ اس موضوع پر فلاں فلاں کتابیں دیکھ لیں ۔''[1]

سید وقار عظیم مسعود حسن رضوی کے شاگرد تھے ۔ ڈاکٹر معین الرحمن نے ایک گفتگو میں ان سے سوال کیا کہ کچھ اساتذہ سے بھی آپ کا سابقہ رہا ہوگا ۔ اس کے جواب میں سید وقار عظیم نے فرمایا :

''یونیورسٹی آنے کے بعد اس میں ایک طرح کی پختگی پیدا ہوئی اور ایک راستہ ملا تنقید کو ۔ وہ مسعود حسن رضوی صاحب کے زیرِ سایہ ۔ بی ۔ اے میں حالی کا مقدمہ تھا ہمارے نصاب میں ۔ آپ کو معلوم ہے کہ مقدمے کو سامنے رکھ کر مسعود صاحب نے کتاب لکھی ہے ''ہماری شاعری'' ۔ تو وہ مقدمہ پڑھاتے تھے اور جو کچھ انھوں نے ہماری شاعری میں کہا ہے اسے زبانی بیان کرتے تھے ۔ تو بجائے اس کے کہ ہم ان چیزوں کو پڑھتے ، ہم نے یہ خیالات اُن سے سنے اور ان کا اثر قبول کیا ۔ تو مسعود حسن رضوی صاحب کا میں سمجھتا ہوں کہ بے حد اثر ہے ۔ اور میں جتنا بھی ذکر کروں اس احسان کا جو ہے اُن کی تحریروں اور تقریروں کا وہ کم ہوگا ۔''[2]

علی جواد زیدی لکھتے ہیں :

''میں یہ کہنے میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں ان کا شاگرد ہوں ۔ لیکن میں شاگرد بعد میں بنا اور نیاز مند پہلے ۔ مسعود کو میں نے

۱۔ محمد خلیق سے گفتگو ، ملتان ، ۱۲ فروری ۱۹۸۰ع ۔
۲۔ پروفیسر سید وقار عظیم ۔ فن اور زندگی ، مرتبہ ڈاکٹر معین الرحمٰن ، نقوش سالنامہ جنوری ۱۹۷۷ع ، ص ۵۹۴ - ۵۹۵ ۔

اسکول کے ابتدائی درجات ہی سے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔"[1]

ایک اور جگہ علی جواد زیدی لکھتے ہیں :

"دو برس تک بی۔ اے میں آپ سے فارسی پڑھی۔"[2]

مسعود حسن رضوی فیض کا سرچشمہ تھے۔ اردو ادب کے ہزاروں طالب‌علموں نے اس ابدی سرچشمے سے اکتسابِ فیض کیا۔ بعض نجی محفلوں میں علم حاصل کرتے رہے۔ ان کی کتابوں سے تو علم حاصل کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ مسعود حسن رضوی نے بعض اصحاب کی پی۔ ایچ ڈی کے مقالات میں رہنمائی کی وہ ہر طرح سے ہردلعزیز اُستاد تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے صحیح لکھا ہے :

"پروفیسر مسعود حسن رضوی نے بحیثیت اُستاد کئی نسلوں کی تربیت میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا ہے۔ اردو کے کسی اُستاد کو یہ سعادت نہ ملی کہ ان کی تربیت گاہ میں پروفیسر احتشام حسین اور پروفیسر محمد حسن جیسے شاگرد پرورش پاتے۔"[3]

ان کے چشمۂ فیض سے بہت سے اہلِ علم نے پیاس بجھائی۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی "مطالعہ و مشاہدہ" کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

"میں نے یہ کتاب اپنے استادِ محترم عالی جناب پروفیسر مسعود حسن رضوی الادیب کے نام معنون کی ہے۔ دراصل میں ان سے ایک مدت سے استفادہ کر رہا ہوں۔ میں نے اپنی مختلف کتب کی تیاری میں ہمیشہ ان کے بیش قیمت کتب خانے سے مدد لی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر ان سے معلومات بھی حاصل کی ہیں۔"[4]

اس طرح ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اپنے پی ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کے مقالوں کے سلسلے میں مسعود حسن رضوی سے مدد حاصل کی ہے اور بعض اوقات

۱۔ نیا دور لکھنؤ، مسعود حسن رضوی نمبر، مارچ۔ اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۱۰۔
۲۔ آپ سے ملیے، از سید علی جواد زیدی، ص ۸۳۔
۳۔ ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ دسمبر و یکم جنوری ۱۹۷۶ء، ص ۱۲۔
۴۔ مطالعہ و مشاہدہ، از ڈاکٹر سلام سندیلوی، ص ۹۔

خط لکھ کر بھی مشورے طلب کیے ۔ اس بارے میں وہ کافی تفصیل سے اپنے ایک مضمون میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”پروفیسر صاحب سے یوں ہی بذریعہ خط و کتابت علمی مدد حاصل کرتا رہتا تھا ۔“[1]

ڈاکٹر قمر جہاں اس سلسلے میں رقم طراز ہیں :

”کئی بار اُلجھ کر رہ جاتی اور سمجھ میں نہ آتا کہ میں اپنے مطلب کا مواد[2] کہاں سے لوں اور کیا اور کیسے نتائج اخذ کروں ۔ پروفیسر صاحب کی مختصر مگر کار آمد گفتگو بڑی حد تک میری مشکلات کو آسان کر دیتی تھی ۔ وہ ہر ایک کتاب کے بارے میں اتنی تفصیل بتاتے تھے کہ بہت سی باتیں کتاب کو پڑھے بغیر معلوم ہو جاتی تھیں . . . ایم ۔ اے کے بعد میں نے ریسرچ میں داخلہ لیا ۔ نگران کا مسئلہ درپیش ہوا ۔ شعبے میں اساتذہ کی کمی اور طلبہ کی کثرت تھی ۔ میں فارم لے کر ڈرتے ڈرتے مسعود صاحب کے پاس گئی ۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے خود مجھ سے کہا کہ نگران کی جگہ میرا نام لکھ دو . . . میری تعلیم و تربیت میں مسعود صاحب کا بڑا ہاتھ رہا ۔ وہ تقریباً ہر شام کو میرے پاس بیٹھ کر بہت سے ادبی نکات بڑے دلچسپ انداز میں ذہن نشین کرا دیتے تھے ۔ شعر خوانی پر تو ان کو ملکہ تھا ۔ بہت سے مشکل اشعار کو صحیح لہجے اور وقفے کے ساتھ اس طرح پڑھتے تھے کہ مطلب خود بخود واضح ہو جاتا تھا ۔ معمولی سے معمولی لفظ کی سند اساتذہ کے کلام سے پیش کر دیتے تھے ۔“[3]

ہندوستان بھر سے محقق مسعود حسن رضوی کے پاس پہنچتے تھے ۔ پاکستان سے خطوں کے ذریعے ان سے مشورے لیے جاتے تھے ، وہ بلا تکلف جواب دیتے ۔ اپنے ایک شاگرد مشرف انصاری کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں :

۱۔ نیا دور ، لکھنؤ ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ ۔ اپریل ۱۹۷۷ع ، ص ۵۷ ۔
۲۔ ”غزالۂ عامرہ کا تنقیدی مطالعہ“ ان کا موضوع تھا ۔
۳۔ نیا دور لکھنؤ مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ ۔ اپریل ۱۹۷۷ع ، ص ۷۳ ۔ ۷۸ ۔

''پی ایچ ۔ ڈی کے لیے آپ نے جو موضوع منتخب کیا ہے وہ نہایت مناسب ہے ۔ ''شبستانِ سرور'' میرے کتب خانے میں موجود ہے ۔ آپ اگست میں آئیں گے تو اس کا مطالعہ کر سکیں گے ۔''[۱]

یوں مسعود حسن رضوی مختلف موضوعات پر کام کرنے والوں کی ہر طرح کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے ۔ البتہ وہ اپنے علمی و تحقیقی کاموں میں اس درجہ مصروف رہتے تھے کہ نہ تو پرچے جانچتے تھے اور نہ ہی ممتحن بنتے تھے ۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

''مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں کے امتحانات کی کاپیاں دیکھنے سے ہی انھوں نے انکار کر دینا مناسب خیال فرمایا کہ اس سے علمی و ادبی مشاغل و مطالعہ کے اوقات میں خلل پڑتا ہے ۔ پی ایچ ۔ ڈی کے مقالات کو دیکھنے کے لیے بھی وہ بڑی مشکل سے راضی ہوتے تھے ۔''[۲]

مسعود حسن رضوی جن مقالات کے نگران تھے ، ان کی فہرست درج ذیل ہے :

فارسی ، پی ایچ ۔ ڈی ، ڈاکٹر نذیر احمد : ظہوری ۔ حیات اور شاعری ۔

فارسی ، ڈی لٹ ، ڈاکٹر نذیر احمد : ابراہیم عادل شاہ اور اس کا عہد ۔

فارسی ، پی ایچ ۔ ڈی ، ڈاکٹر قمر جہاں : مرزا قتیل ۔ حیات و خدمات ۔

فارسی ، پی ایچ ۔ ڈی ، محمد خلیق :

Language and Literature at the Mughal Court under Jahangir, Shahjahan and Aurungzaib .

اب ان مقالات کی فہرست درج کی جاتی ہے جن کے مسعود حسن رضوی ممتحن مقرر کیے گئے :

۱۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی : ذوق ـــ سوانح و انتقاد ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔

۱۔ مسعود حسن رضوی بنام مشرف انصاری ، ۲۲ جولائی ۱۹۶۰ع ۔

۲۔ وفیات ، از ڈاکٹر تنویر احمد علوی ، لوائے ادب ، بمبئی ، جنوری ۱۹۷۶ع ، ص ۷۳ ۔

۲- ڈاکٹر گوپی چند نارنگ : اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر ، دلی یونیورسٹی -

۳- محمود الٰہی : اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ، گورکھپور یونیورسٹی -

۴- گیان چند جین : اردو داستان گوئی — شمالی ہند میں (۱۸۷۰ع) ، الہ آباد یونیورسٹی -

۵- عظیم الشان صدیقی : اردو ناول کا آغاز و ارتقاء (۱۸۵۷ع سے ۱۹۱۴ع تک) ، دلی یونیورسٹی -

۶- کوکب سجاد مرزا : واجد علی شاہ کی ادبی و تہذیبی خدمات ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی -

۷- وقار حسین : الیس کی زبان ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی -

۸- ڈاکٹر ابو محمد سحر : امیر مینائی ، الہ آباد یونیورسٹی -

۹- ڈاکٹر جعفر رضا : میر عشق اور ان کے خاندان کے مرثیہ گو ، الہ آباد یونیورسٹی -

۱۰- مظفر حسین ملک : مرزا دبیر ، پنجاب یونیورسٹی لاہور -

۱۱- میمونہ بیگم : مرزا رسوا — حیات اور کارنامے ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی -

۱۲- ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی : اردو میں مکتوب نگاری کا ارتقاء ، دلی یونیورسٹی -

۱۳- محمد شمیم حنفی : محمد حسین آزاد کی ادبی خدمات کا مطالعہ ، الہ آباد یونیورسٹی -

۱۴- نیر اقبال : اردو قواعد نویسی ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی -

۱۵- ڈاکٹر ایم - ایچ - رضوی : اردو لغت نگاری ، کشمیر یونیورسٹی سرینگر -

۱۶- ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی : اردو مثنوی کا ارتقاء (۱۷۵۰ع تا ۱۹۵۰ع) ، الہ آباد یونیورسٹی -

غرض مسعود حسن رضوی علم کا بہتا ہوا دریا تھے اور ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق فیض اُٹھاتا تھا ۔ مختلف موضوعات پر کام کرنے والے محقق اور نقاد بذریعہ خطوط معلومات حاصل کرتے تھے ۔ ان میں ایسے ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو تحقیق و تنقید کے اہم ستون ہیں ۔ محمد عمر نور الٰہی ، اثر لکھنوی ، نصیر الدین ہاشمی ، قاضی عبدالودود ، مولانا امتیاز علی عرشی اور اسی طرح کے دیگر مقتدر لکھنے والوں کے مسعود حسن رضوی کے نام خطوط سے اندازہ ہو جاتا ہے اور اس بات کا بھی پتہ لگتا ہے کہ ادبی و علمی استفسارات کے جواب دینے میں وہ کبھی بھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے ۔

اس جائزے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ مسعود حسن رضوی ایک استاد کی حیثیت سے نہایت کامیاب تھے ۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں :

”تیس بتیس برس جو آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی میں بحیثیت معلم کے گزارے ہیں وہ یادگار رہیں گے ۔ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں بھی اردو اور فارسی مخطوطوں کا ایک بہت اچھا ذخیرہ آپ نے مہیا کر دیا ہے ۔ اردو بحیثیت ایک مضمون کے ایم ۔ اے کے درجوں میں آپ ہی کی کوششوں سے منظور ہوئی ۔“[1]

ایم ۔ اے اردو کی کلاسوں کے اجراء کے سلسلے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے سید وقار عظیم نے بتایا :

”جب میں نے بی ۔ اے[2] کیا تو مسعود صاحب نے مجھے ایک دن باتوں باتوں میں کہا : بھئی وقار ! ہم اردو ایم ۔ اے کھولنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور خیال یہ ہے کہ دو تین برس اس میں لگیں گے ۔ تو جی یہ چاہتا ہے کہ ہمارا کوئی شاگرد یہاں پہلا اُستاد ہو شعبے کا جو ایم ۔ اے کی تدریس میں حصہ لے ۔ تو اگر آپ اُردو میں ایم ۔ اے کر لیں تو بڑی خوشی ہوگی ۔“[3]

۱۔ ماہنامہ فروغِ اردو لکھنؤ ، جون ۱۹۵۴ع ۔

۲۔ سید وقار عظیم نے ۱۹۳۵ع میں بی ۔ اے کیا ۔

۳۔ پروفیسر سید وقار عظیم ۔ فن اور زندگی ، مرتبہ ڈاکٹر معین الرحمن ، سالنامہ نقوش ، جنوری ۱۹۷۷ع ، ص ۵۹۵ ۔

مسعود حسن رضوی کا بطور اُستاد جو مقام و مرتبہ تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی رقم طراز ہیں :

''اردو زبان و ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے جن اساتذہ کی تحریروں سے زیادہ سے زیادہ روشنی اور رہنمائی حاصل کرنے کا اتفاق ہوا ہے ، ان میں پروفیسر مسعود حسن رضوی کا نام میرے لیے بے حد واجب الاحترام ہے . . . پروفیسر موصوف کی زندگی میں بے شمار کتابوں کے ساتھ ان گنت طالب علم شریک رہے ہیں جن میں وہ ممتاز افراد بھی ہیں جو آج اردو تحقیق و تنقید اور تدریس کی دنیا کے صدر نشین ہیں، وہاں ایسے افراد اور اشخاص بھی ہیں جو براہِ راست مسعود صاحب کے حلقۂ سخن میں زیرِ تربیت نہیں رہے۔ لیکن دور رہ کر بھی انھوں نے موصوف کی شخصیت و شعور اور ان کے علمی آثار سے حسبِ استعداد و توفیق استفادہ کیا ہے۔ اس طرح مسعود صاحب نے صرف کسی ایک نسل کو نہیں ، کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ ایک اُستاد کی زندگی کے لیے اس سے بہتر کامیابی اور سعادت کیا ہو سکتی ہے۔''[1]

اس تناظر میں مسعود حسن رضوی سے بطور اُستاد کئی نسلوں نے استفادہ کیا اور ان کی حیثیت استاد الاساتذہ کی تھی۔ ان کی کتابیں ہماری شاعری ، لکھنؤ کا شاہی سٹیج ، لکھنؤ کا عوامی سٹیج اور آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ ایم۔ اے اردو کے کورس میں شامل ہیں اور یوں ہندوستان بھر میں ہی نہیں بلکہ پاکستان میں بھی ان کی بڑی اہمیت ہے۔

۲۔ بحیثیتِ ماہر قواعدِ زبان

مسعود حسن رضوی اگرچہ اس معنوں میں ماہر لسانیات نہیں تھے کہ انھوں نے زبان کے بارے میں کوئی نظریہ قائم کیا ہو یا لسانی بنیادوں پر اردو کی تشکیل اور اس کے آغاز و ارتقاء پر کام کیا ہو ، لیکن قواعدِ زبان کے بارے میں انھوں نے خاصا کام کیا ہے ، جس میں اردو الفاظ کی صحیح تحقیق اور استعمال ، تراکیب اور صنعتیں ، ضرب الامثال ، قواعد کی کتب پر تحشیہ اور

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب — حیات و خدمات ، از مرزا جعفر حسین ، ص ۷۵ ، ۷۷ - ۲۷۸ -

خاص طور پر اردو زبان کا رسمِ خط ان کے موضوع رہے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی جو تحریریں ہیں اس کی تفصیل یہ ہے :

۱- سارے ہندوستان کی ایک زبان (کیا اردو اور ہندی دو زبانیں ہیں) : لکھنؤ یونیورسٹی جرنل ، دسمبر ۱۹۲۲ء -

۲- اردو کے منظوم لغت : خیابان لکھنؤ ، جنوری ۱۹۲۷ء -

۳- میر انیس کے کلام میں صنعتوں کا استعمال : زمانہ کانپور ، مئی ۱۹۲۸ء -

۴- اردو زبان کے لغت : ہندوستانی الہ آباد ، جنوری ۱۹۳۱ء -

۵- نظامِ اردو مصنفہ آرزو لکھنوی : تحشیہ ، اشاعت ۱۹۳۱ء -

۶- اردو زبان میں فارسی ترکیبیں (یہی مضمون ''اندر سبھا کی زبان'' کے عنوان سے لکھنؤ کا عوامی سٹیج میں شامل ہے) : الناظر لکھنؤ ، مئی ۱۹۳۳ء -

۷- فرہنگِ امثال : مرتبہ : اشاعت ۱۹۳۷ء -

۸- اردو زبان اور اس کا رسمِ خط (اسی نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا) : خطبۂ صدارت شعبۂ اردو آل انڈیا اورینٹل کانفرنس ناگپور ۱۹۴۶ء -

۹- ریاستی اردو کانفرنس کا خطبہ : ہماری زبان علی گڑھ ، یکم جنوری ۱۹۵۶ء -

۱۰- غنڈا یا گنڈا : قومی آواز لکھنؤ ، ۳ - اپریل ۱۹۶۱ء -

۱۱- میر عشق اور اصلاحِ زبان (نگارشاتِ ادیب میں شامل ہے) : نیا دور لکھنؤ ، اگست ۱۹۶۲ء -

۱۲- خطبۂ صدارت جامعۂ علی گڑھ : پمفلٹ ، ۳ مئی ۱۹۶۵ء -

۱۳- رسالہ قافیہ از عطاء اللہ بن محمود الحسینی : نذرِ عرشی ، مرتبہ مالک رام و مختار الدین احمد -

۱۴- تاج اللغات : ہماری زبان ، فروری ۱۹۶۶ء -

۱۵- غازی الدین حیدر اور علمِ لغت : نیا دور لکھنؤ ، مارچ ۱۹۶۷ء -

۱۶- ایک استفسار کا جواب - لفظ کاہلا اور خلفشار کی تحقیق : ہماری زبان علی گڑھ ، ۱۵ مئی ۱۹۷۱ع -

۱۷- بیگماتی زبان[1] : ؟

یہ وہ تحریریں ہیں جو ان کے قواعدِ زبان کے مطالعے ، تحقیق اور نظریے کی بنیادیں فراہم کرتی ہیں - اس سلسلے میں اردو زبان اور رسمِ خط کا مسئلہ خاصا اہم ہے - اس موضوع پر انھوں نے ناگپور یونیورسٹی کی اورینٹل کانفرنس ۱۹۴۶ع میں صدارتی خطبہ دیا تھا جو بعد میں "اردو زبان اور اس کا رسمِ خط" کے نام ہی سے کتابی شکل میں چھپ کر سامنے آیا - ریاستی اردو کانفرنس کا خطبہ اور خطبۂ صدارت جامعہ علی گڑھ بھی اسی سلسلے کی کڑیوں کو پیش کرتے ہیں اور رسمِ خط کے بارے میں انھی خیالات و نظریات کو بیان کیا گیا ہے جو اس کتاب میں زیرِ بحث آ چکے ہیں - البتہ ان سے مسعود حسن رضوی کے ذہنی ارتقاء کا پتہ چلتا ہے اس لیے کہ یہ ۱۹۴۶ع کے بعد کے یعنی ۱۹۵۶ع اور ۱۹۶۵ع کے ہیں -

"اردو زبان اور اس کا رسمِ خط" کا پہلا ایڈیشن جولائی ۱۹۴۸ع میں اور دوسرا ایڈیشن ستمبر ۱۹۶۱ع میں شائع ہوا - اس کتاب کے دو حصے ہیں - پہلا حصہ اردو زبان کا ہے اور دوسرا حصہ اردو کا رسمِ خط پر مشتمل ہے - پیش نامہ میں سید مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں :

> "جس زمانے میں یہ خطبہ لکھا گیا تھا ہندوستان دو حصوں میں تقسیم نہ ہوا تھا - مشرقی بنگال ، مغربی پنجاب ، سندھ ، بلوچستان اور سرحدی صوبہ سب ہندوستان میں شامل تھے - ہمارا ملک اُس وقت آزاد نہ ہوا تھا مگر آزادی کی منزل سامنے تھی - حصولِ آزادی کے بعد کے اہم مسائل میں ملکی زبان کا مسئلہ بھی تھا اور انڈین نیشنل کانگریس کی منظور کی ہوئی قراردادوں اور ہماری جنگِ آزادی کے سالارِ اعظم مہاتما گاندھی کے بیانوں سے اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ آزاد ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی ہوگی جو آسان اردو اور آسان ہندی کا مجموعہ ہوگی اور ناگری اور فارسی دونوں حرفوں میں لکھی جائے گی -

---

۱- چھپا ہوا مضمون موجود ہے مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس رسالے میں شائع ہوا -

اب حالات میں بڑی تبدیلیاں ہوگئی ہیں ۔ ہمارے صوبے کی حکومت
نے سنسکرت آمیز ہندی کو سرکاری اور تعلیمی زبان قرار دے دیا ہے ۔
اردو زبان اور فارسی حرفوں کو کچہریوں ، دفتروں اور تمام سرکاری
کاروبار سے بالکل خارج کر دیا گیا ہے ۔ یہ صورت حال اردو زبان والوں
کے لیے بے حد پریشان کن ہے . . . ۔ اردو اقلیت کی زبان سہی مگر
اقلیت کے حقوق کا تحفظ ہی تو وہ معیار ہے جس سے کسی جمہوری
حکومت کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ اقلیت کے حقوق کا پامال
کرنا کسی حکومت کے لیے نہ کوئی دشوار کام ہے اور نہ کوئی
قابلِ فخر کارنامہ ۔ اس صوبے کے باشندوں کی ڈیڑھ سو برس کی مسلسل
کوششوں سے اردو جس بلند مقام پر پہنچ چکی ہے اس سے نیچے گرانے
کے لیے اس وقت اس پر ایسے ایسے الزام لگائے جا رہے ہیں جو کبھی
کسی کے وہم میں بھی نہ آئے تھے ۔"[۱]

اس پیش لفظ کے دو حصے ہیں ۔ پہلا تقسیم برصغیر سے پہلے سے متعلق ہے اور دوسرا تقسیم کے بعد سے ۔ یہاں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ مسعود حسن رضوی نے گاندھی جی کا جس حوالے سے ذکر کیا ہے اس کا مختصر جائزہ لیا جائے ۔ گاندھی جی نے ۱۹۳۸ء میں ایک نعرہ بلند کیا تھا کہ ہندوستان کے ملک کی زبان کو کیا نام دیا جائے ۔ اردو ، ہندی یا ہندوستانی ؟ یہ نعرہ عوامی سطح پر ایک تنازعے کی صورت میں نمودار ہوا ۔ کانگریس نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک تیسری زبان تخلیق کی جائے اور اس کا نام ہندوستانی رکھا جائے ۔ اس سلسلے میں کانگریس نے قرارداد بھی منظور کی ۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی کتاب "ہندی اردو تنازعہ" میں یہ ساری تفصیلات درج کی ہیں ۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں :

"گاندھی جی نے انڈین نیشنل کانگریس کی قرارداد سے تجاوز کرکے
بھارتیہ ساہتیہ پریشد ناگپور کے جلسے میں لفظ "ہندوستانی" پر "ہندی"
کا اضافہ کیا اور ہندوستان کی مجوزہ قومی زبان کو "ہندی ہندوستانی"
کا نام دیا ۔"[۲]

۱۔ اردو زبان اور اس کا رسمِ خط (پہلا ایڈیشن) از مسعود حسن رضوی ادیب ، ص ۴ - ۵ ۔

۲۔ ہندی اردو تنازعہ ، از ڈاکٹر فرمان فتح پوری ، ص ۳۹۴ ۔

زبان کے نام کے ساتھ ساتھ رسمِ خط کا مسئلہ بھی سامنے آیا ۔ اردو چونکہ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور ہندی ناگری حروف میں اس لیے ہندوؤں کے پیشِ نظر یہ بات بھی تھی کہ رسمِ خط بھی تبدیل کر دیا جائے ۔ زبان کے اس مسئلے پر مختلف علمائے اردو نے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا اور اختلافی مضامین لکھے ۔ ''ہندی اردو تنازعہ'' کے علاوہ نقوش کے ادبی معرکے نمبر حصہ اول میں اس ساری تفصیلات کو درج کر دیا گیا ہے جس کے عنوانات یہ ہیں :

اردو ہندی ، ہندوستانی اور مسٹر گاندھی ۔

اردو ، ہندی اور ہندوستانی ۔

اردو اور ناگری رسمِ خط ۔

زبان کے مسئلے پر ڈاکٹر عبدالحق ، مہاتما گاندھی ، جواہر لال نہرو ، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پروفیسر محمد مجیب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔

رسمِ خط کے مسئلے پر ڈاکٹر عبدالحق ، مہاتما گاندھی ، جواہر لال نہرو ، راجگوپال اچاریہ ، محمد الیاس برنی اور مسعود حسن رضوی نے اظہار خیال کیا ہے ۔ نقوش کے ادبی معرکے نمبر میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے[1] ۔

اردو رسمِ خط کے سلسلے میں مولوی عبدالقدوس ہاشمی کی کتاب ''ہمارا رسم الخط'' اور محمد الیاس برنی کی تالیف ''اردو ہندی رسم الخط'' خاصے کی چیزیں ہیں ۔ اسی طرح مسعود حسن رضوی کی زیرِ بحث کتاب ''اردو زبان اور اس کا رسمِ خط'' بھی خاصی اہمیت کی حامل ہے ۔

تقسیم کے بعد اردو کے خلاف جو سازشیں شروع ہوئیں اور جس طرح کانگریسی حکومت نے اپنے وعدوں کو بالائے طاق رکھ کر سنسکرت آمیز ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا اور اردو کی حیثیت کو اکثریت کی زبان کے باوجود اقلیتی زبان قرار دیا تو اس کے خلاف شدید احتجاجی سلسلے شروع ہوئے اور جو ہندی اردو فسادات کی شکل اختیار کر گئے ۔ اس صورتِ حال میں مسعود حسن رضوی کی یہ کتاب مسئلے کی صحیح تصویر پیش کرتی ہے ۔ اس کے ساتھ

۱۔ نقوش ، ادبی معرکے نمبر ، ستمبر ۱۹۸۱ع ، ص ۹ - ۹۱ ۔

مسعود حسن رضوی کی جرأت کی بھی داد دینا پڑتی ہے کہ یہ کتاب ایسے موقع پر منظرِ عام پر لائی گئی جب کہ فضا اردو کے لیے سازگار نہ تھی اور اردو کی حمایت کرنا گویا ملک سے غداری کرنا تھا۔ ان کی اس ہمت کی داد دیتے ہوئے اخبار تنویر لکھنؤ نے اپنی ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۸ع کی اشاعت میں لکھا:

''اس وقت اردو کو فنا کرنے کا جو طوفان بپا ہے اس میں اچھے اچھے اور مضبوط دل والے ہمت ہار بیٹھے ہیں اور ہر چہار طرف عجز اور شکست خوردگی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی کے صدر پروفیسر مسعود حسن رضوی مستحق مبارک باد ہیں کہ اس فضا سے متاثر ہوئے بغیر انھوں نے ایک قابلِ قدر اور ٹھوس دلائل سے پُر مقالہ اس اہم موضوع پر تحریر فرمایا ... اردو کی حمایت کا جذبہ بہت سے لوگوں کے دل میں ہے لیکن اردو دشمنوں کا مخالفانہ پروپیگنڈا اس زور شور سے جاری ہے کہ یہ حمایت کا جذبہ مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ اس رسالے کا مطالعہ جو ہرگز مناظرانہ اور مجادلانہ انداز میں نہیں اور نہ اس میں سیاسی اختلافات کو کوئی جگہ دی گئی ہے، اس باطل پروپیگنڈے کے اثرات کو زائل کر دے گا اور اردو کے حامیوں کو اردو کی تائید کے قوی اور مؤثر دلائل ہاتھ آ جائیں گے۔''[1]

اس کتاب کے، جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے، دو حصے ہیں: ایک اردو زبان سے متعلق ہے اور دوسرا رسمِ خط سے۔

پہلے حصے میں مسعود حسن رضوی نے اردو زبان کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں اردو زبان کی لسانی تشکیل کے بارے میں تو بات کی گئی ہے مگر اردو کے بارے میں بحث نہیں ملتی۔ اس نوعیت کے بنیادی سوال کہ اردو کا لفظ کیسے مستعمل ہوا یا اردو زبان کیسے معرضِ وجود میں آئی اس کے موضوع سے خارج ہیں۔ اسی طرح اردو کے پرانے سرمائے کا بھی ذکر نہیں ملتا۔ مختصر طور پر مسعود حسن رضوی نے یہ لکھا ہے:

۱- اخبار تنویر لکھنؤ، ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۸ع۔

''فطری اسباب ، تاریخی حالات اور انسانی کوششیں مل کر صدیوں تک کام کرتی رہی ہیں تب جا کر اردو زبان اس قابل ہوئی ہے کہ خیالات کی پیش رفت اور علوم کی ترقی کا ساتھ دے سکے ۔''[1]

ضرورت اس امر کی تھی کہ وضاحت سے اس کی لسانی تشکیل پر مفصل بحث کی جاتی اور اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کی آمیزش کا ذکر بھی ہوتا ۔ خاص طور پر اردو ہندی روابط پر کھل کر لکھا جاتا ۔ اسی طرح اردو کے عوامی زبان بننے کی داستان پر بھی پردہ پڑا رہنے دیا ہے ۔ اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ اس باب میں مسعود حسن رضوی نے صرف اردو کی اہمیت پر زور دینے کی کوشش کی ہے اور اس کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ اردو مسلمانوں کی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی زبان ہے ۔ یہ زبان مسلمان اپنے ساتھ باہر سے نہیں لائے بلکہ ہندوستان میں ان کی آمد ، لوگوں سے میل جول اور رابطے کے بعد وجود میں آئی ہے ۔ مسعود حسن رضوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

''ہر زبان کسی کلچر یا تہذیب کی آئینہ دار ہوتی ہے ۔ اردو ہندوستان کی اس مخلوط تہذیب کا مظہر ہے جو ہندوستانیوں ، عربوں ، ترکوں اور ایرانیوں کے مدت دراز کے میل جول سے وجود میں آئی تھی ۔ اس کا یہ تہذیبی پس منظر اس کا مقتضی تھا کہ اس میں عربی ، فارسی ، ترکی لفظ ملے جلے ہوں . . . فارسی عربی لفظوں کی آمیزش سے اردو میں یہ خصوصیت پیدا ہوئی ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں صرف یہی ایک زبان ہے جو ایشیا کے کئی ملکوں کی زبانوں سے بہت قریب ہے ۔''[2]

مسعود حسن رضوی نے اس کے بعد اردو زبان کے حق میں خاصے مضبوط دلائل دے کر یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اردو سے عربی اور فارسی کے الفاظ نکال کر ان میں سنسکرت الفاظ کی بھرتی فعل عبث ہوگا ۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ہندی سے بھی دوسری زبانوں کے الفاظ نکالنے کی کوشش کو برا تصور قرار دیا ہے ، اور مثالیں بھی پیش کی ہیں ۔ اردو کے حق میں بات کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

۱۔ اردو زبان اور اس کا رسم خط ، ص ۱۲ ۔

۲۔ اردو زبان اور اس کا رسم خط ، ص ۲۲ - ۲۱ ۔

''عربی اور فارسی اپنے لفظی ذخیروں ، اشتقاق اور ترکیبی خصوصیتوں اور دوسری لسانی خوبیوں کی بدولت دنیا کی عظیم ترین زبانوں میں ہیں ، ان سے قطع تعلق کرنا اردو کی رگ ِ حیات قطع کرنے کے برابر ہے ۔ جس چشمے سے وہ ہمیشہ سیراب ہوتی رہی ہے اس کو بند کر دینا اس کی زندگی کو خطرے میں ڈالنا ہے ۔''[1]

اسی طرح اردو کے مرکزی زبان ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

اردو کی بین صوبائی حیثیت دیکھنا ہو تو کلکتہ اور بمبئی کے سے بڑے شہروں میں جا کر دیکھیے ۔ پھر اس میں شبہ نہیں رہے گا کہ اگر کوئی زبان سارے ہندوستان کی زبان ہونے دعویٰ کر سکتی ہے تو وہ صرف اردو ہے . . . قومی اتحاد کے لیے ایک عام ملکی زبان کی سخت ضرورت ہے اور مختلف طبقوں میں اتحاد پیدا کرنے کی جو صلاحیت اردو زبان میں ہے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا ۔''[2]

ان مباحث میں مسعود حسن رضوی ایک تجویز یہ پیش کرتے ہیں کہ ہندی اور اردو دونوں کو رائج کر دیا جائے اس لیے کہ ہندوستان کی دو ہی زبانیں ہیں ایک ہندی اور دوسری اردو ۔ اس بارے میں وہ رقم طراز ہیں :

''اردو زبان اس مشترک اور مخلوط تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے جو ہندو مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے اور جس میں تاریخی حالات کے مطابق مسلمانی تہذیب کا حصہ ہندوانی تہذیب سے زیادہ ہے ۔ اور ہندی زبان ہندو تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے ۔ اگر ہندو مسلمانوں کو اس ملک میں ساتھ ساتھ رہنا ہے اور امن و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک دوسرے کی محبت اور ہمدردی حاصل کرنا ہے تو ایک دوسرے کی تہذیب کو بخوبی سمجھنا ضروری ہے اور چونکہ کسی جماعت کی تہذیب سمجھنے کا بہترین ذریعہ اس کے ادب کا مطالعہ ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہندو مسلمان دونوں ہندی بھی پڑھیں اور

۱۔ اردو زبان اور اس کا رسم ِ خط ، ص ۳۲ ۔

۲۔ ایضاً ، ص ۳۵ - ۳۶ ۔

اردو بھی ۔''۱

مسعود حسن رضوی نے آخر میں اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ بڑی عمدہ ہیں ۔ ان تجاویز کا خلاصہ یہ ہے :

۱- اکابرینِ اردو کی مستند سوانح عمریاں لکھی جائیں ۔

۲- اکابرین کی کتابوں کے صحیح اور معتبر ایڈیشن شائع کیے جائیں ۔

۳- نظم و نثر کی ابتدائی اور قدیم کتابوں کے صحیح ایڈیشن تحقیقی مقدموں اور توضیحی حاشیوں کے ساتھ تیار کیے جائیں ۔

۴- اردو ادب کی مستند تاریخ بھی لکھی جائے ۔

۵- اردو قواعد پر جامع کتاب لکھی جائے ۔

۶- لسانیات اور صوتیات کی کتابوں کی کمی کو دور کیا جائے اور اس موضوع پر مغربی زبانوں میں جو کام ہوا ہے اس کا ترجمہ کیا جائے ۔

۷- اردو میں ایک جامع اور صحیح اصول پر مرتب کی ہوئی لغت تیار کی جائے ۔

۸- اردو میں ایک انسائیکلو پیڈیا مرتب کیا جائے ۔

یہ تجاویز آج بھی اُتنی ہی اہمیت کی حامل ہیں جتنی اُس وقت تھیں ۔ یہ تجاویز مسعود حسن رضوی کی اردو سے لگن کا ثبوت ہیں ۔ اس حصے کے آخر میں انھوں نے نئے ادیبوں سے بھی کچھ باتیں کی ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

''اردو کا مستقبل نوجوان ادیبوں کے ہاتھ میں ہے ۔ ان کو ادبی علوم کی طرف خاص توجہ کرنا چاہیے تاکہ وہ ہر ادبی اور لسانی معاملے میں خوب جچی تُلی رائے قائم کر سکیں اور ان کی رہنمائی میں اردو شک و شبہ کی راہوں میں ادھر اُدھر بھٹکتی نہ پھرے بلکہ ترقی کی یقینی اور سیدھی راہ پر گامزن رہے ۔''۲

اس طرح اس حصے میں مسعود حسن رضوی نے اردو زبان کی حمایت میں

۱- اردو زبان اور اس کا رسمِ خط ، ۳۷ - ۳۸ ۔

۲- اردو زبان اور اس کا رسمِ خط ، ص ۴۷ ۔

اور اس کے مستقبل کو محفوظ کرنے اور ہندوستان میں اسے جو مسائل درپیش ہیں جیسے موضوعات کا احاطہ کیا ہے اور اردو کے حق میں دلائل سے کام لیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کو مٹانا اور اسے ختم کرنا خود ہندوستان کے مفاد کے بھی خلاف ہوگا۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ ''اردو رسمِ خط'' کے بارے میں ہے جو خاصا اہم ہے۔ اس میں مسعود حسن رضوی فارسی رسمِ خط اور ناگری حروف دونوں کا جائزہ لیتے ہیں اور اردو رسمِ خط کو بہتر ثابت کرنے کی دلائل سے کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ آغاز ہی میں لکھتے ہیں :

''ہماری زبان کے موجودہ مسائل میں رسمِ خط کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بعض لوگ ناگری تحریر کو فارسی رسمِ خط پر ترجیح دیتے ہیں اور اردو کی موجود تحریر میں یہ نقص نکالتے ہیں کہ اس میں ایک ہی لفظ کئی طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ اعتراض بہت وزنی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کا وزن بہت گھٹ جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حقیقت میں یہ دقت بہت کم پیش آتی ہے۔ ممکن ہے کہ اگر تنہا ایک لفظ یا ایک فقرہ کہیں لکھا ہو تو اس کے پڑھنے میں کبھی غلطی ہو جائے مگر بالعموم لفظ کسی جملے اور فقرے، کسی عبارت میں ہوتا ہے اور اس لفظ کے گرد و پیش کے لفظ اور اس فقرے کے آس پاس کے فقرے اس کو پڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔''[1]

اسی طرح مسعود حسن رضوی اردو الفاظ کی تحریری حالت میں آسانی ثابت کرنے کے لیے مثالیں دیتے ہیں اور ناگری تحریر سے فرق بیان کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

''اب رہی گھسیٹ لکھائی تو اس کا پڑھنا ناگری تحریر سے کہیں زیادہ مشکل ہے جتنا اردو تحریر میں۔ جو شخص اردو لکھنا پڑھنا جانتا ہے وہ تھوڑی سی مشق کے بعد گھسیٹ میں لکھی ہوئی اردو عبارت آسانی سے پڑھ سکتا ہے . . . . فارسی حروف ایک زمانے میں اس قدر مقبول ہو گئے تھے کہ ہندی زبان کی کتابیں بھی انھی حرفوں میں لکھی جاتی

۱- اردو زبان اور اس کا رسمِ خط ، ص ۱۵ -

تھیں ۔ ملک محمد جائسی کی پدماوت کو ہندی ادب میں جو درجہ حاصل ہے ، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے ۔ اس کتاب کے جتنے قدیم نسخے دستیاب ہوئے ہیں وہ سب فارسی حرفوں میں لکھے ہوئے ہیں ۔"[1]

اس کے ساتھ انھوں نے ۲۱ ہندی کتابوں کی فہرست دی ہے جو فارسی حروف میں ہیں ۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ ناگری کے مقابلے میں اردو کی تحریری بہت مشکل ہے ، مسعود حسن رضوی جو چند باتیں بیان کرتے ہیں ان کو پڑھ کر ہی ان کی اہمیت کا اندازہ اور ان کی صحیح سوچ کا پتہ چلتا ہے ۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے :

۱۔ اردو حروف ناگری حرفوں سے بہت زیادہ آوازیں ادا کر سکتے ہیں ۔

۲۔ اردو کے مفرد حروف بہت سادے اور مختصر ہیں اور جب وہ دوسرے حرفوں سے ملا کر لکھے جاتے ہیں تو اور بھی مختصر ہو جاتے ہیں ۔

۳۔ ناگری کے مفرد حرفوں کی شکلیں اردو حرفوں سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں ۔

۴۔ ناگری میں دس مختلف آوازوں کی خفیف اور ثقیل یعنی ہلکی اور بھاری دونوں صورتوں کے لیے الگ الگ حروف مقرر کیے گئے ہیں ۔ یوں علیحدہ علیحدہ علامتیں مقرر کرنے سے ناگری حرفوں کی تعداد بلا ضرورت بڑھ گئی ہے ۔

۵۔ ناگری میں زیر کے لیے کوئی ماترا نہیں ۔ اسے ظاہر کرنے کے لیے حرفوں کو ملا کر لکھنا پڑتا ہے جس سے صورتِ حال اور بھی مشکل ہو جاتی ہے ۔

۶۔ ناگری میں تشدید کے لیے کوئی علامت نہیں ۔

۷۔ ناگری میں حرف "ر" کی آواز کو ظاہر کرنے کے لیے متعدد علامتیں ہیں ۔

۸۔ بعض آوازوں کے لیے دو دو حرف ہیں جن میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں ۔

۱۔ اردو زبان اور اس کا رسمِ خط ، ص ۵۴ ۔

۹- گھ کی آواز کے لیے جو حرف ہے وہ "ر" اور "و" کی علامتوں کا مجموعہ ہے - اس سے بڑی خرابیاں پڑ سکتی ہیں -

یوں مسعود حسن رضوی نے ناگری تحریر کی دشواریوں کو بیان کر دیا ہے - اس کے بعد مسعود حسن رضوی نے ناگری تحریر کو رائج کرنے والوں کے دعووں کو دلیلوں کے ساتھ رد کیا ہے اور اردو رسمِ خط پر کیے گئے اعتراضات کا بھی جواب دیا ہے اور لفظوں کی مثالیں پیش کی ہیں - اس بحث کے بعد وہ رومن خط کو بھی قابلِ قبول نہیں سمجھتے اور رومن خط پر اصرار کرنے والوں کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"تجربہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ جو لوگ ساری عمر رومن حرفوں میں انگریزی پڑھتے لکھتے رہتے ہیں وہ اُنھی حرفوں میں لکھی ہوئی فرانسیسی یا جرمن عبارت کا ایک جملہ بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے - اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ جو لوگ اردو اور انگریزی دونوں زبانیں بخوبی جانتے ہیں اور فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی اردو اور رومن حرفوں میں لکھی ہوئی انگریزی کو بڑی روانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں ان کو رومن میں لکھی ہوئی اردو پڑھنے میں بڑی دیر لگتی ہے اور بہت دماغی محنت کی ضرورت پڑتی ہے -"[۱]

اس کے بعد مسعود حسن رضوی نے دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر اردو کے فارسی رسمِ خط اور انگریزی کے رومن رسمِ خط کا تقابل کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اردو میں تحریر کی جو دقتیں بیان کی جاتی ہیں وہ انگریزی میں بدرجہا زیادہ ہیں - یوں انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ رومن رسمِ خط کو اردو کے موجودہ رسمِ خط پر ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے - آخر میں رسمِ خط بدلنے کے نقصانات پر بحث کرتے ہوئے جو نتائج انھوں نے نکالے ہیں ان کا خاکہ کچھ یوں بنتا ہے :

۱- رسمِ خط بدلنے سے زبان کی ہیئت بدل جاتی ہے -

۲- زبان کا حال اور ماضی کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور لفظوں کی پہچان نہیں رہتی -

---

۱- اردو زبان اور اس کا رسمِ خط ، ص ۷۰ - ۷۱ -

۳- عربی اور فارسی سے روابط رکھنے کے لیے موجودہ خط ضروری ہے۔

۴- اردو زبان کو فارسی سے جو قریبی تعلق ہے ادبی تحقیق کے لیے فارسی کا علم ضروری ہے اس لیے کہ ہندوستان کی تاریخ کا ذخیرہ جس کا اردو زبان و ادب سے گہرا تعلق ہے ، فارسی میں ہے۔

۵- ہزار ہا کتابیں جو اس رسم خط میں چھپ چکی ہیں ضائع ہوجائیں گی۔

۶- انشا پردازوں اور شاعروں نے لفظی صنعتوں کے استعمال میں جو کمال دکھایا ہے وہ نظر نہ آ سکے گا۔

۷- حرفوں کی تبدیلی سے حساب جمل کا وجود نہ رہے گا۔

ان نکات کو بیان کرنے کے بعد مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں :

> ''مختلف پہلوؤں پر نظر کرنے کے بعد یہ ضروری ٹھہرتا ہے کہ اردو کا موجودہ رسم خط برقرار رکھا جائے۔''[1]

مسعود حسن رضوی رسم خط میں اصلاح کو البتہ جائز قرار دیتے ہیں اور تجویز پیش کرتے ہیں کہ اس کام کے لیے ماہرین کی نمائندہ کل ہند کمیٹی بننا چاہیے جو مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر کرکے ادیبوں ، ناشروں ، طالب علموں ، معلموں اور کاتبوں سے مشورہ کرنے کے بعد اردو رسم خط کے قاعدے متعین کر دے اور اس کی پابندی کو لازمی قرار دے دے۔ آخر میں مسعود حسن رضوی خط نسخ اور نستعلیق کے بارے میں بھی لکھتے ہیں اور خط نسخ رائج کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں :

> ''چھپائی میں آسانی کے خیال سے حرفوں کی صورت میں کسی قدر تبدیلی بھی کی جا سکتی ہے مگر یہ تبدیلی ایسی ہونی چاہیے کہ چھپے ہوئے اور لکھے ہوئے لفظ صورت میں ملتے جلتے ہوں تاکہ جو کوئی چھپا ہوا لفظ پڑھ سکتا ہو وہ لکھا ہوا لفظ بھی آسانی سے پڑھ لے۔''[2]

''اردو زبان اور اس کا رسم خط'' کے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے

۱- اردو زبان اور اس کا رسم خط ، ص ۸۳ -

۲- اردو زبان اور اس کا رسم خط ، ص ۸۶ -

کہ مسعود حسن رضوی نے عالمانہ طریقے سے اس مسئلے پر قلم اٹھایا ہے اور ایسے دور میں جب لسانی فسادات کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا ، انھوں نے ایسا معتدل رویہ اختیار کیا ہے کہ جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا ہے۔ انھوں نے دلائل سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ''اردو رسم الخط کی ، جیسا وہ ہے ، مدافعت کی جائے۔''[1]

مسعود حسن رضوی نے رسمِ خط کی جس مہم میں حصہ لیا اس کے بارے میں اور کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں :

> ''اردو کے خلاف جب سے یلغار شروع ہوئی ہے ، چھوٹے بڑے متعدد رسالے اور مقالے اردو کی صحیح منزل اور مرتبے کی توضیح پر شائع ہو چکے ہیں ۔ ان سب میں بہت ہی ممتاز اور بلند درجہ اس رسالے کو حاصل ہے جو قامت میں کہتر اور مختصر اور قیمت میں کہیں بہتر اور جامع ہے ۔ نام سے یہ دھوکہ نہ ہو کہ یہ کوئی وقت کی چلتی ہوئی سرسری چیز اور پروپیگنڈے کے کام کا رسالہ ہے ۔ حقیقت میں اپنے مبحث پر یہ ٹھوس ، پُرمغز اور اطراف و جوانب پر حاوی ایک مستقل تصنیف ہے اور مصنف کا کمال یہ ہے کہ ساری بحثوں کو ٦٦ صفحات کے اندر سلیس اور شگفتہ اور دلکش انداز میں سمیٹ لیا ہے ۔ بحث زبان اور رسمِ خط دونوں پر ہے اور اسی مناسبت سے رسالہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہے ۔ ہر بحث اپنی جگہ سنجیدہ ، مدلل اور مکمل ۔ ''صدق'' اپنی تنگ دامانی سے معذور ہے ورنہ یہ رسالہ تھا اس قابل کہ پورے کا پورا ان صفحات میں نقل ہوتا ۔ ضرورت اس کی ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے ، بلکہ ممکن ہو تو اس کے ہندی اور انگریزی ترجمے بھی ضرور شائع کیے جائیں ۔ غیر اردو دانوں میں آخر کچھ تو منصف مزاج اور تحقیق پسند ہوں گے ۔ دشوار ہے کہ وہ اس کے دلائل سے غیر متاثر رہیں ۔''[2]

اسی طرح ماہِ نو کے تبصرہ نگار نے لکھا ہے :

۱- املا نامہ ، مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ، ص ۱٦ ۔
۲- ہفتہ وار صدقِ جدید لکھنؤ ، ۸ مئی ۱۹۴۹ع ۔

''صدارتی خطبوں میں سے اکثر کی حیثیت مقامی اور اثر وقتی ہوتا ہے لیکن یہ خطبہ ان معدودے چند خطبوں میں سے ہے جو وقت اور مقام کی حدود سے بالاتر ہو کر اپنے لیے ایک مستقل اور دوامی مقام پیدا کر لیتے ہیں ۔ رسالے کے پہلے حصے میں اردو زبان ، اس کی تاریخ ، اس کے ترکیبی عناصر ، اس کی تمدنی اور قومی اہمیت ، اس کی صوتی خصوصیات پر ایک جامع تبصرہ ہے ۔ دوسرے حصے میں رسمِ خط اور اس کے سلسلے میں پیدا ہونے والے مسائل کی فاضلانہ اور غیر جانبدارانہ اور منطقی بحث ہے ۔''[1]

مسعود حسن رضوی کے ان خیالات و نظریات کی اہمیت و افادیت اور صداقت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے بعد کے لکھنے والوں نے جب بھی رسمِ خط کے مسئلے پر قلم اٹھایا ہے ، ان کے نظریات کی تائید کی ہے اور اسے آگے بڑھاتے ہوئے بات کی ہے ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتب ''ہندی اردو تنازعہ'' اور ''اردو املا اور رسمِ خط'' کا نام لیا جا سکتا ہے ، جن میں اردو اور ناگری رسمِ خط پر بحث بھی کی گئی ہے ۔ مسعود حسن رضوی کے اس علمی و ادبی کارنامے کی داد دیتے ہوئے ڈاکٹر حامد اللہ ندوی لکھتے ہیں :

''اس میں اس بات کا خصوصیت سے خیال رکھا گیا ہے کہ اس رسم الخط کے خلاف جو اعتراضات وارد کیے جاتے ہیں ، ان کا واقعات و حقائق کی روشنی میں جواب دیا جائے اور اردو رسمِ خط کی خوبیوں کو ممکنہ حد تک واضح کیا جائے ۔ چنانچہ مصنف نے اردو اور ناگری رسمِ خط کا مقابلہ کرکے اردو رسمِ خط کی برتری میں جو دلائل بیان کیے ہیں ، وہ بڑی حد تک اردو والوں کے نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہیں ۔''[2]

اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو مرزا جعفر حسین نے لکھی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

۱- ماہِ نو کراچی ، مارچ ۱۹۴۹ع -
۲- لکھنؤ کی لسانی خدمات ، از ڈاکٹر حامد اللہ ندوی ، ص ۱۴۳ -

"ڈاکٹر عبدالستار دلوی ناظم گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر بمبئی نے اپنی کتاب "اردو میں لسانیاتی تحقیق" مطبوعہ آج پریس بمبئی، مئی ۱۹۷۱ء میں "اردو رسمِ خط کی علمی حیثیت" کے عنوان سے مسعود صاحب کی کتاب کا دوسرا حصہ از صفحہ نمبر ۵۱ تا ۸۶ نقل کر دیا ہے۔"[۱]

اس کتاب کی اہمیت اور افادیت اُجاگر کرتے ہوئے صداقت لکھنؤ نے اپنی ۴ ستمبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں ایک طویل تبصرہ شائع کیا تھا۔ اس کے تمام مندرجات پر بحث کرتے ہوئے تبصرہ نگار لکھتا ہے:

"کتاب میں فاضل مصنف نے ان زحمتوں اور دشواریوں کو بالکل آئینہ کر دیا ہے جو رومن دیو ناگری رسمِ خط میں اردو رسمِ خط کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں اور جن کو ظاہر کرنے سے عملاً گریز کیا جا رہا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ہر لائبریری، ہر کتب خانے اور ہر اردو دوست ہی کے پاس ہونا ضروری ہے، بلکہ موجودہ دور میں جبکہ ملک میں ایک قومی اور مشترک زبان بنانے کا مسئلہ در پیش ہے، ہندو اور مسلمانوں سبھوں کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ اس کو پڑھنے کے بعد وہ صحیح رائے قائم کر سکیں۔"[۲]

مسعود حسن رضوی نے اس کے بعد اگرچہ کوئی مستقل تصنیف اس موضوع پر نہیں لکھی مگر وقتاً فوقتاً وہ اپنی تحریروں میں اس مسئلے پر قلم اٹھاتے رہے۔ اس سلسلے میں ۱۰-۱۱ دسمبر ۱۹۵۵ء کو ریاستی اردو کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے جو تقریر[۳] انھوں نے کی، اس میں بھی اردو زبان اور اس کے مسائل کا تفصیل سے ذکر کیا اور اردو کی حمایت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اسی طرح جامع اردو علی گڑھ کے جلسۂ تقسیمِ اسناد منعقدہ ۳ مئی ۱۹۶۵ء[۴] کے

۱- مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات و خدمات، از مرزا جعفرحسین، ص ۱۶۳۔
۲- صداقت لکھنؤ، ۴ ستمبر ۱۹۴۸ء، ص ۱۰۔
۳- ہماری زبان، علی گڑھ، یکم جنوری ۱۹۵۶ء۔
۴- موجود ہے۔ اس کی رپورٹ ہماری زبان علی گڑھ کے ۱۵ مئی ۱۹۶۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔

موقع پر جو خطبۂ صدارت انھوں نے دیا ، اس میں بھی اردو کی آئینی حیثیت پر بات کرنے کے بعد رسم خط کے بارے میں بھی خیالات کا اظہار کیا ۔ یوں وہ ساری عمر اردو کو اس کا جائز حق دلانے اور اس کی وکالت کرنے میں مصروف عمل رہے ۔ رسمِ خط کے بارے میں ان کے بیان کردہ نکات آج بھی اسی طرح تازہ ہیں جس طرح چھتیس سال پہلے تھے ۔

ان کے دوسرے مضامین کسی نہ کسی طرح قواعدِ زبان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ اردو زبان میں فارسی ترکیبیں جو ''لکھنؤ کا عوامی سٹیج'' میں ''اندر سبھا کی زبان'' کے عنوان سے شامل ہے ، مسعود حسن رضوی بطور محقق میں اس پر بحث کی جا چکی ہے ۔ اسی طرح ''میر انیس کے کلام میں صنعتوں کا استعمال'' انیس اور مسعود حسن رضوی کے ذیل میں زیرِ بحث آ چکا ہے ۔ مسعود حسن رضوی نے اپنے ایک مضمون ''سارے ہندوستان کی زبان : کیا اردو اور ہندی دو زبانیں ہیں'' میں ہندی اور اردو کے مشترک لسانی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور دونوں کو ایک زبان ثابت کرنے کی کوشش میں دلائل دیئے ہیں اور اس مبحث کا خلاصہ کچھ یوں دیا ہے :

> ''اردو لکھو تو کوشش کرو کہ تمھارا مطلب ہندی جاننے والے بھی سمجھ سکیں اور ہندی لکھو تو وہ زبان اختیار کرو جو اردو جاننے والوں کے لیے بھی مشکل نہ ہو ۔ اردو ہندی کے مل کر ایک ہو جانے کی سب سے بہتر تدبیر یہی ہے ۔ یہ نکتہ بھی یاد رکھو کہ جو بولتے ہو وہی لکھو ۔ کسی مصنوعی زبان کو رواج دینا فطرت سے لڑنا ہے ۔''[۱]

اسی طرح ایک مضمون ''اردو کے منظوم لغت'' میں امیر خسرو کی ''خالق باری'' حکیم یوسفی کی ''قصیدہ در لغاتِ ہندی'' تجلی کی ''اللہ خدائی'' منشی نولدہ رائے کی ''اسماء فارسی'' نامعلوم مصنف کی ''لغاتِ سعیدی'' سید فرزند علی شوق بریلوی کی ''لغات عجائب'' مولوی غلام احمد فروغی کی ''فیضِ شاہجہانی'' حافظ انوار اللہ بیخود کی ''انوار اللغات'' نامعلوم مصنف کی ''لغت منظوم'' ، ''قادر نامہ'' ، ''خوش حال صبیان'' حامد باری ، عبدالسمیع رام پوری کی ''حمدِ باری'' ، فارسی نامہ ، رسالہ فیض جاری ، مرشد ہادی موسوم بہ بیت اللغات ،

۱۔ لکھنؤ یونیورسٹی جرنل ، دسمبر ۱۹۲۲ع ۔

تعلیم الصبیان معروف بہ فرہنگ نامہ ، نصاب بے نظیر معروف بہ تحفۂ حامدیہ شامل ہیں ۔[1] اس میں مندرجہ بالا اٹھارہ منظوم لغات کا مختصر تعارف ہے ۔ بعد میں اس میں دو اور منظوم لغت عباس نامہ تصنیف محمد عباس رفعت شاگرد غالب اور نظم لغت از حاجی محمد اسماعیل خاں بھی شامل ہوئیں اور اسی شائع شدہ مضمون کے حاشیوں پر درج کی گئی ہیں ۔ اسی طرح ''اردو زبان کے لغت''[2] میں بھی بہت سی لغات کا تذکرہ کیا ہے ۔ اسی طرح انھوں نے اپنے ایک مضمون میں ''غازی الدین حیدر اور علم لغت''[3] میں اودھ کے اس پہلے بادشاہ کی لغت سے دلچسپی کا ذکر کیا جس نے خود فارسی کا ایک لغت ''فرہنگ رفعت'' کے نام سے تالیف کیا اور علماء سے ''تاج اللغات'' کے نام سے مرتب کرایا ۔ یہ بعد میں شائع بھی ہوا اور اس کی آٹھ جلدیں ہیں ۔ مسعود حسن رضوی کے ان مضامین کی تحقیقی اہمیت ہے ، اس لیے کہ بعض معلومات سے تاریکی کا پردہ اٹھا ہے اور اس طرح ان موضوعات پر کام کرنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا ہو گئیں اور مسعود حسن رضوی کے شوق زباندانی کا بھی علم ہوا کہ وہ زبان کے بارے میں کن موضوعات پر تحقیق کے رسیا تھے ۔

مسعود حسن رضوی نے ضرب الامثال پر بھی کام کیا اور ''فرہنگ امثال'' کے نام سے فارسی عربی کے اُن اقوال و اشعار کا مجموعہ مرتب کیا جو اردو میں ضرب الامثال ہو گئے ہیں ۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۷ء میں ، دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۹ء میں اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا ۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

''فارسی اور عربی کے بہت سے فقرے ، جملے ، مصرعے اور شعر ضرب المثل ہوگئے ہیں اور اردو تحریر و تقریر میں کثرت سے استعمال کیے جاتے ہیں ۔ مگر جو لوگ ان زبانوں سے ناآشنا ہیں ، انھیں ان کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے ۔ بعض لوگ اظہار قابلیت کے لیے فارسی عربی کے امثال جابجا لکھ مارتے ہیں جس سے قابلیت کی جگہ ناقابلیت کا اظہار ہوتا ہے ۔ ان مثلوں کو سمجھنے اور استعمال کرنے کے لیے ان کا مطلب اور محل استعمال

۱۔ خیابان ، لکھنؤ ، جنوری ۱۹۲۷ء ، ص ۱۵۶ — ۱۶۹ ۔
۲۔ ہندوستانی ، الہ آباد ، جنوری ۱۹۳۱ء ۔
۳۔ نیا دور ، لکھنؤ ، مارچ ۱۹۶۷ء ، ص ۳ - ۹ ۔

جاننا نہایت ضروری ہے ۔ ایک مدت سے میرا قصد تھا کہ ان مثلوں کو جمع کرکے لغت کے طور پر ردیف وار ترتیب دوں اور ہر مثل کا بامحاورہ ترجمہ ، اور اگر ضرورت ہو تو شرح ، بھی لکھوں ۔ ۔ ۔ امثال کی ترتیب میں انگریزی لغتوں کی تقلید کی گئی ہے ، یعنی مثلوں کے صرف حروفِ اول کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے بلکہ کل حرفوں کی ترتیب پر نظر رکھی گئی ہے ۔"[1]

فرہنگِ امثال میں اٰ سے ی تک ۱۲۶۲ مثلوں کو جمع کر دیا گیا ہے ۔ بظاہر یہ معمولی کام نظر آتا ہے لیکن یہ بہت بڑا کام ہے ۔ اتنی مثلوں کو جمع کرنا اور پھر ان کا فرہنگ تیار کرنا خاصا دقت طلب ہے ۔ اور آج جب کہ ہمارے ہاں فارسی جاننے والوں کی تعداد بہت کم ہے ، اس حوالے سے اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے اور اس سے اردو زبان پر محاوروں اور مثلوں کے استعمال پر عبور حاصل ہو سکتا ہے ۔ اردو میں فرہنگِ امثال جیسا مکمل کام ابھی تک نہیں ہوا ۔

چند مثالیں ملاحظہ کیجیے ۔ اس سے مسعود حسن رضوی کی محنت کا اندازہ ہو سکے گا :

(۷) آبِ رفتہ بہ جوئے باز آمد :

جو پانی بہہ گیا تھا وہ نہر میں واپس آیا ۔ یعنی گئی ہوئی رواق پلٹی ، بگڑا ہوا کام بن گیا ۔ (ص ۲)

(۲۰) آدمی را آدمیت لازم است
عود را گر بو نہ باشد ہیزم است

آدمی میں آدمیت ضرور ہونا چاہیے ۔ عود میں اگر خوشبو نہ ہو تو وہ محض ایندھن ہے ۔ یعنی جس طرح بغیر خوشبو کے عود میں اور دوسری لکڑیوں میں کوئی فرق نہیں ، اُسی طرح بے آدمیت کے آدمی میں اور دوسرے جانوروں میں کوئی فرق نہیں ۔ (ص ۳)

۱۔ دیباچہ فرہنگِ امثال ، طبع دوم ، ۱۹۳۹ء ۔

(۲۹۲) بعد از خرابی بصره :

بصرہ کی تباہی کے بعد ۔ جب کوئی کام بہت خرابیوں کے بعد انجام پاتا ہے تو یہ قول نقل کرتے ہیں ۔ (ص ۵۴)

(۴٦۸) چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد :

جب غرض آ پڑی ہنر چھپ گیا ۔ یعنی غرض مند آدمی کے ہنر پر نظر نہیں پڑتی ۔ (ص ۸۹)

(۸۲٦) علی الصباح چو مردم بہ کاروبار روند
بلا کشان محبت بکوئے یار روند

صبح کو جب اور لوگ اپنے اپنے کام پر جاتے ہیں ، محبت کی بلا میں گرفتار لوگ اپنے محبوب کی گلی کا راستہ لیتے ہیں ۔ یہ شعر اکثر اس موقع پر پڑھا جاتا ہے جب کوئی یہ کہنا چاہتا ہے کہ اور سب لوگ تو مزے میں اپنا اپنا کام کر رہے ہیں اور ہم ہیں کہ صبح ہوئی اور یہ ناگوار فرض ادا کرنے چلے ۔ (ص ۱٦۲ - ۱٦۳)

(۱۲٦۲) یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور :

کھویا ہوا یوسف پھر کنعاں میں آ جائے گا ، غم نہ کر ۔ یہ مصیبت کے دن کٹ جائیں گے اور پہلی حالت پھر واپس آئے گی ، اس لیے رنج نہیں کرنا چاہیے ۔ (ص ۱۴۵)

”نظام اردو“ سید انور حسین آرزو لکھنوی کی تصنیف ہے جو زبان و بیان اور قواعد و عروض پر گہری نظر رکھتے تھے ۔ اس کتاب میں انھوں نے فارسی اور انگریزی قواعد سے ہٹ کر خالص اردو قواعد کے حوالے سے گفتگو کی ہے ۔ اس میں خاص طور پر الفاظ کے استعمال سے بحث کی گئی ہے ۔ مسعود حسن رضوی نے اس پر حاشیے لگائے ہیں اور شرح طلب امور کی وضاحت کی ہے ۔ آرزو لکھنوی دیباچے میں لکھتے ہیں :

”یہ مختصر رسالہ دو حصوں میں منقسم ہے ۔ پہلے حصے میں اردو زبان کے اجزائے ترکیبی کی تشریح و تقسیم کے بعد حدود زبان بیان ہوئے ہیں جس سے اردو کا ایک اصولی اور مستقل زبان ہونا واضح ہوتا ہے ۔

دوسرے حصے میں استعمال الفاظ کے لیے وہ اصول وضع کیے گئے ہیں جن کے زیرِ اثر تمام الفاظ کے لیے عموماً اور مترادفات کے لیے خصوصاً محلِ استعمال مقرر ہو گئے ہیں ۔''۱

آرزو لکھنوی اس سلسلے میں درپیش مشکلات کا ذکر کرنے کے بعد مسعود حسن رضوی کی خدمات کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں :

''موصوف کی نکتہ رسی اور دقیقہ شناسی نے جہاں کتاب کو مفید عام مانا وہاں اسے لائقِ شرح بھی جانا ۔ بلکہ شرح کی تکلیف بھی خود گوارا فرمائی ۔ عام دستور ہے کہ متن کی اشاعت کے بعد اگر ضرورت سمجھی جاتی ہے تو شرح بھی لکھی جاتی ہے ، مگر اس کتاب کے لیے ، جس کا موضوع جدید ، مباحث دقیق ہیں ، بہتر یہی معلوم ہوا کہ کتاب مع شرح شائع ہو ۔ چنانچہ تبادلۂ خیالات سے جو مصنف و شارح میں ضروری تھا ، مفید نتیجے نکلے ۔ حصہ اول کی ترتیب میں کچھ تبدیلی ہوئی اور حصہ دوم میں بعض اجمالی بحثوں کی تفصیل ہو گئی ۔''۲

مسعود حسن رضوی نے اپنے دیباچے میں آرزو لکھنوی کی محنت ، عرق ریزی اور مہارت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے :

''یہ چھوٹی سی چند صفحوں کی کتاب ہے مگر اس کی تصنیف میں مصنف کو اردو زبان کی ساخت اور اس کے اسبابِ فصاحت پر برسوں غور کرنا پڑا ہے . . . ایک ایک قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد بنتا ہے . . . قاعدے بنانے کا ہفتخواں طے کرنے کے بعد جو مصیبت ناک منزل سامنے آتی ہے ان کا بیان کرنا ہے ۔ اس کام میں بڑی بڑی دقتیں پیش آتی ہیں ۔ ایک ایک لفظ تولنا پڑتا ہے ۔ اصطلاحیں گڑھنا پڑتی ہیں ۔ لفظوں کا مفہوم متعین کرنا پڑتا ہے ۔ مصنف نے اس منزل کو نہایت خوبی سے طے کیا ہے . . . ان منزلوں میں میں بھی مصنف کے ہمراہ تھا ۔ مجھے معلوم ہے کہ کتنی دفعہ تھوڑا تھوڑا

۱۔ نظامِ اردو ، از آرزو لکھنوؤ ، ص ۹ ۔
۲۔ ایضاً ، ص ۱۵ ۔

راستہ طے کرکے واپس آنا پڑا - کتنی دفعہ پوری مسافت طے کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سیدھی راہ نہ تھی - غرض نہ معلوم کتنی مرتبہ مطالب کو مقدم و مؤخر کیا - کتنی دفعہ قواعد کی ترتیب بدلی اور کتنی مرتبہ اُنھیں لفظوں کا جامہ پہنایا . . . اردو میں قواعد زبان کی بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں - لیکن ان کے مؤلفوں نے اکثر فارسی و عربی صرف و نحو کی تقلید کی ہے - کسی نے بہت جدت کی تو اردو کے قواعد کو انگریزی کے سانچے میں ڈھال دیا . . . اس کتاب کا موضوع ہے الفاظ ، بالخصوص مترادفات کا استعمال ِ برمحل - جہاں تک مجھے علم ہے ، اب تک اس موضوع پر کسی زبان میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی . . . اس کتاب پر کہیں کہیں توضیحی حاشیے لکھ دیے ہیں - افسوس ہے کہ یہ حاشیے عدیم الفرصتی کی وجہ سے جیسے ہونا چاہئیں تھے ، ویسے نہیں ہیں - پھر بھی اُمید ہے کہ اُن سے مصنف کا مطلب سمجھنے میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور ملے گی -''[۱]

مسعود حسن رضوی کی تحشیہ نگاری کی چند مثالوں سے اس کام کی افادیت کا اندازہ ہو سکے گا :

اصل : ''علم تنسیق ِ کلمات علم ِ بلاغت کا وہ شعبہ ہے جس میں اردو زبان کے لیے استعمال ِ مترادفات کے اصول بیان کیے گئے ہیں -

حاشیہ : (۱) اس علم کا خاص فائدہ یہ ہے کہ اس سے عبارت کے حسن و قبح سمجھنے اور بیان کرنے میں بہت مدد ملے گی -

(۲) علم ِ بلاغت کا یہ نیا شعبہ مصنف نے پہلے پہل قائم کیا ہے - کسی خاص لفظ کو کسی خاص محل پر استعمال کرنے یا نہ کرنے کے لیے بعض وجوہ تو پہلے بھی پیش کیے جاتے تھے ، لیکن کسی نے آج تک ان متفرق وجوہ کو کلیات

۱- نظام ِ اردو ، از آرزو لکھنوی ، ص ۱۸ - ۲۰ -

کے تحت منضبط نہیں کیا تھا - ہر علم کے مبادیات دماغِ انسانی میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں مگر ان کو مرتب کرنا اور انفرادی حقائق سے کلیات قائم کرنا اور ان کلیات میں ایک منطقی ترتیب پیدا کرنا ایک نئے علم کی بنیاد رکھنا ہے - چنانچہ اس مفہوم میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصنف نے اس نئے علم کی بنیاد رکھی -"[۱]

اصل : لفظ کسی جنس سے ہو ، دو حیثیتوں سے خالی نہیں ہو سکتا - یا یہ کہ وہ عادۃً زبان پر آتا ہو جیسے صبح - اسے معتدل کہیں گے کہ اسی قسم کے لفظ سے دائرہ اعتدال زبان قائم ہے -

حاشیہ : جو الفاظ عادۃً زبان سے نکلتے ہیں ، ان کے استعمال سے عبارت خوش آئند اور دل نشیں معلوم ہوتی ہے اور اپنے مزاج کے اعتبار سے حدِ اعتدال کے اندر رہتی ہے ، اسی لیے مصنف نے ان لفظوں کو معتدل کہا ہے -"[۲]

اصل : مناسبت اُس لگاؤ کا نام ہے جس کے اقتضائے حال سے ایک لفظ دوسرے کے ساتھ مانوس نظر آتا ہے -

حاشیہ : بالعموم مناسبتِ الفاظ اور رعایتِ لفظی کا مفہوم ایک سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت میں دونوں میں بڑا فرق ہے - رعایتِ لفظی میں الفاظ کے معنوی تعلق کا اعتبار ہوتا ہے - جیسے کسی جملے میں یوسف کی رعایت سے زندان ، عزیز ، مصر ، کنعان وغیرہ لانا یا بلبل کی رعایت سے گلشن ، قفس ، آشیانہ ، صیاد وغیرہ - اور مناسبتِ الفاظ سے مصنف نے الفاظ کے وہ باہمی تعلقات مراد لیے ہیں جو معنوی

۱- نظامِ اردو ، از آرزو لکھنوی ، ص ۲۵ -
۲- ایضاً ، ص ۶۳ -

تعلق کے علاوہ ہیں اور یہ بتایا ہے کہ لفظوں کے انتخاب اور ترتیب میں معنی کے علاوہ اُن کی کن کن حیثیتوں اور اور خصوصیتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔"[1]

نظامِ اردو کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات نظر آتی ہے کہ اصل متن سے حاشیے کہیں زیادہ ہیں اور مصنف کی ہر بات کو کھول کر سامنے لے آتے ہیں۔ مرزا جعفر حسین لکھتے ہیں:

"حقیقت تو یہ ہے کہ حاشیوں کی عبارت کتاب کے متن سے بہت زیادہ ہے۔ بیشتر صفحوں میں متن کی صرف دو تین سطریں ہیں اور پورا صفحہ حاشیوں سے بھرا ہوا ہے۔"[2]

اس تناظر میں اگر ہم بحیثیتِ مجموعی مسعود حسن رضوی کے قواعدِ زبان پر کام کا اندازہ لگالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس مد میں بھی انھوں نے ایسا تحقیقی و تنقیدی کام سرانجام دیا ہے کہ اس کی ایک مستقل اہمیت ہے اور انھوں نے جو افکار و نظریات اس سلسلے میں پیش کیے ہیں، ان سے اختلاف کرنے کی بہت کم گنجائش ہے۔ ان کے اس کام سے تحقیق کرنے والوں کے لیے راہ آسان ہو گئی ہے۔

۳۔ بحیثیت دیباچہ نگار و تبصرہ نگار

اردو میں مسعود حسن رضوی ادیب ایسے نقاد و محقق ہیں، جنھوں نے بہت کم کتابوں کے دیباچے لکھے اور اس کے ساتھ ساتھ بہت کم کتابوں پر تبصرے تحریر کیے۔ لیکن اس مد میں جو تھوڑا سا کام انھوں نے کیا، اُس میں بھی ان کی تنقیدی و تحقیقی بصیرت رنگ لائے بغیر نہیں رہتی۔ اس حصے میں بطور دیباچہ نگار اور بحیثیت تبصرہ نگار ان کی تحریروں کا جائزہ لیا جائے گا۔

بحیثیت دیباچہ نگار:

مسعود حسن رضوی نے دیباچہ نگاری نہیں کی۔ البتہ چار کتابیں ایسی ہیں جن کے دیباچے اور تعارف نامے لکھے۔ اس سلسلے میں وہ انکار کر دیا کرتے تھے۔

۱۔ نظامِ اردو، از آرزو لکھنوی، ص ۸۷۔

۲۔ مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات و خدمات، از مرزا جعفر حسین، ص ۱۵۱۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی رقم طراز ہیں :

"پروفیسر مسعود حسن رضوی کی ایک یہ بھی خصوصیت تھی کہ وہ کسی کے مسودے پر دیباچہ ، مقدمہ یا پیش لفظ وغیرہ نہیں لکھتے تھے ۔ اس معاملے میں پروفیسر احتشام حسین صاحب بہت فراخ دل واقع ہوئے تھے ۔ وہ ہر شاعر اور ادیب کے مجموعے پر مقدمہ اور پیش لفظ وغیرہ لکھ دیتے تھے ۔ سرور صاحب نے بہتوں کے مسودوں پر دیباچے لکھے ہیں ۔ اس کے باوجود وہ کچھ "نرخ بالا کن" کے قائل ہیں لیکن اس معاملے میں سب سے زیادہ سخت پروفیسر سید مسعود حسن رضوی صاحب ادیب تھے ۔ انھوں نے شاید ہی کسی کی کتاب پر پیش لفظ لکھا ہو ۔"[1]

اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ان چیزوں کو اپنے ادبی کاموں میں خلل کا باعث سمجھتے تھے یا اس بارے میں ان کا اپنا ایک معیار تھا ۔ بہرکیف انھوں نے چار دیباچے اور ایک فلیپ لکھا ہے جس کی تفصیل یوں ہے :

۱- عروجِ سخن : (مجموعۂ مراثی) ، از دولھا صاحب عروج (مقدمہ) ۔

۲- امیر مینائی : از شاہ محمد ممتاز علی آہ (پیش لفظ) ۔

۳- گلستانِ سعید : از چوہدری سید احمد عباس زیدی (تعارف) ۔

۴- افسانہ نگاری : از سید وقار عظیم (تعارف) ۔

ڈاکٹر صفدر آہ کی کتاب "میر اور میریات" پر مختصر فلیپ بھی لکھا ہے۔ دولھا صاحب عروج کے مجموعۂ مراثی "عروجِ سخن" کا مقدمہ مسعود حسن رضوی نے ۱۵ جنوری ۱۹۳۹ء کو تحریر کیا ہے ۔ یہ مقدمہ "حضرت عروج لکھنوی" کے نام سے ان کی کتاب "نگارشاتِ ادیب" میں شامل ہے ۔ اس مقدمے میں عروج کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اس کے مرثیوں پر سیرحاصل تبصرہ کیا گیا ہے ۔ چونکہ مسعود حسن رضوی نے خود بھی مجالس میں عروج کو مرثیہ

۱- نیا دور لکھنؤ ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ - اپریل ۱۹۷۷ء ، ص ۶۲ ۔

پڑھتے سنا تھا اس لیے مجالس کے حوالے سے بھی مرثیوں کی خوبیوں کا ذکر موجود ہے ۔

امیر مینائی اور گلستانِ سعید پر روایتی پیش لفظ لکھا ہے جس سے ان شاعروں کا تعارف ہو جاتا ہے ۔

سید وقار عظیم کی کتاب ''افسانہ نگاری'' پر مسعود حسن رضوی نے ۲ مئی ۱۹۳۵ء کو تعارف لکھا ۔ اس تعارف کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسعود حسن رضوی ، سید وقار عظیم کی صلاحیتوں کے معترف تھے اور ان سے بے پناہ توقعات رکھتے تھے ۔ اور جیسا کہ گزشتہ اوراق میں ''بحیثیتِ استاد'' کے تحت لکھا جا چکا ہے کہ سید وقار عظیم نے مسعود حسن رضوی کے ایما پر اردو میں ایم ۔ اے کیا تھا ۔ مسعود حسن رضوی تعارف میں لکھتے ہیں :

''سید وقار عظیم کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں بی ۔ اے کے طالب علم کی حیثیت سے میرے لیکچروں میں شرکت کرتے تھے ۔ اسی زمانے میں ان کو اردو ادب سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور ان کے سلامتِ ذوق اور جوشِ عمل سے مجھ کو یہ توقع پیدا ہو گئی تھی کہ ان کے ہاتھوں ہماری زبان کچھ قابلِ قدر خدمت انجام پائے گی ۔ خدا کا شکر ہے کہ میری وہ توقع پوری ہوئی اور آج میں دلی مسرت کے ساتھ اس جوان سال اور جوان ہمت مصنف کی پہلی تصنیف کا قارئین سے تعارف کرا رہا ہوں ۔ یہ امر میری مسرت میں اور اضافہ کر رہا ہے کہ یہ کتاب صرف ایک ہونہار مصنف کی پہلی تصنیف ہی نہیں ہے بلکہ اپنے موضوع پر اردو میں پہلی جامع تصنیف بھی ہے ۔''

یہ دیباچہ یا تعارف صرف پہلے ایڈیشن میں ہے ۔ بعد میں اسے نکال دیا گیا ۔ اس کی وجہ سید وقار عظیم کے مسعود حسن رضوی سے اختلاف ہیں ۔ ان اختلافات کی نوعیت علمی نہیں بلکہ ذاتی ہے ۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں جب ایم ۔ اے اردو کی کلاسز شروع ہوئیں تو لیکچرر کی ایک اسامی نکلی جس کے لیے سید وقار عظیم نے بھی درخواست دی لیکن اس پر احتشام حسین کا تقرر ہو گیا ۔ سید وقار عظیم اسے اپنے ساتھ زیادتی سمجھتے تھے ۔ چنانچہ وہ عمر بھر مسعود حسن رضوی سے شاکی رہے ۔ اس وجہ سے انھوں نے یہ تعارف بھی نکال دیا اور اکثر اپنی اس

حق تلفی[1] کا ذکر کرتے تھے ۔ مسعود حسن رضوی کی پوری زندگی کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ انھوں نے نہ تو کبھی کسی سے ناجائز رعایت کی اور نہ ہی غلط سفارش قبول کی ، بلکہ حق و انصاف کی روشنی میں فیصلہ کیا ۔ اس سلسلے میں

۱- محمد طفیل ، سید وقار عظیم کے بارے میں لکھتے ہیں :

''انھیں دو مرتبہ افسردہ دیکھا گیا ۔ ایک موقع وہ تھا کہ جب انھیں ۱۹۳۹ع میں بطور لیکچرار منتخب نہ کیا گیا ۔ اس کمیٹی کے صدر مسعود حسن رضوی تھے ۔ انھوں نے یقین دلا رکھا تھا کہ آپ کا حق ہے اس لیے آپ ضرور منتخب ہوں گے ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مخالفت صرف مسعود حسن رضوی نے کی تھی ۔ سید صاحب کہا کرتے تھے کہ میرا منتخب نہ ہونا اتنا بڑا دھچکا نہ تھا جتنا یہ کہ انسانیت پر سے اعتماد اٹھ گیا ۔'' (محبّتی ، از محمد طفیل ، ص ۴۷)

سید وقار عظیم کی یہ بات کہ مسعود حسن رضوی نے یقین دلا رکھا تھا کہ آپ کا حق ہے ، مسعود حسن رضوی کے مزاج کے خلاف ہے ۔ اور اگر انھوں نے یہ کہا ہوتا تو وہ ضرور اسے پورا کرتے ۔ اور پھر اس سیٹ پر احتشام حسین منتخب ہوئے اور یقینی طور پر اس وقت سید وقار عظیم کے مقابلے میں ان کی پوزیشن بہتر تھی ۔ خود مسعود حسن رضوی نے فروغ اردو لکھنؤ فروری ۱۹۷۴ع کے شمارہ خاص ''احتشام حسین نمبر'' میں اپنے ایک مضمون ''لکھنؤ یونیورسٹی میں احتشام صاحب کی ملازمت'' میں لکھا ہے :

''۱۹۳۸ع میں ایم ۔ اے کے نصاب میں اردو داخل ہوئی اور اردو کے ایک لیکچرر کے تقرر کی ضرورت ہوئی . . . احتشام صاحب نے بھی درخواست دی ۔ لکھنؤ آ کر مجھ سے ملے ۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھ کو ان کی موجودہ اہلیت اور آئندہ ترقی کے امکانات کا اندازہ ہو گیا ۔ سلیکشن کمیٹی کی میٹنگ ہوئی ۔ صدر شعبہ کی حیثیت سے میں نے احتشام صاحب کا نام پیش کیا ۔ کمیٹی کے بعض ممبروں نے میری تائید کی مگر ہم لوگ وائس چانسلر کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکے ۔ بہت کچھ بحث و مباحثے کے بعد آخرکار میری تجویز کے مطابق ووٹ ڈالے گئے اور کثرتِ رائے سے احتشام صاحب کا انتخاب ہو گیا ۔''

[بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر]

کئی واقعات ایسے ہیں جو اس بات کا ثبوت مہیا کرتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد حسن کی آپ بیتی نقوش کے آپ بیتی نمبر حصہ دوم صفحہ ۱۲۴۸ پر دیکھی جا سکتی ہے ۔ بہرطور مسعود حسن رضوی کو سید وقار عظیم سے جو توقعات تھیں وہ ان کی زندگی ہی میں پوری ہوئیں ۔

مسعود حسن رضوی نے ڈاکٹر صفدر آہ کی تالیف "میر اور میریات" پر چند سطروں کا ایک فلیپ بھی لکھا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''آپ کی تصنیفِ لطیف ''میر اور میریات''، عمیق و مدید غور و فکر کا ثمرہ اور تحقیق و تنقید کا ایک مثالی کارنامہ ہے ۔ آپ نے میر کے حالاتِ زندگی میں ان کے زمانۂ وقوع پر نظر کر کے بہت سی نئی اور مستند معلومات فراہم کر دی ہیں ۔ یہ چند سطریں نہ تبصرہ ہیں نہ تنقید ، یہ صرف اس بصیرت و مسرت کا بے ساختہ اظہار ہیں جو کتاب کے مطالعے سے مجھے حاصل ہوئی ہے ۔"

[بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ]

اس بیان سے مسعود حسن رضوی پر حق تلفی کا الزام قطعی طور پر غلط دکھائی دیتا ہے ۔ جبکہ بعد میں احتشام حسین کے تقرر نے یہ ثابت کر دیا کہ مسعود حسن رضوی کا فیصلہ صحیح تھا ۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی بتاتے ہیں :

''لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو لیکچرر کی اسامی نکلی تو مسعود حسن رضوی نے مجھے لکھا کہ میں درخواست دوں ۔ چنانچہ انٹرویو کے بعد میرا سلیکشن ہو گیا ۔ لکھنؤ کے بہت سے احباب اپنے بیٹوں یا ساتھیوں کے بیٹوں کے لیے اس اسامی پر تقرری کے خواہاں تھے ۔ مسعود حسن رضوی پر دباؤ بھی ڈالا گیا مگر چونکہ میرا میرٹ سب سے اچھا تھا اس لیے میرا انتخاب ہی ہوا ۔''

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سے گفتگو (ریکارڈنگ)
لکھنؤ ، ۲۸ مئی ۱۹۷۹ع

بحیثیت تبصرہ نگار :

مسعود حسن رضوی نے دیباچوں کی طرح تبصرے بھی کم لکھے - ان کے لکھے ہوئے تبصرے رسائل میں بھی شائع ہوئے - زیادہ تر تبصرے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے نشر ہوئے - تبصرے کے معاملے میں وہ سخت رویہ اختیار کرتے تھے اور صریحاً انکار کر دیتے تھے - ڈاکٹر سلام سندیلوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

۱۹۵۵ء میں میرا دوسرا مجموعۂ کلام ''نکہت و نور'' شائع ہوا - اس کی ایک جلد میں نے پروفیسر صاحب کی خدمت میں پیش کی - انھوں نے میری کتاب کو بعد میں پڑھا - اس کے کچھ عرصے بعد ایک روز لکھنو یونیورسٹی کی ٹیگور لائبریری میں میری اور ان کی ملاقات ہو گئی - انھوں نے میری نظموں کی بہت تعریف کی . . . اس وقت میں نے عرض کیا : ''نکہت و نور'' پر چند سطریں بطور تبصرہ لکھ دیجیے - مگر انھوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر میں آپ کی کتاب پر تبصرہ لکھوں گا تو پھر دوسرے لوگ بھی مجھ سے تبصرہ لکھانے کے خواہشمند ہوں گے اور میرا وقت ضائع کریں گے . . . . ۱۹۶۲ء میں میرا پی ایچ - ڈی کا مقالہ ''اردو رباعیات'' شائع ہوا تو میں نے اس کی ایک جلد پروفیسر صاحب کی نذر کی اور ساتھ ہی یہ درخواست کی کہ اس کے بارے میں چند جملے لکھ دیں ، مگر انھوں نے پھر انکار کر دیا اور کہا کہ اگر میں نے کسی کتاب پر تبصرہ لکھ دیا تو دوسرے لوگ میری ناک میں دم کر دیں گے اور مجھے گھیریں گے - اس طرح میرے ادبی کاموں میں خلل واقع ہوگا -"[۱]

لیکن اس کے باوجود مسعود حسن رضوی نے ازخود ڈاکٹر سلام سندیلوی کی کتاب ''مراثیٔ انیس میں جذباتی تاویل'' پر ایک خط میں مختصر ترین تبصرہ کرتے ہوئے انھیں لکھا :

''آپ کی کتاب ''مراثیٔ انیس میں جذباتی تاویل'' کوئی تین ہفتے ہوئے ملی تھی - میں نے اوقاتِ فرصت میں ذوق و شوق سے اس کا مطالعہ کیا -

---

۱- نیا دوز لکھنؤ ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ - اپریل ۱۹۷۷ء ، ص ۶۲ -

آپ نے جس وسعت و جامعیت کے ساتھ موضوعِ کتاب سے ناقدانہ بحث کی ہے اس کے لیے آپ داد اور مبارک باد کے مستحق ہیں ۔"[1]

مسعود حسن رضوی نے رسائل میں یا ریڈیو لکھنؤ سے جن کتابوں پر تبصرے کیے ان کی تفصیل یہ ہے :

۱۔ دکن میں اردو : نصیر الدین ہاشمی ، الناظر لکھنؤ ، اکتوبر ، نومبر ، دسمبر ۱۹۲۵ع ۔

۲۔ یادگارِ انیس : مولوی امیر احمد علوی ، الناظر لکھنؤ ، فروری ، مارچ ۱۹۲۷ع ۔

۳۔ قاضی محمود بحری اور 'سکھ سہیلا : محمد حفیظ سید ، ماہنامہ ادب لکھنؤ ، جولائی ۱۹۳۰ع

۴۔ گلشنِ گفتار : سید محمد ، ادب لکھنؤ ، جولائی ۱۹۳۰ع ۔

۵۔ خمخانۂ خلد یا بوستانِ رشید : رشید ، ادب لکھنؤ ، جولائی ۱۹۳۰ع ۔

۶۔ حیاتِ جلیل : مقبول احمد مقبول ، ادب لکھنؤ ، ستمبر ۱۹۳۰ع ۔

۷۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ : ڈاکٹر محی الدین قادری زور ، سب رس حیدر آباد دکن ، دسمبر ۱۹۴۲ع ۔

۸۔[2] چند ہم عصر : مولوی عبدالحق ۔

۹۔ چپ کی داد : مولانا حالی ۔

۱۰۔ اردو شاعری پر ایک نظر : کلیم الدین احمد ۔

۱۱۔ اردو شاعری کی مختصر تاریخ : جمیل احمد بریلوی ۔

۱۲۔ بزمِ اکبر : قمر بدایونی ۔

۱۳۔ ذکرِ غالب : مالک رام ۔

۱۴۔ قتیل ادر غالب : سید انور علی فرید آبادی ۔

۱۔ نیا دور لکھنو ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ-اپریل ۱۹۷۷ع ، ص ۶۲ ۔
۲۔ نمبر ۸ سے ۱۴ تک پر آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے تبصرے نشر ہوئے ۔

۱۵- باسی پھول : علی عباس حسینی ۔

۱۶- آئی ۔ سی ۔ ایس : علی عباس حسینی ۔

۱۷- مرقع بنارس : نبی احمد سندیلوی ۔

۱۸- سرپلی بالسری : آرزو لکھنوی ۔

۱۹- یادگارِ حامد : حامد علی خاں ، مرتبہ صفی لکھنوی ۔

۲۰- تاریخ الہ آباد (پہلی جلد) : مقبول احمد صمدانی ۔

۲۱- لطائفِ غالب : مرتبہ مسز ایم ۔ اے ۔ شاہ ۔

۲۲- کلیاتِ میر : مرتبہ عبدالباری آسی ۔

۲۳- روسی ادب : پروفیسر محمد مجیب ۔

۲۴- صحیفۃ الملت : صفی لکھنوی ۔

۲۵- افسانہٴ پدمنی : محمد احتشام الدین دہلوی ۔

۲۶- الہاماتِ شاد : شاد عظیم آبادی ، مؤلفہ عبدالمالک آروی ۔

۲۷- خوابِ بیداری : مترجم یوسف حسین زیدی ۔

۲۸- تفسیرِ حیات : ایم اسلم ۔

۲۹- مطائبات : سندباد جہازی ۔

۳۰- دیوانِ اظہر : اظہر علی اظہر ۔

۳۱- طلسمِ عمل : مترجم سید مجتبلی حسین جولپوری ۔

۳۲- ایک کہانی چھ ادیبوں کی زبانی : آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ ۔

۳۳- یورپ کی حکومتیں : سید نجم الدین جعفری و مظہر انصاری ۔

۳۴- دنیائے تبسم : شوکت تھانوی ۔

۳۵- ہندوستانی : تقریروں کا مجموعہ ، مکتبہٴ جامعہ دہلی ۔

۳۶- محکومیتِ نسواں : مترجم مولوی معین الدین انصاری ۔

۳۷- پھول والوں کی سیر : فرحت اللہ بیگ ۔

۳۸- اسلامی ہند : نیاز فتح پوری ۔

۳۹- لالہ رخ : مترجم لطیف الدین احمد ۔

۴۰- عہدِ حاضر کے بڑے لوگ : محمد مرزا دہلوی ۔

۴۱- اتاترک : محمد مرزا دہلوی ۔

اس فہرست میں چھوٹی بڑی ہر قسم کی کتابیں شامل ہیں ۔ ان میں چند کتابیں ایسی بھی ہیں جو اپنے موضوع کے اعتبار سے خاصی اہم ہیں اور مباحث کے لئے در کھولتی ہیں ۔ ان میں یادگارِ آلیس (امیر احمد علوی) ، چند ہم عصر (مولوی عبدالحق) ، چپ کی داد (مولانا حالی) ، اردو شاعری پر ایک نظر (کلیم الدین احمد) ، اردو شاعری کی مختصر تاریخ (جمیل احمد بریلوی) ، بزمِ اکبر (قمر بدایونی) ، ذکرِ غالب (مالک رام) ، قتیل اور غالب (سید انور علی فرید آبادی) ، باسی پھول اور آئی ۔ سی ۔ ایس (علی عباس حسینی) ، سریلی بانسری (آرزو لکھنوی) ، سلطان محمد قلی قطب شاہ (ڈاکٹر محی الدین قادری زور) ، کلیاتِ میر (مرتبہ عبدالباری آسی) ، روسی ادب (پروفیسر محمد مجیب) ، مطائبات (سندباد جہازی) اور دنیائے تبسم (شوکت تھانوی) ایسی ہیں جن کی روشنی میں مسعود حسن رضوی کی تبصرہ نگاری کا جائزہ لیا جا سکتا ہے ۔ تبصرہ نگاری ایک فن ہے ۔ نقاد اور تبصرہ نگار میں یقینی طور پر فرق ہوتا ہے ۔ چنانچہ شمس الرحمان فاروقی لکھتے ہیں :

''تبصرہ نگار کا رویہ نقاد کے رویے سے مختلف ہوتا ہے ۔ سب سے پہلا فرق تو یہ ہے کہ تبصرہ نگار کا مخاطب بہت فوری اور سامنے کا قاری ہوتا ہے . . . تبصرے کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُسے فوراً پڑھا جائے ۔ اس کے پڑھنے والے وہ لوگ ہوں جو مصنف کے اپنے عہد میں رہتے ہوں ، جو مصنف کو عصری ماحول کے تناظر میں دیکھ سکتے ہوں ۔ اچھے تبصرے بہت دیر تک زندہ رہتے ہیں اور رہے ہیں ۔''[1]

اس بیان کی روشنی میں جب ہم مسعود حسن رضوی کے تبصروں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ان میں بڑا تنقیدی اور تحقیقی شعور کارفرما نظر آتا ہے ۔ مسعود حسن رضوی جیسے کھرے ادیب کی ساری زندگی بات کو چھپانے میں

۱- شعر ، غیر شعر اور نثر : از شمس الرحمان فاروقی ، ص ۲۲۷ ۔

نہیں بلکہ برملا کہہ دینے میں گزری ۔ چنانچہ تبصروں میں بھی انھوں نے یہی رویہ اختیار کیا ہے اور اپنی پسند یا ناپسند کا اظہار کر دیا ہے ۔

نصیر الدین ہاشمی کی کتاب ''دکن میں اردو'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کتاب کا خلاصہ درج کر کے لکھا ہے :

''کتاب کے اس خلاصے سے بخوبی روشن ہو جاتا ہے کہ مؤلف نے اس کی تالیف میں کس قدر محنت کی ہے ۔ اب میں چند نقائص کی طرف قابل مؤلف کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ موجود نہ ہوتے تو کتاب کی وقعت اور بڑھ جاتی ۔ سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ مؤلف نے بعض نہایت اہم مسائل پر مطلق بحث نہیں کی . . . زبان اور انشا پردازی کے تدریجی ارتقاء سے بھی بحث نہیں کی گئی . . . مؤلف نے دکنی اور مدراسی شاعروں کا جو کلام انتخاب کیا ہے ، وہ اکثر قابلِ اعتراض ہے . . . شاعروں کے کلام کے بارے میں جو رائے ظاہر کی گئی ہے وہ بھی اکثر قابلِ تسلیم نہیں . . . ۔ دکن کے قدیم شعراء کا ذکر نہیں ۔ متاخرین کا کلام بھی زبان اور محاورے کی غلطیوں سے مملو ہے ۔ خود مؤلف کتاب کی عبارت بھی اس عیب سے پاک نہیں . . . مؤلف نے احکام الصلوٰۃ کو اردو نثر کی پہلی کتاب قرار دیا ہے . . . اسی طرح وجدی کو اردو کا سب سے پہلا شاعر قرار دیا ہے ۔''[1]

تحقیقی اعتبار سے مسعود حسن رضوی نے جو اعتراضات کیے ہیں ان کا جواب بھی اسی تبصرے میں موجود ہے ۔ آخر میں لکھتے ہیں :

''ہر دور کی نظم و نثر کے نمونے اس کثرت سے دیے گئے ہیں کہ اردو زبان اور اردو ادب کے ارتقاء پر بحث کرنے میں بڑی مدد ملے گی ۔''[2]

مولوی امیر احمد علوی کی کتاب ''یادگارِ انیس'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱- موجود ہے ۔

۲- موجود ہے ۔ الناظر لکھنؤ ۔ اکتوبر ، نومبر ، دسمبر ۱۹۲۵ع ۔

"یادگارِ انیس ، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے ، میر انیس مغفور کی سوانح عمری ہے اور ان کی شاعری پر تبصرہ ہے ۔ کتاب اپنے نام اور موضوع کی نوعیت میں خواجہ حالی کی مشہور کتاب "یادگارِ غالب" سے مشابہ ہے لیکن اس میں وہ تحقیق ، وہ دقتِ نظر ، وہ ہمہ گیری نہیں جو یادگارِ غالب میں ہے . . . ۔ مقدمے کے بعد ستر صفحوں میں میر انیس کے سوانح زندگی ، حالاتِ سفر اور لطائف و حکایات ہیں ۔ اس حصے میں زیادہ تر وہی باتیں ہیں جو انیس کے دوسرے سوانح نگار لکھ چکے ہیں ۔ اس کے بعد اکہتر صفحوں میں میر انیس کی شاعری پر نظر ڈالی گئی ہے ۔ کتاب کا یہ حصہ جو سب سے زیادہ توجہ کا مستحق تھا سب سے زیادہ بے توجہی سے لکھا گیا ہے . . . بہرحال عام پڑھنے والوں کے لیے مجموعی حیثیت سے یہ کتاب نہایت مفید اور نہایت دلچسپ ہے ۔ مؤلف کی بے لوثی ، بے تعصبی اور ادب کا سچا ذوق بات بات سے نمایاں ہے ۔"[۱]

مولوی عبدالحق کی کتاب "چند ہمعصر" پر ، جو خاکوں پر مشتمل ہے ، تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ایک اچھے انشا پرداز کے ہاتھ میں پہنچ کر الفاظ جادو کی کلیں بن جاتے ہیں یا بجلی کے کھٹکے کہ ایک اشارے میں کیا سے کیا کر دیتے ہیں اور سامعین و ناظرین کو نہ معلوم کس کس طرح متاثر کرتے ہیں ۔ وہ معمولی لفظوں کے جوڑ توڑ سے چھوٹے چھوٹے جملوں میں معنی کی دنیائیں اور اثر کے طلسمات دکھا دیتا ہے ۔ مگر ان مضمونوں میں یہ بات کہیں نہیں ملتی ۔ الفاظ اپنے لغوی معنوں سے زیادہ کچھ نہیں بتاتے ۔ جملے اپنے لکھنے والے کے دماغ تک تو رہنمائی کرتے ہیں مگر دل کا حال نہیں سناتے ۔ لفظوں میں انتقالِ ذہن کی قوت نہیں ، جملوں میں دل میں اُتر جانے کی صلاحیت نہیں ۔ عبارت ہر طرح کی رنگینیوں سے یہاں تک کہ تشبیہوں سے اور استعاروں سے بھی تقریباً پاک ہے ۔ نثر عاری اسی کو کہنا چاہیے . . . مصنف کی تحریر میں خوبیاں بھی ہیں :

۱- موجود ہے ۔

مشکل اور کم استعمال ہونے والے لفظوں سے پرہیز کرتے ہیں - ہندی الفاظ بڑے سلیقے سے برتتے ہیں ۔''[۱]

حالی کی معروف نظم ''چپ کی داد'' پر ان کا فاضلانہ تبصرہ ملاحظہ ہو ۔ لکھتے ہیں :

''حالی نے اصلاح کی دُھن میں اپنی شاعری پر بڑا ظلم کیا مگر اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری کے جمود کو توڑنے ، اس کو کارآمد بنانے اور اس کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے آزاد نے جس تحریک کی ابتدا کی تھی اس کو حالی نے خوب پھیلایا اور صفی ، چکبست ، اقبال اور جوش جیسے شاعروں کے لیے راستہ بنایا ۔ حالی کے اس احسان سے اردو شاعری کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی ۔''[۲]

کلیم الدین احمد کی کتاب ''اردو شاعری پر ایک نظر'' پر کئی طرح کی تنقیدیں ہوئی ہیں ۔ وہ خود بھی بڑے تیز ناقد ہیں ۔ ان کی تحریروں میں جو کاٹ ہے اس سے ان کی ٹھوس رائے کا واضح اظہار ملتا ہے ۔ ان کی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مسعود حسن رضوی رقمطراز ہیں :

''اس کے مطالعے سے مصنف کی غیرمعمولی جرأت کا قائل ہونا پڑتا ہے ۔ وہ رُو رعایت سے کام نہیں لیتے ، بے لاگ تنقید کرتے ہیں ، کسی کی شہرت اور مقبولیت سے مرعوب نہیں ہوتے اور کسی کے عیب بیان کرنے میں نہیں جھجکتے . . . ۔ لیکن جب نظموں کے اس مجموعے پر نظر کرنے بیٹھتے ہیں جو ''گل ِ نغمہ''[۳] کے نام سے حال میں شائع ہوا ہے تو ان کا قلم تنقید چھوڑ کر تقریظ پر اتر آتا ہے ۔ ان کا لب و لہجہ بدل جاتا ہے ۔ کبھی کہتے ہیں : ''یہ نظم اعلیٰ پیمانے کی شاعری کا بے مثال نمونہ ہے'' کبھی کہتے ہیں ''ہر نظم میں نئی شان ہے ، ہر نظم کا نیا ڈھنگ اور ہر نظم بے مثال ہے'' اور تبصرہ اس جملے پر ختم کرتے ہیں : ''یہ نظمیں ظاہری اور باطنی حسن کی نایاب مثالیں ہیں ۔''

۱- موجود ہے ۔

۲- موجود ہے ۔

۳- کلیم الدین احمد کے والد عظیم الدین احمد کا شعری مجموعہ ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''گل نغمہ'' پر نظر کرتے وقت کوئی جذبہ ، نقادی کے فریضے پر غالب آ جاتا ہے ۔''[1]

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی کتاب ''سلطان محمد قلی قطب شاہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''فاضل مصنف نے اس کتاب کو بہت محنت سے لکھا اور بہت سلیقے سے ترتیب دیا ہے ۔ انھوں نے واقعات اور حالات پر گہری نظر ڈالی ہے اور ان کو پیش کرنے میں وسعت نظر سے کام لیا ہے ۔ ڈاکٹر زور کی تحریروں میں ایک خوبی ہمیشہ نظر آتی ہے ، یعنی ان کا مقامی اور مذہبی تعصب سے آزاد ہونا ۔ یہ خوبی اس تصنیف میں بہت نمایاں ہے . . . اس کتاب میں جہاں بہت سی خوبیاں نظر آتی ہیں وہاں ایک کمی بھی محسوس ہوتی ہے ۔ ہر ادبی ذوق رکھنے والا اس کتاب میں محمد قلی قطب شاہ کے درباری شاعروں اور اس عہد کے ادبی ماحول اور ادبی چرچوں کا بیان ضرور تلاش کرے گا مگر اس تلاش کا نتیجہ کامل مایوسی کی شکل میں ظاہر ہوگا ۔ معلوم نہیں فاضل مصنف نے اس طرف توجہ کیوں نہیں فرمائی ۔''[2]

غالب محققوں اور نقادوں کا اہم ترین موضوع ہے ۔ مسعود حسن رضوی نے بھی اس مد میں جو کام کیا ہے گزشتہ اوراق میں اس کا تذکرہ ہو چکا ہے ۔ غالب کے سلسلے کی دو کتابوں ''ذکر غالب'' اور ''قتیل اور غالب'' پر جو تبصرے انھوں نے کیے ہیں ان سے ان کی غالب شناسی کا علم ہو جاتا ہے ۔ مالک رام کی تصنیف ''ذکر غالب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے غالب پر تحقیقی کام کا بھی جائزہ لیا ہے اور یوں غالب پر کیے گئے کاموں کی فہرست بھی دے دی ہے ۔ مصنف کو داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اس کتاب میں غالب کی زندگی اور ان کی تصنیفات کی تمام ضروری معلومات موجود ہیں ۔ کتاب کی ترتیب مصنف کے سلیقے کا ثبوت ہے ۔

۱- موجود ہے ۔

۲- سب رس ، حیدرآباد دکن ، دسمبر ۱۹۳۲ع ۔

اس سلیقے کی بدولت کتاب میں اس قدر اختصار پیدا ہوگیا ہے کہ گویا کوزے میں دریا بند کر دیا ہے۔''[۱]

''قتیل اور غالب'' سید انور علی فرید آبادی کی ہے جو غالب کی مخالفت اور قتیل کی حمایت میں لکھی گئی ہے - مسعود حسن رضوی نے اپنے تبصرے میں غالب سے عقیدت کے باوجود ایسی باتوں کی تائید کی ہے جن کے ذکر سے غالب کی عظمت میں فرق آیا ہے - یہی نہیں بلکہ قتیل کو غالب سے برتر ثابت کرنے کے دلائل سے اختلاف بھی کیا ہے اور اس کی لغزشوں اور فروگزاشتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔[۲]

قمر بدایونی کی تالیف ''بزمِ اکبر'' بھی مسعود حسن رضوی کے زیرِ تبصرہ رہی ہے - اس کے تمام مندرجات پر گفتگو کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

''جس طرح اکبر کے حالات لکھنے میں ان کے ذاتی تعلقات اور ان کی عزت و حمیت کے باوجود مؤلف نے ان کی معاشرت کے ناپسندیدہ پہلوؤں پر پردہ نہیں ڈالا ہے ، اسی طرح اکبر کے شاعرانہ کمال کے اعتراف اور شاعرانہ عظمت کے احساس کے باوجود ان کی شاعری کے نقائص بیان کرنے میں تامل نہیں کیا ہے۔''[۳]

یہ تو چند تحقیقی و تنقیدی کتابیں تھیں جن پر مسعود حسن رضوی نے معائب و محاسن کے حوالے سے تبصرے کیے - اور اب کچھ مختلف موضوعات پر ان کے تبصروں پر نظر ڈالتے ہیں - مسعود حسن رضوی آرزو لکھنوی کی شاعرانہ صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے ، اس لیے ان کے مجموعے ''سریلی بانسری'' پر بجا طور پر انھوں نے تعریفانہ تبصرہ[۴] لکھا ہے - ''روسی ادب'' پروفیسر محمد مجیب کی تصنیف ہے - مسعود حسن رضوی نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

''جو لوگ اس کتاب کا غور سے مطالعہ کریں گے ان کو ادبی تنقید کی نئی نئی راہیں مل جائیں گی اور ناقدانہ خیالات کے اظہار کے لیے نئے

۱- موجود ہے -
۲- موجود ہے -
۳- موجود ہے -
۴- موجود ہے -

لئے اسلوب ہاتھ آئیں گے . . . . جنابِ مصنف اردو ادب کے قدر دانوں کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک ایسے موضوع پر کتاب لکھی جس پر لکھنے والے اردو دانوں میں کمیاب ہیں ۔''۱

مسعود حسن رضوی نے علی عباس حسینی کے افسانوں کے دو مجموعوں ''باسی پھول'' اور ''آئی - سی - ایس'' پر مبصرانہ رائے کا اظہار کیا ہے ۔ ''باسی پھول'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''پریم چند کے بعد سے یہ کہنا ذرا مشکل ہو گیا ہے کہ ہندوستان کا بہترین افسانہ نگار کون ہے ۔ بہرحال یہ مسلم ہے کہ حسینی صاحب آج کل کے بہترین افسانہ لکھنے والوں میں ہیں . . . . اس مجموعے میں حسینی صاحب کے پرانے اور نئے افسانے شامل کر دیے گئے ہیں اور یہ نہیں بتایا گیا کہ کون افسانہ کب لکھا گیا تھا ۔ اس کمی کی وجہ سے پڑھنے والے ان تدریجی تبدیلیوں کا اندازہ نہ کر سکیں گے جو ان کے نقطۂ نظر اور اندازِ بیان میں ہوتی رہی ہیں ۔''۲

علی عباس حسینی کے ایک اور مجموعے ''آئی - سی - ایس'' کے افسانوں پر ناقدانہ رائے دینے کے بعد مجموعی بات کہتے ہوئے لکھتے ہیں :

''حسینی صاحب کے بیان میں ادبیت اور زبان میں وہ نرمی ہے جو افسانوں کے لیے ضروری ہے ۔ ان کو جذبات کی ترجمانی اور مناظر کی مرقع کشی پر قدرت ہے . . . . ان کی افسانہ نویسی تمام تر انھی کے تخیل کی منّت گزار ہے . . . . تنقید کی نگاہ کو ان افسانوں میں کہیں کہیں کوئی نقص یا خامی بھی نظر آ جاتی ہے مگر ایسے چھوٹے چھوٹے نقائص سے کوئی لکھنے والا محفوظ نہیں رہ سکتا ۔''۳

اب ظریفانہ مضامین کے دو مجموعوں ''مطائبات'' اور ''دنیائے تبسّم'' پر مسعود حسن رضوی کے تبصرے ملاحظہ ہوں ۔ ''مطائبات'' سندباد جہازی

۱- موجود ہے ۔
۲- موجود ہے ۔
۳- موجود ہے ۔

(چراغ حسن حسرت) کے ظریفانہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں :

"مصنف نے ان مضامین میں ظرافت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے مگر اکثر یہ رنگ بہت ہی ہلکا چڑھا ہے اور بعض جگہ تو شاید چڑھا ہی نہیں . . . اس کتاب میں چند سنجیدہ مضامین بھی ہیں۔ ان کو پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ جناب سندباد جہازی صاحب نے اپنے قلم کی جولانی کے لیے ظرافت کا میدان منتخب کرنے میں اپنی اُفتادِ طبع پر بخوبی غور نہیں فرمایا ۔ وہ سنجیدہ مضامین اچھے لکھتے ہیں۔ ان مضامین میں کہیں کہیں بے ساختہ ظرافت کا رنگ آ جاتا ہے تو مزہ دے جاتا ہے مگر جب موصوف ارادہ کر کے کوئی ظریفانہ نوٹ لکھنے بیٹھتے ہیں تو وہ ظرافت کا ایک بے روح پیکر بن کر رہ جاتا ہے۔"[۱]

شوکت تھانوی کے ظریفانہ مضامین کے مجموعے "دنیائے تبسم" پر تبصرہ کرتے ہوئے مسعود حسن رضوی رقمطراز ہیں :

"ہر شخص ان مضامین کو پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے اپنا غم غلط کر سکتا ہے۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو مصنف کی کامیابی میں شبہ کی گنجائش نہیں ۔"[۲]

اس کتاب کا دیباچہ رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے۔ مسعود حسن رضوی نے اپنے تبصرے میں دیباچے کے بعض مندرجات سے بھی اختلاف کیا ہے ۔

یوں مسعود حسن رضوی نے دیباچہ نگاری اور تبصرہ نگاری کو اپنایا نہیں بلکہ اکثر تبصرے ضرورتاً یا مجبور ہو کر لکھے ہیں۔ جہاں تک دیباچہ نگاری کا تعلق ہے انھوں نے جو بھی چار دیباچے لکھے ہیں وہ محض تعارف نامے ہیں جن میں کہیں کہیں فن کار کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اور جو کچھ انھوں نے مصنفین یا مؤلفین کے بارے میں کہا ہے اس میں اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے اس لیے کہ مختصر سہی مگر انھوں نے صحیح تجزیہ پیش کیا ہے

۱- موجود ہے ۔

۲- موجود ہے ۔

اور یہی دیباچہ نگار کا بنیادی رویہ ٹھہرتا ہے ۔ تبصرہ نگاری میں البتہ وہ کافی کھل کر سامنے آئے ہیں ۔ جن کتابوں پر انھوں نے تبصرے لکھے ہیں ان کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ان کتابوں کے بھرپور مطالعے کے بعد قلم اُٹھایا ہے ۔ مصنف کی خوبیوں کی داد دی ہے اور خامیوں کی نشان دہی کی ہے ۔ کمیوں کے بارے میں مناسب مشورے دیے ہیں ۔ ان تبصروں میں کہیں بھی ذاتی تعصب یا علمی رعب جمانے کی دانستہ یا غیر دانستہ کوشش نہیں کی ۔ تبصرے متوازن اور آراء معتدل ہیں جن میں ان کی صحیح تحقیقی اپروچ کا پتہ چلتا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے تنقیدی خیالات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ انشائیہ یا خاکہ میں کس قسم کا اسلوب چاہتے ہیں اور ان کے خیال میں نثر کی کیا خوبیاں ہونی چاہییں ۔ بعض تبصروں میں ان کی کھری اور سچی رائے بغیر کسی جھجک یا رکاوٹ کے سامنے آ جاتی ہے اور وہ تنقید کے فرائض دیانت داری سے ادا کرنے میں کسی طرح نہیں ُچوکتے ۔ تبصرے میں وہ محاسن و معائب دونوں کا بیان کر دیتے ہیں ، خاص طور پر مصنف کو نظرثانی کے لیے مفید مشورے دیتے ہیں ۔

اگر صحیح تبصرے کی تعریف یہ ہے کہ اس کے ذریعے کتاب کے مندرجات کو واضح کر دیا جائے تاکہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والا کتاب پر تبصرہ پڑھ کر اسے حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو اس کلیے کی روشنی میں مسعود حسن رضوی تبصرہ نگاری کے معیار پر پورا اُترتے ہیں ، اس لیے کہ انھوں نے ہر تبصرے میں کتاب کی ہر بات واضح کر دی ہے ۔ ان تبصروں سے نہ صرف پوری کتاب کا خاکہ سامنے آ جاتا ہے بلکہ اس کی خامیوں اور خوبیوں کا بھی علم ہو جاتا ہے ۔ اس طرح تبصرہ نگاری میں مسعود حسن رضوی کا ایک منفرد مقام بنتا ہے اور تحقیقی و تنقیدی حوالے سے ان کے تبصرے جان دار بھی ہیں اور اہم بھی ۔

۴۔ بحیثیت مکتوب نگار

خطوط نگاری ادب کی مستقل صنف بن گئی ہے ۔ اور یہ ایک ایسی صنف ہے جس سے ہر خیال کا آدمی خواہ وہ چھوٹا ہے یا بڑا ، عوام سے تعلق رکھتا ہے یا خواص سے ایک طرح کا لطف اُٹھاتا ہے ۔ خطوط میں انسانی زندگی کے ہر پہلو پر بحث کی جاسکتی ہے ۔ ایک اچھے مکتوب نگار کے خطوں میں ہر شخص کو

اپنے ذوق کی کوئی نہ کوئی بات مل ہی جاتی ہے اور اس طرح اس کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم ہو جاتا ہے ۔ خطوط سے جہاں مکتوب نگار کی نجی زندگی سے پردہ اُٹھتا ہے ، وہاں اس کے ارد گرد کے ماحول کا بھی اندازہ ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خطوط سوانح نگاری کی جان ہوتے ہیں ۔ اس لیے کہ ایک اچھے مکتوب نگار کے خطوں میں اس کی ذات کے علاوہ اس کا عہد بھی بول رہا ہوتا ہے ۔ یہی کیفیت خانگی خطوط اور نجی خطوں کی ہوتی ہے کہ ان میں مکتوب نگار کی ذات کے مخفی گوشے بھی سامنے آ جاتے ہیں ۔ مولوی عبدالحق ''خطوطِ شبلی'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں :

> ''خانگی خطوط میں اور خاص کر اُن خطوں میں جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ، ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے جو دوسری تصالیف میں نہیں ہوتی ۔ ان کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے ۔ تکلف کا پردہ بالکل اُٹھ جاتا ہے اور مصلحت کی در اندازی کا کھٹکا نہیں رہتا ۔ گویا انسان اپنے سے خود باتیں کر رہا ہے ۔''

یوں دیکھا جائے تو مسعود حسن رضوی کے خطوں کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ، ایک وہ خطوط جو انھوں نے اپنی بیگم کو لکھے اور جن میں مسعود حسن رضوی کے اندر کا انسان بولتا دکھائی دیتا ہے ۔ دوسرے وہ خط جو علمی و ادبی ہستیوں کو لکھے گئے ۔ لیکن ایک خاص بات یہ ہے کہ مسعود حسن رضوی کے مکتوب الیہ حضرات میں ہر طرح کے لوگ شامل ہیں ۔ ان میں طالب علم بھی ہیں اور شاعر بھی ، محقق بھی ہیں اور عالم بھی ۔ البتہ نجی خطوط بہت کم ہیں ۔ یعنی رشتہ داروں ، عزیزوں یا دیگر دوستوں کو انھوں نے بہت کم خط لکھے ہیں ۔ بہرکیف مسعود حسن رضوی سب کو ان کے مقام و مرتبے کے مطابق جواب دیتے ہیں ۔ مسعود حسن رضوی کے بارے میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ وہ خطوں کا جواب بہت کم دیتے تھے ۔ شاید یہ بات کسی حد تک درست بھی ہو ، اس لیے کہ مسعود حسن رضوی اپنے علمی و ادبی مشاغل میں اس درجہ مصروف رہتے تھے کہ اُنھیں جواب لکھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی ۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر خطوں میں کسی نہ کسی مسئلے کے بارے میں استفسار ہوتا تھا اور خاص طور پر تحقیقی معلومات حاصل کی جاتی تھیں ۔ مسعود حسن رضوی کا حافظہ کتنا ہی بلا کا سہی مگر مستند حوالے کو دیکھنے کے لیے پرانی کتابوں ، فائلوں یا لکھی ہوئی یادداشتوں کی ورق گردانی

کرنا پڑتی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ بڑا دشوار کام تھا ۔ ایک اور بات یہ تھی کہ مسعود حسن رضوی دردِ سر کے پرانے مریض تھے اور اکثر یہ عارضہ اُنھیں لاحق ہوتا تھا جس کی وجہ سے وہ دماغی کام بڑی دیر تک نہیں کر سکتے تھے ۔ اس طرح دیگر کاموں کے ساتھ ساتھ خطوں کے جواب میں بھی تاخیر ہو جاتی تھی ۔ اس کا ذکر انھوں نے اکثر خطوں میں کیا ہے ۔ مسعود حسن رضوی کے خطوط کا ایک مجموعہ ڈاکٹر قمر جہاں ترتیب دے رہی ہیں ۔ اس طرح ان کے نام خطوں کا ایک منتخب مجموعہ ڈاکٹر نیر مسعود نے مرتب کیا ہے ۔ ان دونوں مجموعوں کی اشاعت کے بعد یہ اعتراض بالکل ختم ہو جائے گا کہ مسعود حسن رضوی خطوں کے جواب کم دیتے تھے ۔

مسعود حسن رضوی کے خطوط ان کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں اور ان میں ان کی ذات کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا ہے ۔ وہ بڑا صاف ستھرا خط لکھتے تھے اور غیر ضروری تفصیلات سے گریز کرتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر و بیشتر خطوط مختصر ہیں اور ایسے خط کارڈ پر لکھے گئے ہیں ۔ مختار الدین احمد ان کی مکتوب نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں :

''آپ کی ان سے صرف خط و کتابت رہی ہے ، تو ان کی تحریر کی ہر سطر سے نفاست پسندی کی جھلک آپ کو ملی ہوگی ۔ خط کا کاغذ صاف ستھرا ہوگا ۔ اگر انھوں نے لفافہ بھیجا ہے ، تو چھپے ہوئے لیٹر پیڈ پر ان کا خط ہوگا ۔ روشنائی اچھی ہوگی ۔ قلم کی لب درست حالت میں ہوگی اور حرف ایسے خوبصورت اور واضح ہوں گے کہ آپ کو اُن پر آفسٹ طباعت کا شبہ ہو ۔ مختصر تحریروں میں اور چھوٹے موٹے رقعوں میں اکثر لوگ ہاتھ روک کر لکھ لیتے ہیں ۔ لیکن میں نے ان کے کئی کئی ورق کے خط اور مضمون دیکھے ہیں جن کی سطریں بالکل سیدھی ہیں اور خط کا انداز شروع سے آخر تک بالکل یکساں ہے۔''[1]

پروفیسر سید حسن نے مسعود حسن رضوی کے خطوط کی ایک اور خوبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

''ان کی مکتوب نگاری کا ایک ظاہری وصف یہ ہے کہ سرنامہ پر اپنا

۱- مسعود حسن رضوی ادیب ۔ ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۸۹ ۔

پورا پتہ ہر خط میں ضرور لکھتے ہیں ۔ اس سے مکتوب الیہ کو جواب دینے میں بڑی سہولت ہوتی تھی ۔ پتے کے لیے حافظے کو کریدنا یا نوٹ بک کے اوراق اُلٹنا نہیں ہوتے تھے ۔"[۱]

اس تناظر میں جب ہم مسعود حسن رضوی کے خطوط کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی تحریر سے نفاست اور عمدگی ٹپکتی ہے ۔ مطلب کی بات کے علاوہ کوئی زائد جملہ یا فقرہ نہیں لکھتے ۔ اگر کسی نے کسی چیز کے بارے میں استفسار کیا ہے تو فقط وہی بات لکھی ہے ۔

مسعود حسن رضوی کے خانگی خطوط کا ذکر پہلے باب میں "بیوی سے تعلقات" کے ضمن میں آ چکا ہے ۔ یہاں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیگم کے نام خطوں میں مسعود حسن رضوی جیسے سنجیدہ اور متین شخص نے عشق و محبت کا ذکر کیا ہے ، وہ خاصی اچنبھے کی بات ہے ۔ اگرچہ یہ خط بیگم کی طرف سے شکایات کا جواب ہیں ، مگر مسعود حسن رضوی نے ایسا اسلوب اختیار کیا ہے کہ ہر سطر سے پیار اور ہمدردی جھلکتی ہے ۔ اور خود مسعود حسن رضوی کی رومانوی طبیعت کا بھی پتہ چلتا ہے ۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ مسعود حسن رضوی کے خطوط اُن کے مزاج کے آئینہ دار ہیں ۔ مسعود حسن رضوی جس وضع داری کا نمونہ تھے اور جس طرح وہ تعلقات کی پاسداری کرتے تھے ، دوسروں سے بھی وہ اسی قسم کا تقاضا کرتے ہیں ۔ مفتی رضا انصاری کے نام ١٦ ۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"یقین تھا کہ آپ مجھ سے ضرور ملیں گے ، لیکن آپ بغیر ملے ہوئے واپس چلے گئے ۔ وضع داری کے خلاف یہ طرزِ عمل خلافِ توقع ہے ۔ اب میری عمر اسّی برس کی ہے ۔ جسمانی اور دماغی ضعف روز افزوں ہے ۔ بصارت میں بھی کمی ہو رہی ہے ۔ ان حالات میں اگر کوئی دیرینہ مخلص بیگانگی کا مظاہرہ کرتا ہے تو بہت تکلیف ہوتی ہے ۔"[۲]

۱۔ نیا دور لکھنؤ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ ۔ اپریل ۱۹۷۷ء ، ص ۷ ۔
۲۔ نیا دور لکھنؤ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ ۔ اپریل ۱۹۷۷ء ، ص ۳۵ ۔

اسی طرح ایک خط میں انھوں نے ڈاکٹر سلام سندیلوی کے نہ آنے کا شکوہ کیا اور انھیں لکھا :

''آپ کی ملاقات کا بہت مشتاق ہوں ۔ کسی دن زحمت کرکے تھوڑی دیر کے لیے آ جائیے ۔''[1]

مسعود حسن رضوی نے اپنے خطوط میں اپنی بیماری کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اس ضمن میں وہ خطوں کے جواب وقت پر نہ دے سکنے کی وجہ بیان کرتے ہیں ۔ محمد عبداللہ خاں خویشگی کو ۱۰ نومبر ۱۹۶۲ء کو لکھتے ہیں :

''گرامی نامے کا جواب ایک مہینے کے بعد لکھنے بیٹھا ہوں ۔ سبب یہ ہوا کہ میں ادھر کئی ہفتے بیمار اور چند روز صاحبِ فراش رہا ۔ جب ذرا طبیعت درست ہوئی تو وہ ضروری کام جو بیماری کی وجہ سے پڑے رہ گئے تھے ، ان کی انجام دہی نے فرصت نہ دی ۔ بہرحال میں اس غیر معمولی تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں ۔''[2]

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی غالب کے سلسلے میں خاصا تحقیقی کام کر چکے ہیں ۔ ان کے نام اکثر خطوں میں مسعود حسن رضوی نے اپنی بیماری کا تذکرہ کیا ہے ۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۵۰ء کے خط[3] میں انھیں لکھتے ہیں :

''یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں دردِ سر کا پرانا مریض ہوں ۔ ادھر چند ماہ سے سر میں اتنی تکلیف رہنے لگی ہے کہ پڑھنے لکھنے کا کام بالکل بند ہو گیا ۔''

۹ دسمبر ۱۹۵۱ء کے خط[4] میں لکھتے ہیں :

''مدت ہوئی آپ کا کارڈ اُس وقت پہنچا ، جب میں دردِ گردہ کی شدید تکلیف میں مبتلا تھا ۔ اس کے بعد سے اب تک کوئی نہ کوئی شکایت پیدا ہوتی ہی رہی ۔ دماغی تکلیف تو مستقل ہی رہتی ہے ۔''

۱۔ مطالعہ و مشاہدہ ، از ڈاکٹر سلام سندیلوی ، ص ۴ ۔
۲۔ بوستانِ قلم ، مرتبہ محمد عبداللہ خاں خویشگی ، ص ۶۹ ۔
۳۔ موجود ہے ۔
۴۔ موجود ہے ۔

اسی طرح ۱۸ مارچ ۱۹۵۲ع او ۲ جنوری ۱۹۵۷ع کے خطوں[1] میں بھی ذکر ہے - ۲۰ ستمبر ۱۹۶۸ع کے ایک خط[2] میں لکھتے ہیں :

''تاخیر کا سبب میری بیماری ہے - میں ۱۰ - اپریل کو بیمار ہوا اور اب تک اچھا نہیں ہوا ہوں - یہ پانچ مہینے دس دن کی مدت زیادہ تر پلنگ پر لیٹے ہوئے گزری ہے -''

مسعود حسن رضوی ادیب بعض اوقات اپنے نجی اور ذاتی غم کی بات بھی خطوں میں کر جاتے ہیں - ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام ۱۷ دسمبر ۱۹۴۷ع کے ایک خط[3] میں لکھتے ہیں :

''میری بہن جو فسادات کے زمانے میں لدھیانہ کے مقتل میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ لاہور پہنچ گئی تھیں اور اس شہر کو دارالامن سمجھ رہی تھیں ، ان کا سترہ برس کا ہونہار لڑکا ، جو ہیلی کالج آف کامرس میں پڑھ رہا تھا ، قتل کر ڈالا گیا - ہم سب لوگ اس مرحوم کو بہت عزیز رکھتے تھے - اس کا بڑا بھائی بھی چند سال ہوئے ایک اتفاق حادثے سے یکایک اپنی دائمی مفارقت کا داغ دے گیا تھا - اب اس کی ناگہانی موت سے تو دل پر ایسا زخم لگا ہے کہ جو کبھی مندمل نہ ہوگا -''

مسعود حسن رضوی کبھی کبھار اپنے بیٹوں کو بھی خط لکھ دیتے تھے - ڈاکٹر اختر مسعود رضوی کو ۲۹ ستمبر ۱۹۶۳ع کے خط[4] میں لکھتے ہیں :

''حامل رقعہ سید سردار مہدی رضوی سے تم غالباً واقف ہو گے - وہ اکتوبر کے آخری ہفتے میں پاکستان کے سفر کا قصد رکھتے ہیں - ان کی منزلِ مقصود تو کراچی ہے لیکن اپنے ایک عزیز سے ملنے کے لیے وہ پشاور بھی جائیں گے - وہاں وہ تم سے بھی ملنا چاہتے ہیں - اگرچہ

۱- موجود ہے -
۲- موجود ہے -
۳- موجود ہے -
۴- موجود ہے -

کوئی ضرورت نہیں ہے مگر ان کی خواہش کے مطابق یہ چند سطریں
تعارف کے لیے لکھ دی ہیں ۔"

مسعود حسن رضوی کے اکثر خطوط علمی و ادبی ہیں جو تحقیقی اعتبار سے خاصی اہمیت کے حامل ہیں ۔ ان میں ایسے ایسے استفسارات کے جواب دیے گئے ہیں جو اور کوئی نہیں دے سکتا تھا ، اس لیے یہ معلومات ان کے پاس یا ان کے کتب خانے میں قلمی نسخوں کی صورت یا کسی اور شکل میں موجود تھیں ۔ خاص بات یہ ہے کہ مسعود حسن رضوی نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا ۔ اپنی بیماری اور بڑھاپے کا ذکر کرنے کے بعد مشفق خواجہ کے نام ۲۳/۲۷ جنوری ۱۹٦۷ء کے ایک خط[1] میں لکھتے ہیں :

"اسی عالم میں اکثر ایسے خط آتے رہتے ہیں جن میں کچھ لکھ کر
یا کچھ نقل کر کے بھیجنے کی فرمائش ہوتی ہے ۔ امکان ہوتا تو کسی
کی فرمائش رد نہ کرتا ، مگر کیا کروں ، ہر طرح کا ایثار کرکے تنہا کام
کرتا ہوں ۔"

بہرحال مسعود حسن رضوی نے حتی الوسع معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے ۔ چند خطوں کے اقتباسات سے نادر معلومات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"میر نے ذکرِ میر پچاس برس کی عمر میں ختم کرکے اس کی تاریخ یوں
کہی تھی :

مسمی بہ اسمے شد اے باہنر
کہ ایں نسخہ گردد بعالم سمر
ز تاریخ آگہ شوی بے گماں
فزائی دہ و شش عدد گر براں

ذکرِ میر کے عدد ۱۱۷۰ ہیں ۔ ان میں ۱٦ جوڑیے تو ۱۱۸٦ ہوئے ۔
بعد کو دس برس کے حالات کا اضافہ کرکے چوتھا بدل کر یوں کر دیا :
"فزائی عدد بست و ہفت ار براں" اب سالِ اختتام ۱۱۷۰ + ۲۷ = ۱۱۹۷

۱۔ موجود ہے ۔

ہو گیا - یعنی ذکر میر ختم کرتے وقت میر کی عمر پچاس یا ساٹھ برس کی تھی - اس طرح ان کا سالِ ولادت ہوا تقریباً :

$$1186 - 50 = 1136$$

$$1197 - 60 = 1137$$

مگر قرائن ایسے موجود ہیں کہ میر کی ولادت ۱۱۳۵ کے اواخر میں ہوئی اور ان کا انتقال نوے سال کی عمر میں ۱۲۲۵ ہوا - وہ قرائن کیا ہیں ، یہ لکھنے کی فرصت نہیں -"[1]

اسی طرح ٦ - اگست ١٩٦٧ع کے ایک خط[2] میں ڈاکٹر صفدر آہ کو لکھتے ہیں :

"آپ کے استفسار کے جواب میں تحریر ہے کہ شیخ علی حزیں کا سال وفات جو براؤن نے لکھا ہے ، وہ صحیح نہیں ہے - علامہ آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ میں حزیں کی تاریخِ وفات شبِ یازدہم جمادی الاول ۱۱۸۰ھ لکھی ہے جو ١٥ - اکتوبر ١٨٦٦ع کے مطابق ہے - اسی تاریخ کو صحیح سمجھنا چاہیے - آزاد نے حزیں کا سالِ وفات اس مصرعے سے نکالا ہے : "از فوتِ حزیں ، حزیں دلِ ماست" -

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کے بعض استفسارات کا جواب بھی مسعود حسن رضوی نے دیا ہے - ٢٦ دسمبر ١٩٥٠ع کے ایک خط[3] میں لکھتے ہیں :

"میرے کتب خانے میں واجد علی شاہ کی کوئی ساٹھ کتابیں ہیں - ان کے نام لکھنا ایک کام ہے . . . دیوانِ مغربی کا جو نسخہ میرے پاس ہے ، اس میں ٩٥ ورق یعنی ١٩٠ صفحے ہیں - تاریخِ کتابت ۸ شعبان ۱۱۹۳ھ ہے - آخری رباعی کا پہلا مصرع یہ ہے : "اے حسن تو درکل مظاہر ظاہر -" واجد علی شاہ کی جو کتابیں میرے پاس موجود ہیں ، ان

١- موجود ہے -

٢- موجود ہے -

٣- موجود ہے -

کے علاوہ پندرہ بیس کتابیں اور ہیں ، جو میری نظر سے گزر چکی ہیں ۔ دیوانِ مغربی کا جو نسخہ میرے پاس ہے وہ مکمل دیوان ہے ۔ دیوان کا انتخاب نہیں ہے ۔''

۱۳ جنوری ۱۹۵۶ء کے ایک خط[1] میں لکھتے ہیں :

''دہ مجلس نام کی متعدد کتابیں ہیں ۔ کوئی نظم میں کوئی نثر میں اور کوئی مخلوط نظم و نثر میں انتہائی ۔ تلاش کے باوجود فضلی کی دہ مجلس کا پتہ کہیں نہیں لگا ۔''

ڈاکٹر سلام سندیلوی کے استفسار کے جواب میں ۱۱ ستمبر ۱۹۵۹ء کو لکھتے ہیں :

''فضلی کی کتاب کا اصل نام ''کربل کتھا'' ہے ۔ یہ کتاب ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب ''روضۃ الشہدا'' کا ملخص ترجمہ ہے ۔ . . . ہماری اس وقت تک کی معلومات کے لحاظ سے کربل کتھا شمالی ہند میں اردو نثر کی پہلی کتاب ہے جو محمد شاہ کے عہدِ حکومت میں لکھی گئی ۔''[2]

اسی طرح کسریٰ منہاس کے ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

'' ''تحریر الشہادتین'' کا سنہ طباعت ۱۲۰۸ھ نہیں ہو سکتا ۔ شاید ۱۳۰۸ھ ہو ۔ ہندسوں کو لکھنے میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے ۔ بہرحال بغیر کتاب کو دیکھے ہوئے کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی ۔ طوطی نامہ کلیاتِ میر جعفر میں شامل ہے ۔ ایک مشہور روایت کے مطابق میر جعفر کا انتقال فرخ سیر کی تخت نشینی کے سال یعنی ۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) میں ہوا ۔''[3]

۱- موجود ہے ۔
۲- نیا دور ، لکھنؤ ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ ۔ اپریل ۱۹۷۷ء ، ص ۵۶ - ۵۷ ۔
۳- نقوش ، خطوط نمبر ، حصہ سوم ، اپریل ۔ مئی ۱۹۶۸ء ، ص ۳۳۷ ۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کو ایک خط میں جو ۱۳ جنوری ۱۹۶۱ء کو لکھا گیا ، لکھتے ہیں :

"آپ کی خواہش کے مطابق ذیل میں ان تذکروں کے نام لکھے جاتے ہیں جو میرے کتب خانے میں موجود ہیں ۔ انجمن ترقی اردو کے شائع کیے ہوئے تذکروں کے نام اس فہرست میں شامل نہیں کیے جا رہے ہیں ۔"[1]

اس کے بعد ۴۰ تذکروں کی فہرست لکھی ہے ۔ حوالے کے لیے پورا خط ملاحظہ کیا جا سکتا ہے ۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۳۱ء کو افسر امروہوی کے نام ایک خط[2] میں لکھتے ہیں :

"افسوس کہ جس اہم کام میں آپ مصروف ہیں ، اس میں میں آپ کو ذرا بھی مدد نہ دے سکا ۔"[3]

عبداللطیف اعظمی کے ایک استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں :

"میں نے عش عش کو ہمیشہ ع سے لکھا ہوا دیکھا ہے اور اسی کو صحیح سمجھتا ہوں لیکن اس کے لیے کوئی دلیل نہیں دے سکتا ۔"[4]

مسعود حسن رضوی ، جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے ، تحقیق میں خاصی احتیاط سے کام لیتے تھے اور معلومات اکٹھی کرتے رہتے تھے ۔ استفسار کرنے والوں کے جوابات دینے کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی استفسار کے لیے خط لکھتے تھے اور اس طرح اپنی بعض تحقیقی کمیوں کو تسلیم بھی کر لیتے تھے ۔ ضیاء احمد بدایونی کو ۵ جون ۱۹۴۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"میں شکر گزار ہوں کہ جو مقامات آپ کو محلِ نظر معلوم ہوئے ، ان کی طرف آپ نے مجھے توجہ دلائی ۔"[5]

۱- اورینٹل کالج میگزین ، اگست - نومبر ۱۹۷۹ء -
۲- افکار کراچی ، اکتوبر ۱۹۷۷ء -
۳- افسر امروہوی تذکروں پر کام کر رہے تھے اور انھوں نے مسعود حسن رضوی سے قدیم تذکروں کے بارے میں پوچھا تھا ۔
۴- مشاہیر کے خطوط ، مرتبہ عبداللطیف اعظمی ، ص ۲۲۰ -
۵- مکتوبات ، مرتبہ ضیاء احمد بدایونی ، ص ۱۴۶ -

مشفق خواجہ کے نام خطوط[1] سے پتہ چلتا ہے کہ مسعود حسن رضوی ان سے اکثر تحقیقی معلومات کے سلسلے میں تبادلۂ خیالات کرتے رہتے تھے۔ ۲۳ - ۲۷ جنوری ۱۹۶۷ء کے خط میں لکھتے ہیں :

''سلطان عالم واجد علی شاہ کے چھوٹے بھائی شہزادہ سلیمان قدر بہادر کے جس روزنامچے کا ذکر آپ نے کیا ہے اس سے میں بالکل ناواقف ہوں۔ مرحوم شہزادے صاحب کے دربار رس لوگوں میں صفی ، ظریف ، فصاحت برادر مؤلف روزنامچہ ، بلاغت پسر فصاحت وغیرہ اور عزیزوں میں سلیمان قدر کے بیٹے ثریا قدر کے داماد پرنس ہمایوں جاہ بہادر ، ان سب سے میرے تعلقات تھے ، مگر اب ان میں سے کوئی باقی نہیں جس سے کچھ پوچھ سکوں۔ یہ امر تقریباً یقینی ہے کہ یہ روزنامچہ کبھی چھپا نہیں۔ آپ کو اس کا جتنا حصہ مل گیا ہے اس کو غنیمت سمجھیے اور شائع کر دیجیے۔ ایسی چیزوں کی مجھ کو بڑی ضرورت اور تلاش ہے۔''

اسی طرح یکم جنوری ۱۹۶۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''فہرست مخطوطات صفحہ نمبر ۸۱ و ۲۰۳ تاریخ سلطان عالم واجد علی شاہ مصنفہ گنگا رام اور صفحہ ۱۰۰ نمبر ۹۰۶ ، ۹۰۷ ، ۹۰۸ تاریخ کندن لال مصنفہ کندن لال اشکی ، ان دو مخطوطوں کے بارے میں ضروری تفصیلات معلوم کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ براہِ کرم زحمت کر کے لکھ بھیجیے۔''

اسی طرح مشفق خواجہ نے مسعود حسن رضوی کے مرتب کردہ تذکرہ ''گلشنِ سخن'' پر تبصرہ کرتے ہوئے جو اختلافات کیے مسعود حسن رضوی نے انھیں قبول کیا مگر چند باتوں کی وضاحت بھی کی۔ اس سلسلے میں ۳ ستمبر ۱۹۶۷ء کا خط دیکھا جا سکتا ہے۔

مسعود حسن رضوی اپنے خطوں میں دوسروں کے کام کی بھی داد دیتے تھے اور بعض اوقات مفید مشوروں سے بھی نوازتے تھے۔ مرتضیٰ حسین فاضل

۱- موجود ہیں۔

لکھنوی کو ۷ مارچ ۱۹۶۸ء کے ایک خط[۱] میں ان کے تحقیقی کارنامے پر داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

''آپ کے مرتب کیے ہوئے غالب کے فارسی کلیات کی تینوں جلدیں وصول ہوئیں ۔ آپ کا یہ کارنامہ بے شک تحسین و آفرین کا مستحق ہے اور آپ فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ''کارے کردم'' . . . یہ بڑی ہمت کا کام تھا جس کو آپ نے اس خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا کہ غالب کی روح خوش ہو گئی ہوگی ۔''

ڈاکٹر سلام سندیلوی کو ۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کے خط میں ان کی کتاب ''مراثی انیس میں جذباتی تاویل'' کی رسید دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

''آپ نے جس وسعت و جامعیت کے ساتھ موضوع کتاب سے ناقدانہ بحث کی ہے اس کے لیے آپ داد اور مبارک باد کے مستحق ہیں ۔[۲]''

ڈاکٹر عبادت بریلوی کو ان کی کتاب ''غزل اور مطالعۂ غزل'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے ۲۴ - اپریل ۱۹۵۶ء کو لکھتے ہیں :

''اسے پڑھ کر جو خوشی مجھ کو ہوئی تھی وہ شاید ہی کسی اور کو ہوئی ہو ۔ اپنے مقصد کو پورا ہوتے دیکھ کر کس کو خوشی نہ ہوگی ۔ جب اردو غزل پر طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی تو سب سے پہلے میں نے ''ہماری شاعری'' لکھ کر اس طوفان کو روکا تھا اور غزل فہمی کے لیے زمین ہموار کی تھی ۔ اب آپ نے یہ کتاب لکھ کر اس عمارت کو بہت اونچا اُٹھا دیا جس کی داغ بیل میں نے ڈالی تھی ۔[۳]''

۲۷ جولائی ۱۹۷۶ء کو عبداللطیف اعظمی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

''آپ کی عنایت کی ہوئی دو کتابیں ملیں ۔ یعنی ''مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'' اور ''سرسید احمد خاں اور ان کی معنویت موجودہ

۱- موجود ہے ۔
۲- نیا دور لکھنؤ ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ-اپریل ۱۹۷۷ء ، ص ۶۲ ۔
۳- اورینٹل کالج میگزین ، اگست ۔ نومبر ۱۹۷۹ء ۔

دور میں'' ان گراں قدر تحفوں کے لیے دلی شکریہ قبول فرمائیے ۔ آپ نے اپنی مؤخر الذکر کتاب میں ''سرسید کی زندگی کی اہم تاریخیں'' درج کر کے ایک حد درجہ مفید کام انجام دیا ہے ۔''[1]

مسعود حسن رضوی نے ۱۴ - ۱۵ دسمبر ۱۹۶۶ء کو ایک شکایتی خط مالک رام کو لکھا تھا جو اُن کے خطبہ صدارت اورینٹل کانفرنس علی گڑھ کے مندرجات کے بارے میں تھا ۔ مسعود حسن رضوی کا یہ طویل ترین خط ایسا ہے جو مسعود حسن رضوی کی باطنی کیفیات کا آئینہ دار ہے اور اس میں جو شکوے اور شکایات لکھی گئی ہیں وہ درست بھی ہیں اور صحیح بھی ۔ یوں یہ ایک طرح سے طویل شکایت نامہ ہے اور مسعود حسن رضوی کی باقی تحریروں سے مختلف بھی ہے اور ان کے مزاج کے خلاف بھی ۔ اس کی اسی اہمیت کے پیش نظر اس کا پورا متن یہاں درج کیا جاتا ہے ۔ اس کی اہمیت یوں بھی ہے کہ یہ ایک پرائیویٹ خط ہے اور اپنے مندرجات کے حوالے سے یہ کبھی بھی شائع نہ ہوتا ۔ اس وجہ سے اس کی شمولیت اور بھی ضروری ہو جاتی ہے ۔ وہ خط[2] یہ ہے :

''آپ نے اپنا خطبہ صدارت ، جو اورینٹل کانفرنس علی گڑھ کے شعبہ اردو میں پیش فرمایا تھا ، براہ کرم مجھے بھیجا ، شکریہ قبول فرمائیے ۔ میں نے اس کو شوق اور دلچسپی سے پڑھا ۔ اردو میں جو تحقیقی کام یونیورسٹیوں میں ہو رہے ہیں ان کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ انکشاف حقیقت ہے جو اکثر ''الحق مر''' کا مصداق ہوتا ہے ۔ اردو میں موجودہ تحقیقی ادب کا جو جائزہ آپ نے لیا ہے وہ بھی بڑی حد تک درست ہے ۔ لیکن محسن اردو اور بقول مہدی افادی آقائے اردو'' آزاد کے لیے بعض ایسے الفاظ آپ نے استعمال کیے ہیں جو آپ کے سے سنجیدہ لکھنے والے اور راہ تحقیق کی دشوار گزاریوں سے واقف شخص کے قلم سے اچھے نہیں معلوم ہوتے ۔ آپ نے جن مردہ اور زندہ محققوں کے کارناموں کو سراہا ہے کیا ان میں ایک بھی ایسا ہے جس کے یہاں فاحش غلطیاں موجود نہ ہوں ، لیکن اوروں کی غلطیاں صرف غلطیاں سمجھی جائیں اور آزاد کی غلطیاں ''گپ بازی'' ، افسانہ طرازی اور

۱- مشاہیر کے خطوط ، مرتبہ عبداللطیف اعظمی ، ص ۲۲۰ -

۲- موجود ہے -

حق گوئی سے انحراف قرار دی جائیں ۔ یہ یک بام و دو ہوا کیوں ؟

آپ کے خطبے کو پڑھ کر جہاں میں لطف اندوز ہوا وہاں کچھ شکایت بھی پیدا ہوگئی جس کو دل میں لیے رہنا اس خلوص کے منافی ہے جو مجھ کو آپ کی ذات سے ہے ۔ اس لیے کسی قدر صاف گوئی سے کام لینا ضروری ہو گیا ہے : ع

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

اگر آپ نے اپنے خطبے کو صرف مرحوم محققین میں محدود رکھا ہوتا تو کسی کو کوئی شکایت نہ ہوتی ، لیکن آپ نے تحقیق کے ایک زندہ مردِ میدان کا ذکر بھی کر دیا ہے اور وہ بھی خلافِ توقع مبالغہ آرائی اور جانب داری کے ساتھ ۔ قاضی عبدالودود صاحب میرے مخلص اور محترم دوست ہیں ۔ اُن کی مدح و ثنا میرے لیے باعثِ مسرت ہے لیکن مداحی میں اتنا مبالغہ مناسب نہیں کہ ایک کی مدح دوسرے کی قدح بن جائے ۔ آپ تحریر فرماتے ہیں :

''میرا ایمان ہے کہ جہاں تک فارسی علم و ادب کا تعلق ہے آج ملک بھر میں ان کے برابر کا شاید ہی کوئی اور عالم ہو ۔''

تحقیق آپ کے خطبے کا موضوع ہے اور یہ بات آپ سے پوشیدہ نہ ہوگی کہ تحقیق کے میدان میں ایمان اور اعتقاد کی گنجائش نہیں ۔ یہاں استشہاد و استدلال کی ضرورت ہوتی ہے ۔ آپ نے مولوی محمد شفیع مرحوم کا سب سے اہم اصول یہ بتایا ہے کہ : ''کوئی بات بے ثبوت نہ کہی جائے ، ہر ایک بیان یا دعویٰ یا تحریر بادلیل و باجواز ہونا چاہیے ۔'' لیکن آپ نے ایسے بلند بانگ دعوے کے لیے کیا دلیل اور کیا حوالہ دیا ہے ۔ دعویٰ بھی ایسا جو اُن سب لوگوں کی کھلی ہوئی منقصت ہے جنھوں نے اپنی عمرِ عزیز کا بڑا حصہ فارسی زبان و ادب کی تحصیل و تدریس میں صرف کیا ہے ۔ آپ کے اعتقاد میں شاید فارسی کی طرح اردو زبان و ادب کا بھی ملک بھر میں قاضی صاحب کے برابر کا کوئی عالم نہیں اس لیے لفظ ''ہتھوالسے'' کے متعلق جب قاضی صاحب نے فرما دیا : ''غالباً سپر کی ایک قسم ہے ، عجب نہیں لفظ ہتھوانسی ہو'' تو آپ نے مزید تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی ۔ فضلی کا جملہ ہے ''ڈھال ہتھوانسے کر پھر اُس حرام زادے پر حملہ کیا'' اس جملے میں ہتھوالسے کے معنی اگر سپر کی ایک قسم ہے تو جملے کی ترکیب نحوی اور اس کا مفہوم کیا ہوگا ۔ آپ کے سامنے اصل فارسی کا جملہ بھی موجود تھا یعنی ''سپر در دستِ گرفتہ آہنگ خصم خود کرد'' صاف ظاہر

ہے ''ڈھال ہتھوالسے کر'' ترجمہ ہے سپر در دست گرفتہ کا یعنی ڈھال ہاتھ میں لے کر۔ حقیقت یہ ہے کہ ہتھوالسنا ایک مصدر ہے، ہتھوالس کر اس سے مشتق ہے۔ ہتھوالسے میں یائے مجہول کتابت کی غلطی ہے۔ میر انیس فرماتے ہیں :

ہتھوالس کے تیغ و سپر اکبر یہ پکارے
کیا بکتے ہو بیہودہ سخن منہ پہ ہمارے

لفظ ہتوانسے کے ذکر سے "کربل کتھا" کے بعض تحقیق طلب مقامات یاد آ گئے۔ مقدمہ ص ۳٦ پر لفظ ''کاہلا'' کے معنی تیز اور بے چین بتائے گئے ہیں۔ ص ۳۷ پر لکھا گیا ہے کہ اصل لفظ ''کھہلا'' ہے۔ فضلی نے اعراب بالحروف کے قاعدے سے پہلا الف فتح کی جگہ لکھا ہے اور اس کے معنی تیز، جلد باز، بے صبر بتائے گئے ہیں۔ اگر میری کتاب ''روحِ انیس'' قابلِ مطالعہ سمجھی گئی ہوتی تو اس لفظ کے تلفظ اور معنوں میں کوئی شبہ باقی نہ رہتا۔ ملاحظہ ہو روحِ انیس طبع اول ۱۹۳۱ع فرہنگ ص ۲۲ اور روحِ انیس طبع دوم و سوم ص ۲۴۳، حاشیہ نمبر ۵۔ متعلقہ عبارت ذیل میں نقل کی جاتی ہے :

''کاہلا : مضمحل، تھکا ماندہ . . . یہ لفظ بیشتر ہرن کی اس کیفیت کے لیے آتا ہے جو گرمیوں میں دھوپ کی شدت سے اس پر طاری ہو جاتی ہے۔ یہ لفظ ایک مدت تک مستعمل رہنے کے بعد اب متروک ہو گیا ہے۔ ذیل کے شعروں سے اس کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے :

کاہلا سن کر مجھے آئے یہ چپ بیٹھے رہے
کہنے سننے کو ذرا بیارداری کر گئے (میر حسن)

گرمیٔ رخسار سے بیمار ہوگی چشمِ یار
دھوپ کی شدت سے آہو کاہلا ہو جائے گا (ناسخ)

گرمی میں نہیں ہے شوخیٔ چشم
یہ دھوپ ہے کاہلا ہرن ہے (شاد پیرِ و میر)

متن ص ۱۴۱ فٹ نوٹ نمبر ۲ انیس کا ایک مصرع یوں لکھا گیا ہے :

جلد آن کے بہنا کی خبر لیجیو بھائی

بہنا کی جگہ بھینا ہونا چاہیے۔

متن ص ۱۴۳ میں یہ شعر ملتا ہے :

ہو جس کے بخت کی شطرنجی کو تباہی سیاہ
بس آبِ زمزم و کوثر سے ہو سکے نہ سفید

اور فٹ نوٹ نمبر ۲ میں لکھا گیا ہے کہ "اصل فارسی شعر نہ مل سکا"۔ عرض ہے کہ پہلے مصرعے میں 'تباہی' غلط ہے - ''بنا ہی' ہونا چاہیے - اصل شعر یہ ہے :

بآبِ زمزم و کوثر سفید نتواں کرد
گلیمِ بختِ کسے را کہ بافتند سیاہ

باز آمدم برسرِ مطلب ــ قاضی صاحب سے آپ کی والہانہ عقیدت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ''نذرِ عرشی'' میں آپ نے ان کی فہرستِ الفاظ کو مقالات میں پہلی جگہ دے کر بعض نہایت گراں قدر علمی و تحقیقی مبسوط مقالوں کے لکھنے والوں کے ساتھ ناانصافی کی ہے -''

آپ نے تحریر فرمایا ہے :

''ذاکروں میں جن اصحاب نے تحقیقی کام کیا ہے اُن کے نام آپ سے مخفی نہیں ہوں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ان سے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے -''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کا نام بھی تو کسی سے مخفی نہیں تھا - پھر آپ نے ان سے متعلق کچھ نہیں ، بہت کچھ کہنے کی ضرورت کیوں سمجھی ؟

تحقیق کرنے والوں کے سامنے دو طریقِ کار ہیں - ایک یہ کہ دوسروں کی غلطیاں نکالی جائیں اور ان کی غلط بیانیوں پر لے دے کی جائے - دوسرا یہ کہ اپنی بات ایسی مضبوط دلیلوں سے کہی جائے جس سے غلط بیانیوں کی خود بخود تردید ہو جائے - پہلے طریقِ کار سے بیشتر لوگ مرعوب ہو جاتے ہیں اور اس قسم کی تحریروں کو بڑا تحقیقی کارنامہ سمجھتے ہیں - دوسرے طریقِ کار کی اہمیت و افادیت کو محسوس کرنے والے اہلِ نظر خال خال ہی ہوتے ہیں - بدقسمتی سے میں نے دوسرے طریقِ کار کو اختیار کیا ہے جس کو تعمیری تحقیق کہنا

چاہیے ۔ ادبی تحقیق اور ادبی احتساب میں بہت فرق ہے ۔ نکتہ چینی ، خردہ گیری ، رد و قدح کو بھی تعمیری تحقیق کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ۔ لیکن جو لوگ انھی چیزوں کو تحقیق سمجھتے ہیں ، اُن کو اس جاں فشانی و مغزکاری ، دیدہ ریزی ، تجزیہ و استدلال کے آثار نظر نہیں آتے جو تعمیری تحقیق کے عناصرِ ترکیبی ہیں ۔ ایسے کم نظر لوگ عفو و درگزر کے مستحق ہیں ۔ لیکن آپ کا شمار اس زمرے میں نہیں ہے اس لیے آپ اگر تعمیری تحقیق کے کارناموں کو نظرانداز کریں گے تو آپ سے شکایت ضرور ہوگی ۔ قاضی صاحب کے لیے آپ کے لفظوں میں ''خدا کا دیا گھر میں کافی تھا اور بسر اوقات کے لیے لوکری یا وکالت کرنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی ۔'' مجھ کو کسبِ معاش ، مستحق اعزہ کی کفالت ، سات بچوں کی تعلیم و تربیت ، شادی بیاہ اور تمام ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کے لیے جو وقت صرف کرنا پڑا ، اب بھی صرف کرنا پڑ رہا ہے ، اُس سے گریز ممکن نہ تھا ۔ چھتیس برس کی ملازمت اور فرائضِ منصبی کی بجا آوری میں کتنا وقت صرف ہوگیا ۔ ان ناگزیر مصروفیتوں کے علاوہ سارا وقت ادبی خدمات کی نذر کر دیا ۔ ادبی مجلسوں اور مشاعروں تک کی شرکت ترک کر دی ۔ ایک تارکِ لذات خلوت گزیں درویش کی زندگی پر قناعت کی ۔ آپ ہی کے لفظوں میں ''بانکی پور پٹنے کا شہرۂ آفاق کتب خانہ گویا اُن (قاضی صاحب) کے گھر میں تھا''۔ مجھ کو یہ سہولت بھی میسر نہ تھی ۔ لکھنؤ میں قلمی اور کمیاب کتابوں کا کوئی قابلِ ذکر کتب خانہ بھی نہ تھا ۔ مجھ کو اپنے مجوزہ تحقیقی کاموں کے مآخذ اور مصادر خود فراہم کرنا پڑے اور میں نے اپنی محدود آمدنی کا معتد بہ حصہ اور کافی قیمتی وقت صرف کر کے کمیاب کتابوں کا ایک خاصا بڑا ذخیرہ مہیا کر لیا جس سے اربابِ تحقیق مدد لیتے رہتے ہیں ۔ ایک چھوٹے کتب خانے کے لیے بھی جتنا عملہ ضروری ہے وہ تو میرے امکان میں نہ تھا مگر ایک منشی اور ایک دفتری کی تنخواہ ہمیشہ ادا کرتا رہا ۔

میری ادبی خدمتوں کی عمر اب نصف صدی کے قریب ہے ۔ میری کتاب ''امتحانِ وفا'' جو ملک الشعراء ٹینی سن کے ایک منظوم قصے کا ترجمہ ہے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی ۔ میرا مضمون ''دی کلچرل ویلیو آف اردو'' مئی ۱۹۲۳ء میں اور مبسوط مقالہ ''شعر'' فروری ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا ۔ اس کے بعد تقریباً دو درجن کتابیں اور بارہ درجن مضمون اور مقالے شائع ہو چکے ہیں اور کئی اہم کام اشاعت کے منتظر ہیں ۔ کوئی کتاب ایسے موضوع پر نہیں لکھی جو

دوسرے لکھنے والوں کا تختۂ مشق رہ چکا ہو اور شاید کوئی مضمون یا مقالہ ایسا نہیں لکھا جس سے موجودہ ذخیرۂ معلومات میں کچھ اضافہ نہ ہوا ہو ۔ ان کتابوں میں کتنی حقیقتیں بے نقاب کیں ، کتنی غلطیوں کی اصلاح کی اور کتنی غلط فہمیاں دور کیں ، لیکن تلخ گوئی اور درشت کلامی سے ہمیشہ اپنا دامن بچایا ۔ نہ اپنا نام اونچا کیا ، نہ دوسروں کو گرایا اس لیے عام نگاہوں میں کوئی امتیازی درجہ نہ ملا ۔ ایک فاضل نقاد نے آج سے تقریباً چالیس سال پہلے میرے طرزِ بحث و استدلال کی ایک خصوصیت یہ بتائی تھی :

"Not a trace of bitterness and yet his exposure of his opponents is merillss."

(Modern Review Culcutta October, 1928)

لیکن اس خصوصیت پر ہر شخص کی نظر نہیں پڑتی ۔ ہجری تقویم کے حساب سے پچھتر سے اوپر سن ہوا اور اب تک منہ اندھیرے سے لے کر گیارہ بجے رات تک تقریباً سارا وقت پڑھنے لکھنے میں صرف ہو رہا ہے ، مگر اس سارے ایثار و انہماک کے باوجود خادمانِ ادب کی فہرست میں اپنا نام اکثر نظر نہیں آتا ۔ شاید اس صورتِ حال کا سبب وہی ہے جو ایک وسیع النظر بے باک نقاد نے دریافت کیا ہے ۔ وہ میرے تحقیقی کاموں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اُن کے یہاں خردہ گیری اور تفصیل پرستی کے سے رجحانات بھی نہیں ملتے ، بلکہ وہ تو رد و قدح کے کام سے کوئی دلچسپی رکھتے نظر نہیں آتے ۔ آج سے کوئی تیس پینتیس برس پہلے جب اندر سبھا کے بارے میں یہ بحث چل رہی تھی کہ دربار اودھ سے اس کا کچھ تعلق تھا یا نہیں تو انھوں نے چپکے سے امانت کی لکھی ہوئی ایک ایسی نثری تحریر پیش کر دی جس سے سارا قضیہ از خود صاف ہوگیا ۔ یہی مزاج اور دستاویزی انداز ان کی مرتب کی ہوئی کتابوں میں ملتا ہے ۔ ان کے مضامین کی سنجیدگی اور متانت کا ایک خراب پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اُن کے نام اور کام سے بالعموم بے توجہی برتی جاتی ہے اور اُن کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جس کے وہ مستحق ہیں ۔ انھوں نے چپکے چپکے کام کیا ہے اس لیے ہمارے علمی نقار خانے میں اُن کی آواز دب سی گئی ہے ۔ پھر چونکہ ان کا کسی ادارے سے کوئی تعلق نہیں رہا ، اس

لیے ابھی ان کی تالیفات و تصنیفات کو اشتہاری درجہ نہیں ملا ۔"
(نقوش لاہور ، اگست ۱۹۶۰ع ، ص ۲۳۹)

میں اس تغافل شعاری اور بے التفاتی کا عادی ہو چکا ہوں ، لیکن اتنا بے حس اب بھی نہیں ہوا ہوں کہ آپ کے سے مخلص احباب میری جاں فشانیوں کو نظرانداز کر دیں اور مجھ پر کچھ اثر نہ ہو ۔ مجنوں (قیس عامری) کے بارے میں ایک حکایت یہ بھی سنی جاتی ہے کہ ناواقفوں اور بے دردوں کی سنگ زنی کو وہ برداشت کرتا رہتا تھا لیکن ایک دفعہ ایک دوست نے ایک کنکری مار دی تو وہ فریاد کرنے لگا ۔

کوئی داستان نویس یا افسانہ نگار ہوتا تو اتنی محنت کے نتیجے میں اپنی تصنیفوں کا ایک انبار لگا دیتا لیکن میں بہت سست نویس ہوں ۔ کوئی ذمہ دار ادیب اور محتاط محقق شواہد اور دلائل کے بغیر کوئی بات نہیں کہہ سکتا ۔ اس کو قدم قدم پر ماخذوں کے مطالعے اور حوالے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ وہ اپنے بیان میں ایجاز و اختصار ، جامعیت و مانعیت ، سنجیدگی و متانت ، شگفتگی و دل نشینی اور سب سے بڑھ کر اپنے خیالات میں منطقی حسن ترتیب کا خواہش مند ہوتا ہے ۔ اس کا قلم حقیقت رقم تیز چل ہی نہیں سکتا ۔ اس سست نویسی کے باوجود میرے کام کی مقدار کم نہیں ہے ۔ اگر آپ نے توجہ فرمائی ہوتی تو کوئی نہ کوئی چیز قابل ذکر مل ہی جاتی ۔ ان سب چیزوں سے قطع نظر ایک کام تو ایسا تھا جس کی ستائش قاضی صاحب نے بھی فرمائی ہے ۔ مختار الدین احمد صاحب قاضی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں :

"تبصروں میں بھٹی ان سے بالکل نہیں ہوتی اور رواج زمانہ کے خلاف تعریفی کلمات بہت کم لکھتے ہیں ۔ جن کتابوں پر آج تک انھوں نے تبصرے لکھے ہیں ان میں سب سے زیادہ وہ "دیوان فائز" سے متاثر معلوم ہوتے ہیں جس کی ترتیب و تصحیح جناب مسعود حسن رضوی ادیب نے کی ہے ۔ مختلف صحبتوں میں اس کتاب کا ذکر آیا اور ہمیشہ انھوں نے بہت اچھے الفاظ میں کتاب کی تصحیح و ترتیب کا ذکر کیا ۔ با ایں ہمہ جب انہوں نے معاصر میں اس پر تبصرہ لکھا تو تعریف میں صرف ڈھائی سطریں لکھیں ۔"

(نقوش لاہور ، شخصیات نمبر ، ضمیمہ ، ص ۳۱۸)

وہ ڈھائی سطریں حسب ذیل ہیں :

"فاضل مرتب نے فائز اور ان کے کلام کو سمجھنے کی سعی بلیغ کی ہے اور قدما کے کلام کو پیش کرنے کا جو اسلوب انھوں نے اختیار کیا ہے وہ اس قسم کی اور کتابوں میں جو انجمن نے شائع کی ہیں ، بہت کم ملتا ہے ۔ ترتیب کا یہ بلند معیار قابلِ تقلید ہے ۔"

(معاصر حصہ I ، ص ۸۱)

اس کتاب کے بارے میں قاضی صاحب موصوف نے دوبارہ تحریر فرمایا ہے :

"یہ بات بے خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس قسم کی دوسری کتابیں ، جو انجمن ترقی اردو نے شائع کی ہیں ، ان میں بہت کم ایسی ہیں جن کے مرتبین نے اتنی تلاش و تحقیق سے کام لیا ہے ۔ . . . کتاب کی ترتیب میں جو جانفشانی کی گئی ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے ۔"

(عیارستان ، ص ۱)

مگر یہ ظلم بھی آپ نے روا رکھا اور یہ کتاب بھی آپ کی نگاہِ التفات سے محروم رہی ۔ ادبی تحقیق کے علاوہ ادب کے دوسرے شعبوں میں بھی میں نے بہت سا کام کیا ہے ، مگر اس وقت اس کا ذکر مناسبِ محل نہیں ہے ۔ شکوہ طرازی میری عادت نہیں ، خودستائی اور خودنمائی میرا شیوہ نہیں ۔ آپ نے حضرت علی کے خطبۂ شقشقیہ کا نام سنا ہوگا ۔ میرے اس خط کو مکتوبِ شقشقیہ سمجھ لیجیے ۔ مجھے اس خط میں بار بار اپنے مخلص دوست جناب قاضی عبدالودود صاحب کا نام لینا پڑا ہے ، بغیر اس کے اپنے ما فی الضمیر کا واضح اظہار ممکن نہ تھا ، لیکن خدا نخواستہ موصوف کی کثیرالمقدار ، گوناگوں قابلِ قدر ادبی خدمات کا استخفاف میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ہے ۔ صرف آپ کی جانب داری اور نا انصافی کی دوستانہ شکایت مقصود ہے ۔

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
گلہ ہوا بھی کسی سے تو دوستانہ ہوا (انیس)

مخلص

سید مسعود حسن رضوی"

غرض مسعود حسن رضوی کے ان خطوں کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ سیدھا سادا اسلوب اختیار کرتے تھے اور ان کے خط مختصر بھی ہیں اور ٹودی پوائنٹ بھی ، سوائے آخری خط کے جو مالک رام کو لکھا گیا ہے ۔ بہر کیف مسعود حسن رضوی کے یہ خطوط ادبی معلومات سے پُر ہیں ۔ نجی خط بھی دلچسپی سے خالی نہیں ۔

۵- بحیثیتِ مترجم

مسعود حسن رضوی اگرچہ باقاعدہ طور پر مترجم نہیں تھے مگر انھوں نے انگریزی اور فارسی سے کچھ تراجم کیے جو کتابی شکل میں آئے ۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے پہلا ترجمہ ، جو اُن کا پہلا ادبی کارنامہ بھی ہے ، ٹینی سن کے منظوم افسانے اینک آرڈن کا اردو روپ ہے ، جو امتحانِ وفا کے نام سے کیا گیا ہے ۔ دوسرا ترجمہ میرزا خان ابن فخر الدین محمد کی تصنیف قواعد کلیہ بھاکھا کا فارسی سے اردو میں ہے ۔ تیسرا ترجمہ میر تقی میر کے رسالے فیض میر کا ہے ۔ اس باب میں مسعود حسن رضوی کے ترجموں کی روشنی میں بحیثیت مترجم ان کی کاوشوں کا جائزہ لیا جائے گا اور ان کی تنقیدی بصیرت ، تحقیقی شعور پر بھی بحث ہوگی ۔

امتحانِ وفا :

لارڈ ٹینی سن کے منظوم افسانے ''اینک آرڈن'' کا ترجمہ مسعود حسن رضوی نے ۱۹۱۸ء میں کیا ۔ اس سلسلے میں وہ خود بتاتے ہیں :

> ''سب سے پہلے میں نے لارڈ ٹینی سن کے منظوم افسانے اینک آرڈن کا اردو میں ترجمہ کرکے دیباچے اور حاشیوں کے ساتھ ۱۹۲۰ء میں شائع کیا ۔''[1]

یہ بامحاورہ اردو میں ترجمہ ہے ۔ اس سے پہلے کہ ترجمے کے بارے میں کچھ کہا جائے ، ضروری ہو جاتا ہے کہ خود مسعود حسن رضوی کے خیالات

۱۔ مسعود حسن رضوی سے انٹرویو ، از جی ۔ ایم ۔ شاہ ، نشریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ ، ۲۶ فروری ۱۹۶۷ء ۔

بھی سامنے آ جائیں ۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے مسعود حسن رضوی ادیب سے "ایک ادبی ملاقات" میں جو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے ۱۶ ستمبر ۱۹۶۲ع کو نشر ہوئی ، اس ترجمے کے بارے میں سوالات کیے ۔ ان دونوں کی گفتگو یہاں درج کی جاتی ہے ۔

ہاشمی : مسعود صاحب یہ تو فرمائیے کہ آپ کا سب سے پہلا ادبی کارنامہ کون سا ہے ؟

مسعود حسن : آج سے چوالیس سال پہلے ۱۹۱۸ع میں میں نے انگلستان کے ملک الشعراء ٹینی سن کے ایک منظوم افسانے اینک آرڈن کا اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا جو ۱۹۲۰ع میں امتحان وفا کے نام سے شائع ہوا ۔ میری ادبی زندگی اسی ترجمے سے شروع ہوئی ۔

ہاشمی : آپ لفظی ترجمہ پسند کرتے ہیں یا آزاد ترجمہ ؟

مسعود حسن : ہاشمی صاحب ! ترجمہ لفظوں کا نہیں فقروں اور جملوں کا ہونا چاہیے ، مگر اس طرح کہ کسی لفظ کا مفہوم چھوٹ نہ جائے ۔ اس طرح ترجمہ لفظی بھی ہوتا ہے اور آزاد بھی ۔

ہاشمی : یہ کیونکر ممکن ہو کہ ترجمہ ایک وقت لفظی بھی ہو اور آزاد بھی ؟

مسعود حسن : دیکھیے میں ایک مثال دیتا ہوں ، جس سے میرا مطلب واضح ہو جائے گا ۔ انگریزی کا ایک جملہ ہے :

"The Carpets in that room were more grand than artistic."

اپنے زمانے کے ایک معروف و مقبول ادیب نے اس جملے کا ترجمہ یوں کیا تھا :

"اس کمرے کے مفروشات بہ نسبت صنعت کارانہ ہونے کے زیادہ محتشم تھے ۔"

یہ ہوا محض لفظی ترجمہ کہ انگریزی کے ہر لفظ کی جگہ اردو کا ایک لفظ بٹھا دیا : Carpets مفروشات ، Grand محتشم ، artistic صنعت کارانہ ۔ اردو والوں کے محاورے میں "مفروشات" کوئی لفظ نہیں اور فرش کی صفت محتشم نہیں ہو سکتی ۔ پھر more than کے لفظی ترجمے نے تو جملے کی ہیئت ہی بگاڑ دی ۔ "بہ نسبت صنعت کارانہ ہونے کے زیادہ محتشم تھے" یہ فقرہ اردو کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے ۔ اب اس جملے کا لفظی اور آزاد ترجمہ سنیے ۔ لفظی اس معنی میں کہ ہر لفظ کا مفہوم ترجمے میں موجود ہے اور آزاد اس لیے کہ لفظوں کے استعمال اور جملے کی ساخت میں انگریزی کی تقلید نہیں کی گئی ہے ۔ اصل جملہ اور اس کا اردو ترجمہ دونوں کو ذرا غور سے ملاحظہ کیجیے :

"The carpets in that room were more grand than artistic."

میں اس کا ترجمہ یوں کرتا ہوں :

"اس کمرے کے فرش فروش جتنے پرکار ، تھے اس سے زیادہ شاندار تھے ۔"[۱]

"اس سے مسعود حسن رضوی کے ترجمے کے بارے میں نظریات کا بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ وہ خود کس طرح کے ترجمے کے قائل تھے اور یوں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ انھوں نے ترجمہ کرتے وقت ان باتوں کو کس حد تک ملحوظِ خاطر رکھا ہوگا ۔ ان باتوں کا اندازہ لگانے کے لیے امتحانِ وفا کا جائزہ لیتے ہیں ۔

۵۷ صفحات پر مشتمل اس چھوٹی سی کتاب کے ۲۲ حصے ہیں ۔ کتاب کے ٹائیٹل پر حافظ شیرازی کا یہ شعر درج کیا گیا ہے :

ما قصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

امتحانِ وفا کے پہلے تین حصے معذرت، گزارش اور دیباچے پر مشتمل ہیں ۔ "معذرت" میں ترجمے اور اردو زبان کی کم مائیگی کا اظہار کیا گیا ہے ۔ مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں :

۱۔ نگارشاتِ ادیب ، از مسعود حسن رضوی ادیب ، ص ۷ - ۹ ۔

''ٹینی سن کا کلام اور اردو میں ترجمہ ۔ پھر ترجمہ کرنے والا میں ۔ زبانِ انگریزی کے سامنے اردو کی کیا بساط اور ٹینی سن سے ماہرِ لفظ و معنی کے آگے میری کیا حقیقت ۔ حیران ہوں کہ اردو میں انگریزی کی سی وسعت کہاں سے لاؤں اور انتخابِ الفاظ میں ٹینی سن کیونکر بن جاؤں کہ ایک ایک لفظ سے ایک ایک تصویر کھنچ جائے اور کوزے میں دریا نظر آئے ۔ صاف کوئی کہتی ہے کہ جو ہو نہ سکے ، اس کی ہوس کیوں کی جائے ۔ اپنی زبان کو سنوارنے کا شوق جواب دیتا ہے کہ مجھ سے تو نہیں ہو سکتا کہ ایسا گوہر بے بہا ہاتھ آئے اور میں اُسے اردو کے دامن میں نہ ٹانک دوں ۔ ممکن ہے کہ میرے گرد آلود ہاتھوں سے اس موتی کی آب میں فرق آ گیا ہو ، مگر کیا عجب کہ ادبی جواہر کے پرکھنے والوں کو کہیں کہیں اس کی اصلی چمک دمک نظر آ جائے ۔ بہرحال یہ تصفیہ تو حق پسند ناظرین کریں گے کہ اس سے لباسِ اردو کی خوش نمائی میں کچھ اضافہ ہوا یا میری یہ کوشش نادان دوستی کا مصداق ٹھہری ۔ میرے اطمینان کے لیے حسنِ نیت کا ثواب کافی ہے ۔''[1]

اس معذرت میں جہاں اپنی بے بضاعتی کا ذکر کیا گیا ہے وہاں ٹینی سن کی قادر الکلامی اور فن پر گرفت کا تذکرہ بھی موجود ہے ۔ اس کے بعد ''گزارش'' میں ترجمے کی دشواریوں کا ذکر اور مطالعے کی دعوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

''لفظی ترجمے کی خواہش اور سادگیٔ زبان کا خیال ، یہ دو زنجیریں قلم کے پاؤں میں نہ ہوتیں ، تو اُسے چلنے میں آسانی ہوتی اور شاید رفتار میں دلآویزی زیادہ ہوتی ۔ آپ کہیں گے کہ آخر یہ دوہری بیڑیاں پہن کر چلنا کیا ضرور تھا ۔ ممکن ہے قلم کو اپنی طاقتِ رفتار کی آزمائش منظور ہو اور وہ اس اخلاقی افسانے کو نو عمروں اور کم سوادوں تک پہنچانا بھی ضروری سمجھتا ہو ۔ بہرحال آپ کو یہ قیدیں پسند ہوں یا نہ ہوں ، آپ یہ چھوٹی سی کتاب ایک دفعہ تنقیدی نظر سے پڑھ لیجیے ،

۱۔ امتحانِ وفا ، از مسعود حسن رضوی ادیب ۔

یہی میری محنت کا صلہ ہو گا ۔¹

اس گزارش میں مسعود حسن رضوی کچھ ہدایات بھی دیتے ہیں تا کہ قاری کو پڑھنے اور سمجھنے میں سہولت ہو ۔ وہ لکھتے ہیں :

''اس افسانے کے صرف واقعات ہی توجہ کے مستحق نہیں ہیں ، الفاظ پر بھی خاص طور پر نظر رکھنا ضروری ہے ۔ مصنف کبھی بعض الفاظ کی تکرار سے کوئی گزشتہ واقعہ یا منظر پیش نظر کرنا چاہتا ہے ۔ کبھی ایک جملہ دوبارہ لکھ کر پوری تقریر یاد دلاتا ہے ۔ اس کے علاوہ اس قصے میں ایسے موقعے بھی ہیں کہ جو کچھ منہ سے نکل گیا ہے وہی ہوا بھی ۔ مگر باکمال افسانہ نویس ناظرین کو ادھر متوجہ نہیں کرتا ، چپکے سے آگے بڑھ جاتا ہے اور اس طرح وہ زبان خاموشی سے گویا یہ کہتا ہے کہ جو بات بعد کو پیش گوئی نکلی وہ بالارادہ نہیں کہی گئی تھی ۔ اثنائے گفتگو میں بلا قصد زبان پر آ گئی تھی ۔''²

اس کے بعد دیباچے میں ٹینی سن کی شاعری ، نظم کی خصوصیات ، افسانے کے کرداروں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور قصے کے اخلاق اثرات کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا گیا ہے ۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ دیباچہ ''ادیب نیوتنوی'' کے نام لکھا گیا ہے ۔

امتحان وفا پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک تبصرہ نگار نے لکھا ہے :

''امتحان وفا کے نام سے سید مسعود حسن رضوی بی ۔ اے ادیب نے انگلستان کے مشہور شاعر لارڈ ٹینی سن کے منظوم افسانے کا سلیس اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا ہے ۔ عموماً ترجمے میں وہ خوبیاں قائم نہیں رہتیں جو اصل زبان میں ہوتی ہیں ۔ لیکن جناب ادیب اپنی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں ۔ اصل افسانہ بہت ہی پُر اثر ہے مگر امتحان وفا میں بھی وہ تاثیر زائل نہیں ہونے پائی ۔''³

۱۔ امتحان وفا ، از سید مسعود حسن رضوی ادیب ۔
۲۔ ایضاً ۔
۳۔ زمانہ کان پور ، جنوری ۱۹۲۲ع ۔

امتحانِ وفا میں واقعی مسعود حسن رضوی نے الفاظ کا انتخاب اس خوبصورتی سے کیا ہے اور جملوں کا ترجمہ اس برجستگی سے کیا ہے کہ یہ بھرپور اثر رکھتا ہے ۔ اصل اور ترجمہ سے مسعود حسن رضوی کی ترجمے کی اس خوبی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور ان اصولوں کی روشنی میں بھی جو خود انھوں نے ترجمے کے لیے بتائے ہیں ، اس کو جانچا جا سکتا ہے ۔

Enoch and Annie, sitting hand-in-hand,
His large gray eyes and weather-beatan face
All-Kindled by a still and sacred fire,
That burn,d as on an altar. Philip look,d,
And in their eyes and faces read his doom ;
Them,as their faces drew together, groan,d,
And slipt aside, and like a wounded life,

''اینک اور اینی دونوں بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں ہے ۔ اس کی بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں اور اس کا چہرہ جو موسمی تغیرات کے اثر سے سخت ہو گیا تھا ، محبت کی خاموش اور متبرک آگ سے روشن ہو گیا ، جو اس کے دل میں قربان گاہ کی مقدس آگ کی طرح جل رہی تھی ۔ فلپ نے غور سے دیکھا اور ان دونوں کی آنکھوں اور چہروں میں اپنا خطِ تقدیر پڑھ کر ایک آہ کی اور آہستہ آہستہ وہاں سے ہٹ کر ایک چوٹ کھائے ہوئے جانور کی طرح جنگل کے نشیب میں اُتر گیا ۔''[1]

مسعود حسن رضوی نے جہاں جہاں بھی منظر دکھائے ہیں ، زورِ بیان اور زبان پر گرفت کا بھرپور ثبوت دیا ہے ۔ سمندر میں اُجاڑ چٹان کا منظر انھوں نے کچھ یوں ترجمہ کر کے پیش کیا ہے ۔

The mountain wooded to the peak, the lawns
And winding glades high up like ways to Heaven
The slender coco,s drooping crown of Plumes,

۱۔ امتحانِ وفا ، ص ۵ ۔ ٦ ۔

The lightning fash of insect and of bird
The lustre of the ling conveisuluses
That coil,d around the stately stems and ran
Ev,n to the limit of the land, the glows
And gloried of the broad belt of the world.

''پہاڑ پر چوٹی تک درخت لگے ہوئے ہیں ۔ سبزہ زار اور جنگل کے درمیان کے کشادہ راستے اس طرح چکر کھاتے ہوئے اوپر کو گئے ہیں گویا آسمان پر جانے کے لیے سڑکیں بنی ہوئی ہیں ۔ ناریل کے پتلے پتلے درخت پتیوں کے تاج پہنے ہوئے کھڑے ہیں ۔ خوشنما اور چمکدار چڑیاں اور کیڑے مکوڑے بجلی کی طرح ادھر سے اُدھر آ رہے ہیں ۔ لمبی لمبی خوشنما بیلیں بڑے بڑے تنوں میں لپٹی ہوئی سمندر کے کنارے تک پھیلی ہوئی ہیں اور ان کی چمک اپنی بہار دکھا رہی ہے ۔ غرض کہ منطقۂ حارہ کے رنگا رنگ اور شاندار منظر . . . ۔''[۱]

بعض جگہ جملوں کا ترجمہ بڑی خوبصورتی اور فنی مہارت سے کیا گیا ہے ۔ چند جملے دیکھیے ۔

Heard and not heard him, as the village girl,
Who sets her pitcher underneath the
Musing on him that used to fill it for her,
Heare and not hears, and kts it overflow.

''جس طرح ایک دیہاتی لڑکی اپنا گھڑا چشمہ کے نیچے رکھ کر اس شخص کے خیال میں غرق ہو جاتی ہے ، جو اس کے بجائے پانی بھر دیا کرتا تھا ۔ وہ گھڑے میں پانی گرنے کی آواز سنتی ہے مگر اس طرح گویا نہیں سنتی ۔ گھڑا بھر کر اُبل نکلتا ہے اور اُسے خبر نہیں ہوتی ۔''[۲]

۱- امتحانِ وفا ، ص ۳۶ - ۳۷ -
۲- امتحانِ وفا ، ص ۱۳ - ۱۴ -

And one, in whom all evil fancies clung
like serpent eggs together, laughingly
Would hint at worse in either.

''ایک شخص جس کے دل میں بدی کے بے شمار خیالات سانپ کے انڈوں کی طرح چنے ہوئے تھے ، ہنس ہنس کر ایک بُری بات کی طرف اشارہ کرتا تھا۔''[۱]

Because things seen are mightier than Things heard,
Stagger,d and shook, holding the branch, and fear,d
To send abroad a shrill and terrible cry,
Which in one moment, like the blast of doom,
Would shatter all the happiness of the hearth.

''مگر ''شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ'' اینک کے پیر لڑکھڑانے لگے ۔ اس نے ایک درخت کی شاخ پکڑی اور اس خوف سے کہ کہیں ایک تیز اور خطرناک چیخ اس کے منہ سے نہ نکل جائے جو صورِ اسرافیل کی طرح ایک لمحے میں اس گھر کی خوش حالی خاک میں ملا دے ۔''[۲]

ان مثالوں سے ترجمے کی خوبی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسعود حسن رضوی نے الفاظ کا انتخاب جس سلیقے سے کیا ، اس سے افسانے کی اثریت برقرار رہی ہے ۔ بلکہ اس خوبصورت ترجمے نے اس کہانی کی خوبصورتی میں اور اضافہ کر دیا ہے ۔ امتحانِ وفا کا قصہ ۲۱ فصلوں میں بیان کیا گیا ہے ۔ بعض فصلوں مثلاً ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۱ میں سرنامے کے طور پر جو شعر دیے گئے ہیں وہ یہ ہیں :

چہ می پرسی زحالِ بے نوائے خانہ بربادے
بہ غربت مبتلائے خانماں ویرانہ آبادے (ص ۲۳)

۱۔ امتحانِ وفا ، ص ۲۹ ۔
۲۔ امتحانِ وفا ، ص ۳۹ ۔

کانٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے
گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے (ص ۳٦)

کہتے ہیں مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے[1] (ص ۴۲)

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ اُس کے رخ سے نگہ کامیاب ہے (ص ۴٦)

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہگذر یاد آیا (ص ۴۸)

یہ تمام اشعار فصل کے واقعے یا کہانی کے منظر نامے کے مناسب حال ہیں اور ان سے مترجم کی نکتہ سنجی اور سخن سنجی کا پتہ چلتا ہے۔ بعض جگہ یہ شعر ہی اس فصل کا نچوڑ پیش کرنے میں معاون ثابت ہوئے ہیں اور معاملہ کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔

مترجم نے اپنی طرف سے قصے کے اختتام پر فصل ۲۲ کا اضافہ کیا ہے اور صرف ایک شعر لکھا ہے:

نیرنگِ حسن و عشق کی وہ آخری بہار
تربت تھی میری اور کوئی اشک بار تھا (یگانہ)

یہ شعر خوبصورت اشارہ ہے اس پورے واقعے کی طرف جس کا ذکر افسانے میں موجود نہیں۔ یعنی اینک کے مر جانے کے بعد اینی کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ فاضل مترجم نے یہ قیاس کیا ہے کہ اینک کی موت کے بعد مریم اینی کو سب کچھ بتا دیتی ہے اور اینی اینک کی قبر پر ماتم کناں ہوتی ہے اور یہی اس افسانے کا ماحصل ہے اور یہ تینوں کردار اپنی اپنی جگہ پر جس امتحانِ وفا سے گزرتے ہیں، اس کا اختتام اینی کے ماتم پر ہی ہوتا ہے اور اس طرح ایک تو اس

۱- یہ شعر یوں ہے:

ہر اک مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

کا نام پوری معنویت لیے ہوئے ہے اور دوسرے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ترجمے کے ساتھ ساتھ مترجم کی کہانی پر بھرپور گرفت رہی ہے - اس طرح ڈاکٹر صفدر آہ کی یہ رائے درست نظر آتی ہے :

''جواں سال مترجم نے ٹینی سن کی نظم کی روح کو بڑی محنت سے اردو نثر میں منتقل کیا ہے ۔''[۱]

اس تناظر میں دیکھا جائے تو مسعود حسن رضوی نے یہ ترجمہ ۱۹۱۸ع میں ۲۵ سال کی عمر میں کیا اور جس فن کارانہ چابکدستی سے ترجمے کا حق ادا کیا اس پر اُس زمانے میں بھی انھیں ضرور داد ملی ہوگی اور اتنے سال گزرنے کے بعد بھی یہ ترجمہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے والوں کے لیے ایک عمدہ مثال ہے ۔

قواعدِ کلمۂ بھاکا (بھاکھا) :

یہ چھوٹی سی کتاب میرزا خان ابن فخر الدین محمد کی کتاب تحفۃ الھند کا اردو ترجمہ ہے ، جو عالمگیری عہد میں خود اورنگ زیب کے مطالعے کے لیے تصنیف کی گئی تھی ۔ یہ کتاب نایاب تھی ۔ چنانچہ مسعود حسن رضوی نے اس پر ایک تعارفی مضمون لکھا جو ادب لکھنؤ جون ۱۹۳۰ع کے شمارے میں شائع ہوا ۔ ۱۹۳۳ع میں مسعود حسن رضوی نے ایک انگریزی مضمون لکھا جو الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور سنسکرت کے زبردست عالم پنڈت گنگا ناتھ جھا کو پیش کی جانے والی یادگاری کتاب JHA Commemoration Volume میں شامل ہے ۔ یہ کتاب پونا اوریئنٹل بک ایجنسی نے ۱۹۳۷ع میں شائع کی ۔

۱۹۳۳ع میں مسعود حسن رضوی نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ، جو پہلی بار نقوش جولائی ۱۹۵۵ع میں شائع ہوا اور پھر دوبارہ نقوش کے ادبِ عالیہ نمبر اپریل ۱۹۶۰ع میں ''برج بھاشا کی پہلی گرامر'' کے عنوان سے شائع کیا گیا ۔ ڈاکٹر گیان چند اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں :

۱- ماہنامہ کتاب لکھنؤ ، دسمبر ۱۹۶۸ع ، ص ۵۲ ۔

''اورنگ زیب کے عہد میں میرزا خاں نے تحفۃ الہند لکھی جس میں ہندی شاعری ، ہندوستانی موسیقی ، علمِ قیافہ اور معاشرت وغیرہ کے بارے میں بیانات ہیں ۔ اس میں ایک مقدمہ ، سات ابواب اور ایک خاتمہ ہے ۔ مقدمے کے دو حصے ہیں ۔ ایک میں دیوناگری رسمِ خط کا بیان ہے ۔ دوسرے میں برج بھاشا کی قواعد ہے ۔ مسعود صاحب نے بعض آخر الذکر حصے کا ترجمہ کیا ۔''[1]

چنانچہ وہ مضمون جو ''برج بھاشا کی پہلی گرامر'' کے نام سے شائع ہوا ''قواعدِ کلیہ بھاکھا'' کے نام سے ایک مختصر مقدمے کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ۔ ۳۰ صفحات پر مشتمل اس کتابچے میں سات صفحے کا مقدمہ ہے جس میں اس کتاب[2] کا مکمل تعارف کرایا گیا ہے اور اس کے بعض مندرجات کا تحقیقی طور پر بھی جائزہ لیا گیا ہے ۔ اس مقدمے سے پتہ چلتا ہے کہ مسعود حسن رضوی کے پاس اس کتاب کے دو قلمی نسخے تھے ۔ ایک نسخے میں مختصر دیباچہ ہے اور دوسرے میں طویل ۔ مختصر دیباچے سے علم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اورنگ زیب عالمگیر کے مطالعے کے لیے لکھی گئی ۔ طولانی دیباچے سے یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ یہ کتاب اورنگ زیب کے پوتے معز الدین جہاں دار شاہ کے لیے تحریر کی گئی ۔ مسعود حسن رضوی نے مقدمے میں دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب اورنگ زیب ہی کے لیے تصنیف کی گئی تھی اور یہی مختصر دیباچہ خود مصنف کا لکھا ہوا ہے ۔ مقدمے میں اس مختصر دیباچے کو بھی شامل کیا گیا ہے ۔ اس طرح مصنف کے نام میں بھی اختلاف ہے ۔ ایک نسخے میں اس کا نام میرزا محمد ابن فخرالدین محمد ہے اور دوسرے نسخے میں میرزا خاں ابن فخرالدین محمد ہے ۔ مسعود حسن نے میرزا خاں پر قیاس کیا ہے ۔ مقدمے کے آخر میں مسعود حسن رضوی رقمطراز ہیں :

''مقدمہ' کتاب کے دو حصے ہیں ۔ پہلے حصے میں ناگری حروف اور رسمِ خط کا تفصیلی بیان ہے اور دوسرے میں بھاکھا کے قواعدِ کلیہ ہیں ۔ مصنف خود کو ان قواعد کا مخترع کہتا ہے ۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ بھاکھا یعنی برج بھاشا کی گرامر اس نے پہلے پہل لکھی ہے ۔

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب — ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۱۵۷ ۔
۲۔ اصل کتاب کا نام تحفۃ الہند ہے ۔

میں نے ہندی عالموں سے رجوع کیا مگر اس سے پہلے کی لکھی ہوئی برج بھاشا کی گرائمر کا نام نہ بتا سکے ۔ بظاہر مصنف کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ یہ برج بھاشا کی پہلی گرائمر ہے ۔ اگرچہ یہ گرائمر کی کوئی جامع کتاب نہیں ہے پھر بھی تاریخی حیثیت سے غیرمعمولی اہمیت رکھتی ہے اور اردو کے بارے میں لسانی تحقیق کرنے والوں کے لیے بہت کارآمد ہے ۔ اس سے کھڑی بولی اور برج بھاشا کا باہمی تعلق آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے ۔''[1]

کچھ مثالیں دیکھیے :

بھوکھ کا بیان :

بھوکھ فعل مستقبل کو کہتے ہیں اور فعل مستقبل وہ ہے جو آئندہ زمانے سے تعلق رکھتا ہے ۔ فعل مستقبل آٹھ صیغوں میں آتا ہے ۔ (ص ۱۶)

کریا کا بیان :

کریا چار طرح پر ہے :

(۱) اسم بھاؤ (۲) اسم بھاؤ (۳) بھاؤ (۴) ان بھاؤ ۔ (ص ۱۷)

پدیرت کا بیان :

پدیرت کلام کو کہتے ہیں اور کلام دو کلموں سے مرکب ہوتا ہے ۔ مثلاً رام آیو ۔ (ص ۲۲)

کتاب کا ترجمہ سیدھے سادے انداز میں کیا گیا ہے اور اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے ۔ البتہ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ مسعود حسن رضوی نے اس مختصر حصے کا ترجمہ کر کے اور اس اہم غیر مطبوعہ حصے کو شائع کر کے لسانی تحقیق کرنے والوں کے لیے آسانی پیدا کر دی ہے اور یوں اس کی بڑی لسانی اہمیت ہے ۔ کتابی شکل میں یہ ۱۹۶۸ء میں پہلی بار شائع ہوئی ۔

فیضِ میر :

فیضِ میر خدائے سخن میر تقی میر کا رسالہ ہے جسے مسعود حسن رضوی

۱- قواعدِ کلیہ بھاکھا ، ص ۹-۱۰ ۔

نے مرتب کرکے اس کا ترجمہ بھی کیا ہے ۔ یہ پہلی بار ۱۹۲۹ع میں شائع ہوا ۔ ۱۹۶۳ع میں اس کا دوسرا ایڈیشن متن اور فرہنگ کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ۔ اختر علی تلہری اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ہمیں پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے فیض میر کو مطبوعہ لباس میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا ۔ پروفیسر صاحب نے شروع میں ایک بصیرت افروز مقدمہ لکھا ہے جس میں انھوں نے اپنے مخصوص دلپذیر انداز میں فیضِ میر کے متعلق بہت سی مفید چیزیں اور اس ضمن میں اور دوسرے ضروری امور لکھ دیے ہیں ۔[1]''

فیضِ میر پر تبصرہ کرتے ہوئے اکبر الدین صدیقی لکھتے ہیں :

''یہ رسالہ سید مسعود حسن رضوی ادیب کو ملا اور موصوف نے اس کو مرتب کرکے شائع کیا ہے ۔ یہ فارسی میں پانچ حکایتوں پر مشتمل ہے جس کا ترجمہ متن کے ساتھ شائع کیا گیا ہے ۔ یہ حکایتیں بھی ایک حد تک میر کی آپ بیتی ہیں اور ان کے اندازِ طبع و تحریر پر روشنی ڈالتی ہیں ۔ محترم پروفیسر موصوف قابلِ مبارک باد ہیں کہ خدائے سخن کی ایک تصنیف کو نئی زندگی عطا کی ۔[2]''

اس سے پہلے کہ ان آراء کی روشنی میں اور رسالے کے مطالعے اور مقدمے کے مندرجات کو سامنے رکھ کر تجزیاتی مطالعہ کیا جائے ، ضروری ہو جاتا ہے کہ فیضِ میر کے بارے میں کچھ باتیں کر لی جائیں ۔

میر تقی میر کا یہ رسالہ مدت تک سامنے نہ آیا ، حتٰی کہ بعض تذکرہ نگاروں کے ہاں اس کا ذکر تک نہیں ملتا ۔ ''سراپا سخن'' کے تذکرہ نگار محسن نے اس کا تذکرہ ''میر فیض''[3] کے نام سے کیا ہے ۔ محمد حسین آزاد نے اس کا تذکرہ ایک رسالہ مسمٰی بہ ''فیض میر''[4] کے نام سے کیا ہے ۔ یہ رسالہ مسعود حسن

۱۔ ماہنامہ ادب لکھنؤ ، جولائی ۱۹۳۰ع ۔
۲۔ سب رس ، حیدرآباد دکن ، جنوری ۱۹۴۷ع ، ص ۳۵ - ۳۶ ۔
۳۔ تذکرہ سراپا سخن از محسن ، ص ۲۶ ۔
۴۔ آبِ حیات از محمد حسین آزاد ، ص ۱۷۵ ۔

رضوی کو ملا ۔ اس کے حصول کی داستان وہ خود بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''میں نے ڈاکٹر اسپرنگر کی مرتب کی ہوئی شاہانِ اودھ کے کتب خانوں کی فہرست میں میر کی خود نوشتہ سوانح عمری ''ذکرِ میر'' کا ذکر پڑھا ۔ مجھ کو میر سے جو دلی عقیدت ہے اس کی بنا پر اس کتاب کے لیے دل بے چین ہوگیا ، مگر کسی تذکرے یا تاریخِ ادب میں اس کا ذکر نہ تھا ، نہ کسی کتب خانے میں اس کی موجودگی کا علم تھا ۔ اس لیے یہ امید نہ تھی کہ اس کتاب کی زیارت کبھی نصیب ہوگی ۔ ایک دن ایک شخص چند پرانی کتابیں بیچنے کے لیے آیا ۔ میں نے ان پر ایک نظر ڈالی ۔ ان میں سے ایک قلمی نسخہ تھا جس پر ''ذکرِ میر'' لکھا ہوا معلوم ہوا ۔ جلدی جلدی باقی کتابوں کو اُلٹا پلٹا اور سب کتابوں کی مجموعی قیمت ادا کر کے کتب فروش کو رخصت کیا ۔ اب اس قلمی نسخے کو غور سے دیکھا تو اس میں شک نہ رہا کہ یہ وہی ''ذکرِ میر'' ہے جس کو میری آنکھیں ڈھونڈھتی تھیں ۔ کتاب کے ورق اُلٹنا شروع کیے ۔ ذکرِ میر ختم ہوگئی تو میر کا رسالہ فیضِ میر نظر آیا ۔ اس کی ورق گردانی ختم ہوئی تو میر کا فارسی دیوان دکھائی دیا ۔ میر کی تین تین نایاب تصنیفیں گھر بیٹھے ایک ساتھ مل گئیں ۔ مجھ کو زندگی میں کبھی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اُس دن ہوئی . . . ذکرِ میر کی ترتیب سے دست بردار ہونا پڑا [1] تو میں فیضِ میر کی ترتیب میں مصروف ہوگیا ۔ اسی اثنا میں رسالہ ''نیرنگ'' رام پور کا میر نمبر نکلا جس سے معلوم ہوا کہ فیضِ میر کا ایک نسخہ رام پور میں بھی ہے ۔ میں رام پور پہنچا کہ اپنے نسخے کا اُس نسخے سے مقابلہ کر کے بعض مشکوک الفاظ کی تصحیح کر لوں ۔ وہاں نیرنگ کے ایڈیٹر فیض اللہ خاں سے معلوم ہوا کہ وہ رسالہ ایک ایسے شخص

۱۔ مسعود حسن رضوی نے ذکرِ میر شائع کرنے کا ارادہ کیا اور مقدمہ وغیرہ لکھنے کی تیاری کی ۔ اس اثنا میں مولوی عبدالحق کا ایک مقالہ اس کتاب پر انجمن ترقیٔ اردو کے سہ ماہی رسالے ''اردو'' میں شائع ہوا اور اس کے ساتھ یہ اعلان بھی کہ انجمن ذکرِ میر کو بہت جلد شائع کرنے والی ہے ۔ چنانچہ مسعود حسن رضوی نے اسے شائع کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ۔

کے پاس ہے جنھوں نے اپنا نام پوشیدہ رکھنے کی اُن کو سخت تاکید کر دی ہے - غرض کہ وہ کتاب دیکھنے کو نہ ملی اور میں بے نیل مرام واپس آیا ۔''[1]

چنانچہ مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنے نسخے کو مرتب کر کے شائع کیا ۔ اس رسالے میں میر تقی میر نے خود لکھا ہے کہ ''انھوں نے اپنے بیٹے فیض علی کی تعلیم کے لیے لکھا اور اس وجہ سے اس کا نام فیضِ میر رکھا ۔''[2]

فیضِ میر میں ۲۲ صفحات پر مشتمل مسعود حسن رضوی کا مقدمہ ہے جس میں تحقیقی اور تنقیدی دونوں پہلو نمایاں ہیں ۔ صاحبِ آبِ حیات نے اس رسالے کا تذکرہ کیا اور چونکہ ان کی معلومات پر اعتراضات ہوئے اور بعض لکھنے والوں نے انھیں غلط قرار دینے کی کوشش کی اور آبِ حیات کی بعض باتوں کو آزاد کا گھڑا ہوا افسانہ قرار دیا ، مسعود حسن رضوی چونکہ آزاد کے مداحوں اور معترفین میں سے تھے اس لیے وہ یہاں بھی آزاد کے حق میں فیضِ میر کی دریافت کے بارے میں لکھتے ہیں :

''میر تقی میر کے بارے میں آزاد کی بہت سی مفروضہ غلط بیانیاں دکھائی جا چکی ہیں ۔ انھی کی تصانیف میں آزاد نے رسالہ فیضِ میر کو بھی شمار کیا ہے ۔ جس وقت یہ رسالہ دنیا کی نگاہ سے اوجھل تھا اُس وقت تک وہ آزاد کا تصنیف کیا ہوا افسانہ تھا ۔ آج یہ رسالہ آپ کے ہاتھ میں ہے ۔ اب دیکھیے وہی افسانہ ایک حقیقت بن گیا ۔''[3]

اس کے مندرجات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''فیضِ میر ایک مختصر رسالہ ہے ۔ مصنف نے مختصر حمد و نعت کے بعد لکھا ہے کہ انھوں نے یہ رسالہ اپنے بیٹے فیض علی کے لیے لکھا اور ان کے اور اپنے نام کی رعایت سے اس کا نام فیضِ میر رکھا ۔''[4]

۱- میری ادبی زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعات و شخصیات ، نشریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ ، ۲ ستمبر ۱۹۶۰ع - (تحریر ۳۱ - اگست ۱۹۶۰ع)
۲- فیضِ میر (دوسرا ایڈیشن) ، مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب ، ص ۴۴ ۔
۳- فیضِ میر ، ص ۴ ۔
۴- فیضِ میر ، ص ۵ ۔

مسعود حسن رضوی نے میر کے بیٹے فیض علی فیض کے بارے میں مختلف تذکروں سے ، جن میں گلشنِ سخن (مردان علی مبتلا) ، تذکرۂ ہندی (مصحفی) ، گلشنِ بے خار (شیفتہ) ، خوش معرکۂ زیبا (ناصر لکھنوی) ، سخنِ شعراء (نساخ) شامل ہیں ، معلومات اور اشعار بھی درج کیے ہیں ۔ اس طرح کی بہت سی معلومات لکھنے کے بعد وہ رقمطراز ہیں کہ ''فیضِ میر کا زمانۂ تصنیف نہیں معلوم ہو سکا ۔''[1] اس سلسلے میں ڈاکٹر صفدر آہ تحریر کرتے ہیں :

''اس منشیانہ کتاب کو پڑھنے کے لیے کسی لڑکے کا کم سے کم بارہ چودہ سال کا ہونا ضروری ہے ۔ فیض علی ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے ۔ لہذا اس کتاب کا سالِ تصنیف ۱۱۷۴ھ یا ۱۱۷۶ھ ہونا چاہیے ۔''[2]

مگر یہ بات بھی مفروضے پر قائم کی گئی ہے ۔ ابھی تک فیضِ میر کے سالِ تصنیف کا پتہ نہیں لگ سکا ۔

فیضِ میر میں پانچ حکایتیں ہیں ۔ ان کے بارے میں مسعود حسن رضوی اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں :

یہاں حکایت سے مراد نہ بادشاہوں اور وزیروں کے قصے ہیں ، نہ دیووں اور پریوں کی کہانیاں ۔ ان حکایتوں میں میر نے اللہ والوں کے حالات اور پیروں کی کرامات بیان کی ہیں اور جو کچھ لکھا ہے وہ سنی سنائی نہیں ، آنکھوں دیکھی باتیں ہیں ۔ یہ واقعات ہوں یا میر کی خوش اعتقادی کے کرشمے ، بہرحال ان کی روشنی میں میر کی ذہنیت صاف نظر آتی ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ شاعروں کے پیر حضرتِ میر ایک فقیر منش بزرگ تھے ۔ صوفی درویشوں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے ، ان کی خدمت کو اپنی عزت اور ان کی دلجوئی کو فرضِ انسانیت سمجھتے تھے . . . تصوف اور الٰہیات کے مسائل سے میر کو بڑی دلچسپی تھی ۔ وہ ان کو غور سے سنتے اور سمجھتے اور یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے . . . ۔ ذکرِ میر اگر میر کے ماحول کا صحیح نقشہ ہے تو فیضِ میر ان کی سیرت کی سچی تصویر ہے ۔ اس کے علاوہ اس کتاب سے صوفیوں کا

۱- فیضِ میر ، ص ۲۱ ۔

۲- میر اور میریات ، از ڈاکٹر صفدر آہ ، ص ۲۰۰ ۔

انداز طبیعت، پرواز خیال اور طرز کلام بھی خوب سمجھ آتا ہے ۔''[1]

میر کی فارسی دانی اور اسلوب نثر پر رائے دیتے ہوئے مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں :

''میر کو فارسی زبان پر جو عبور تھا اور فارسی نثر لکھنے کی جو قدرت تھی وہ اُن لوگوں سے پوشیدہ نہیں جنھوں نے میر کی خود نوشتہ سوانح عمری ذکر میر اور ان کا تذکرہ "نکات الشعراء" دیکھا ہے ۔ میر کے ہم عصر بھی ان کی نثر نگاری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ میر حسن نے ان کی نظم کے ساتھ نثر کی بھی تعریف کی ہے ۔ میر بالعموم مقفیٰ عبارت لکھتے ہیں لیکن قافیے کے التزام سے عبارت کی شگفتگی ، بے ساختگی اور روانی میں فرق نہیں آتا ۔ قافیے کے التزام سے شاید کہیں کہیں تصنع پیدا ہو گیا ہے لیکن زیادہ تر عبارت کا حسن بڑھ جاتا ہے ۔ . . . میر اپنی نثر میں عام طور پر قافیے کا التزام کرتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ قافیے کی تلاش میں مطلب کی راہ بھول جائیں اور نہ یہی ہے کہ بغیر قافیے کے قدم آگے نہ بڑھائیں . . . توصیفی فقروں کے بنانے میں میر کو بڑا کمال حاصل تھا ۔ وہ جب کسی کے اوصاف بیان کرنے پر آتے ہیں تو چھوٹے چھوٹے فقرے پے درپے لکھتے چلے جاتے ہیں ۔ . . . میر کو فلسفہ الٰہیات کے مسائل سے دلچسپی تو تھی ہی ، وہ ان کو بڑی خوبی سے بیان بھی کر سکتے تھے . . . میر کے قبضے میں فارسی لفظوں اور محاوروں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے ۔ اُن کے استعمال پر ان کو جو غیرمعمولی قدرت حاصل ہے اس کے ثبوت میں کوئی مثال پیش کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا ۔ کتاب کا ہر صفحہ اس پر شہادت دے رہا ہے ۔''[2]

آخر میں مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں :

''فیض میر فارسی میں ہے اور فارسی بھی ایسی جس کا سمجھنا بہت آسان نہیں ہے ، اس لیے کتاب کی نفع رسانی کا دائرہ وسیع کرنے کی غرض

۱۔ فیض میر ، ۱۱ - ۱۲ ۔

۲۔ فیض میر ، ص ۲۱ ، ۱۹ ، ۱۸ ، ۱٦ ۔

ہے اس کا خلاصہ اردو میں لکھا جاتا ہے ۔ یہ خلاصہ کیا ہے کتاب کا آزاد ترجمہ ہے جس میں کہیں کہیں ایسے فقرے اور جملے چھوڑ دیے گئے ہیں جو صرف تزئینِ کلام کا فائدہ دیتے ہیں ۔''[1]

یوں اپنے اس مقدمے میں مسعود حسن رضوی نے فیضِ میر کی اہمیت اور میر کی نثر کی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے اور اس میں درج حکایتوں کو اللہ کے نیک بندوں کی حکایات قرار دیا ہے اور اس طرح ان کا ناطہ میر کے حوالے سے تصوف سے جوڑا ہے ۔ اس سلسلے میں رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں :

''ایک رسالہ بزبانِ فارسی موسوم بہ فیضِ میر ، جس کے آخر میں چند لطیفے و حکایات ہیں ، ان میں بعض بہت فحش ہیں ۔ اس سے اُس زمانے کا مذاق معلوم ہوتا ہے ۔''[2]

فیض میر کی ان حکایات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان میں کہیں بھی سوقیانہ پن دکھائی نہیں دیتا بلکہ یہ فحش بھی نہیں ہیں ۔ جیسا کہ خود میر کے بیان سے ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ کتاب اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے لکھی اس لیے یہ قرینِ قیاس ہی نہیں کہ میر نے اس میں فحش حکایتیں لکھی ہوں ۔ رام بابو سکسینہ نے سنی سنائی باتوں پر اعتبار کر کے ایسا لکھ دیا ہے ۔

مسعود حسن رضوی نے جس طرح خود لکھا ہے کہ انھوں نے اس کا آزاد ترجمہ کیا ہے اور تزئینی جملوں اور فقروں کو چھوڑ دیا ہے ۔ انھوں نے میر کی نثر نگاری کی بھی بڑی تعریف کی ہے ۔ اس آزاد ترجمے کو پڑھ کر میر کی نثر نگاری کا معترف ہونے کے ساتھ ساتھ مسعود حسن رضوی کی ترجمے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر گرفت کا بھی معترف ہونا پڑتا ہے کہ انہوں نے ایسی فارسی نثر کو ، جو خاصی مشکل ہے اور اس میں کئی پیچ و خم ہیں ، بامحاورہ اردو میں بڑے دلکش انداز میں ترجمہ کیا ہے اور یوں فارسی کی شیرینی اردو میں بھی چلی آئی ہے ۔ اس سلسلے میں چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکے گا :

۱- فیضِ میر ، ص ۲۲ ۔
۲- تاریخِ ادبِ اردو : از رام بابو سکسینہ ، ص ۱۸۲ ۔

''شامگہ مشکیزہ بردوش گرفتہ بباززار می آمد و آواز می داد کہ اے خشک دہانانِ ساحلِ دریائے کم آبِ ہستی ! اگر از شما کسے لب تر کردنے منظور دارد خوش باشد ۔ ہرگاہ مردمان برو گرد می آمدند کسے را شربت شکر خام و کسے را پُر از شیر جام می داد ۔''
(ص ۴۴ ، پہلی حکایت)

ترجمہ :

''شام کے وقت مشکیزہ کندھے پر رکھے ہوئے بازار میں آتا تھا اور آواز دیتا تھا کہ اے ہستی کے کم آب دریا کے ساحل پر پیاسے رہنے والو ! اگر تم میں سے کوئی اپنے لب تر کرنا چاہتا ہو تو آئے ۔ جب لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے تو کسی کو دودھ اور کسی کو شکر کا شربت پلاتا تھا ۔''[1]

''در آن زمان زنے جمیلہ چہرۂ رنگ ، شوخ و شنگ ، از قبیلۂ چیت سازان سبوچۂ گلی بر دوش ، آفتِ صبر و ہوش ، با چہرۂ آراستہ ، چون سرو لوخاستہ ، بہ بہانۂ آب صبح و شام ہم راہ ازدحام بر لبِ دریا می آمد و خوبی خود می نمود ۔ عالمے دیوانۂ او بود ۔ بہ سر زلف حرف زنان ، پشتِ چشمِ نازک کنان با فقیر چہرہ شد ۔ گفت کہ اے رہزنِ دین و دل این ہمہ خود را گم کردن برو ''رام رام'' می گفتہ باش ۔ بہ مجرد شنیدن لباس درید ، خاکِ لبِ آب بر رو مالید ، موئے سر پیچیدن گرفت ، رام گویان دویدن گرفت ، آخر دل ہمگی خون شد ، دہ مردہ کار جنون شد ، چند روز ہیچ نہ خورد بہ ہمان حال جان سپرد ۔''
(ص ۹۰ ، دوسری حکایت)

ترجمہ :

''اس زمانے میں ایک عورت خوبصورت ، خوش رنگ ، شوخ و شنگ چھینٹ سازوں کے قبیلے کی پانی بھرنے کے بہانے سے صبح و شام دریا پر آیا کرتی تھی ۔ ایک عالم اس پر فریفتہ ہو رہا تھا ۔ وہ مٹی کا گھڑا کندھے پر رکھے ہوئے بڑے ناز و انداز سے فقیر کے سامنے آئی ۔ اس

۱- فیضِ میر ، ص ۲۳ -

نے کہا اے دل و دین کو غارت کرنے والی ! اس قدر گمراہی ! جا رام رام کہا کر ۔ یہ سنتے ہی اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے ، منہ پر خاک ملی اور رام رام کہتی ہوئی ادھر اُدھر دوڑنے لگی ۔ آخر اس کا دل خون ہوگیا ، جنون بہت بڑھ گیا ، کھانا پینا چھوٹ گیا اور چند روز میں ختم ہوگئی ۔''[1]

''روزے نشستہ بودم کہ گفت اے جوان ! دوش واقعہ' دیدہ ام کہ مشعر بر واقعہ من است ۔ می بینم کہ مرا پیر من در بغل می کشد ، و شکایتِ جدائی می کند ، غالب کہ حنائے عشرتِ زندگانی برسر ناخن رسید ۔ گفتم خدا ترا صد سال سلامت دارد ۔ خواب خیال است دل برآن نہ باید نہاد ۔ در ہمان ہفتہ گوش زد شد کہ بہ سرسام مبتلا گشت ، و ازیں جہانِ گزاران در گزشت ۔ مردِ خوشے بود خداش بیامرزاد ۔''
(ص ۴۷ ، چوتھی حکایت)

ترجمہ :

''ایک دن میں (میر) فقیر کے پاس بیٹھا ہوا تھا ۔ کہنے لگا اے جوان ! کل میں نے ایک خواب دیکھا ہے جو میری موت کی خبر دیتا ہے ، یعنی یہ کہ میرے پیر نے مجھ کو گلے لگا لیا اور جدائی کی شکایت کی ۔ شاید اب زندگی کے دن پورے ہوگئے ۔ میں نے کہا کہ خدا آپ کو سو برس تک سلامت رکھے ۔ خواب محض خیال ہے ، اس کا کیا اعتبار ۔ اُسی ہفتے سنائی دیا کہ وہ سرسام میں مبتلا ہو کر دنیا سے اُٹھ گیا ۔ خدا بخشے خوب آدمی تھا ۔''[2]

یوں اصل اور ترجمے کا موازنہ کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ اثریت جو میر کی فارسی نثر میں ہے ، ترجمے میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے ۔

فیضِ میر کے مطالعے سے جو باتیں سامنے آئی ہیں ان کی تفصیل کچھ یوں بنتی ہے :

۱- فیضِ میر ، ص ۳۱ ۔
۲- فیضِ میر ، ص ۴۰ ۔

(۱) مسعود حسن رضوی نے فیض میر ترتیب دے کر نہ صرف آزاد کی بات کو سچ ثابت کیا ہے بلکہ اسے شائع کر کے مطالعۂ میر کے نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

(۲) اس کتاب کا جو آزاد ترجمہ انھوں نے کیا ہے، اس سے اس کے مندرجات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

(۳) آخر میں فرہنگ کا اضافہ اصل متن کو پڑھنے اور سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

(۴) مقدمے میں میر کی پیروں فقیروں سے عقیدت اور اس کے حوالے سے تصوف سے جس گہری دلچسپی کا ذکر کیا گیا ہے اس سے اختلاف کی گنجائش کم ہے۔ اس لیے کہ میر کے کلام سے بھی ان کی تصوف سے گہری دلچسپی کی مثالیں مل جاتی ہیں۔

(۵) فیض میر کے حوالے سے میر کی فارسی دانی اور نثر پر جس عبور کا ذکر کیا گیا ہے، کتاب کا متن اس کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔

(۶) یہ پانچ حکایات میر کی جگ بیتی کے حوالے سے آپ بیتی دکھائی دیتی ہیں اس لیے کہ میر ہر حکایت میں ایک کردار کی طرح شامل ہے اور فاضل مرتب نے اس سے میر کی سیرت کو سمجھنے کی جو بات کی ہے وہ درست معلوم ہوتی ہے۔

(۷) حکایات کے واقعات خاصے دلچسپ ہیں اور مرتب کے ترجمے نے ان میں خوبصورت رنگ بھر دیا ہے۔ ڈاکٹر صفدر آہ کے بقول:
''ان کہانیوں میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ عقل کے لیے ناقابل قبول ہیں، لیکن پھر بھی میر کا حسن انشا ہر کہانی میں نکھرا ہوا ہے جس سے قاری کا ذہن مصنف کے ساتھ چلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔''[1]

اس تبصرے پر یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ میر کے اس حسن انشا میں مترجم کا رواں ترجمہ بھی سونے پر سہاگا ہے اور کہانی کہنے کا جو انداز میر نے اختیار کیا ہے مترجم نے اسے برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

۱- میر اور میریات: از ڈاکٹر صفدر آہ، ص ۲۰۱۔

اس تناظر میں فیضِ میر مسعود حسن رضوی کا تحقیقی کارنامہ ہے کہ ان کی بدولت میر کا یہ نادر و نایاب رسالہ چھپ کر سامنے آیا۔

یوں قواعدِ کلیہ بھاکھا اور فیضِ میر میں ترجمے سے زیادہ مقدموں کی اہمیت ہے، تاہم امتحانِ وفا اس ضمن میں قابلِ ذکر ہے جس سے مسعود حسن رضوی کے فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کے گہرے مطالعے، ترجمے کے فن پر گرفت کے ساتھ ساتھ حسنِ انتخاب کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ اوائل ہی میں جبھ وہ ادب میں لووارد کی حیثیت رکھتے تھے، ترجمے جیسی مشکل صنف میں ہاتھ ڈالنا ان کی عالی ہمتی کی دلیل بھی ہو سکتی ہے اور اس سے ادب میں کچھ کرنے کے جذبے کا بھی سراغ ملتا ہے۔ بہرکیف لارڈ ٹینی سن جیسے مشکل اور منفرد شاعر کے کامیاب ترجمے کی بنا پر اردو تراجم میں امتحانِ وفا اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔ مسعود حسن رضوی اگر تحقیقی کاموں میں نہ اُلجھ جاتے اور ترجمے کی طرف توجہ دیتے تو یقیناً وہ اس میں بھی منفرد مقام کے حامل ہوتے۔

۶- بحیثیت شاعر

مسعود حسن رضوی کو شعر فہمی اور شعرگوئی میں ملکہ حاصل تھا۔ زمانۂ طالب علمی سے انہیں شعر و شاعری سے خاصی دلچسپی تھی اور انھوں نے بیت بازی کے لیے ایک الگ کلب بنا رکھی تھی، اور جیسا کہ اُن کے حالاتِ زندگی میں تحریر کیا جا چکا ہے، وہ اکیلے پوری ٹیم کو ہرا دیا کرتے تھے۔ اپنی آپ بیتی میں خود لکھتے ہیں :

''شعر کا ذوق میری فطرت میں مضمر ہے مگر اس کا اظہار شعرگوئی سے زیادہ شعر فہمی کی صورت میں ہوتا۔ تاہم کبھی کبھی دل کے جذبات قلم کی زبان سے موزوں اور مترنم شکل میں بے ساختہ ادا ہوگئے۔ ان خود رو پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ بن گیا ہے۔ میرے شعر میرے قلبی تاثرات کا ہرتو ہیں اس لیے وہ اچھے ہوں یا بُرے بہرحال سچی شاعری کے دائرے سے خارج نہیں ہیں۔''[1]

۱- ہماری شاعری، ص ۲۸۷ -

مسعود حسن رضوی کے ذوقِ شعری کا اندازہ ان کی کتاب ''ہماری شاعری'' میں شعروں کے انتخاب سے بھی ہوتا ہے جس کے بارے میں ''مسعود حسن رضوی بطور نقاد'' میں پہلے ہی لکھا جا چکا ہے۔

مسعود حسن رضوی کا تخلص ادیب تھا۔ اس تخلص کے بارے میں شوکت تھانوی نے خاصے مذاحیہ انداز میں لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مگر یہ جو ادیب ان کا تخلص ہے، اس کا مصرف کبھی سمجھ میں نہیں آیا۔ ممکن ہے یہ تخلص بھی مسعود حسن صاحب اسی احتیاط سے رکھتے ہوں جس طرح وہ قیمتی نوادر احتیاط سے رکھتے ہیں۔''[۱]

مسعود حسن رضوی کا یہ تخلص ان کے نام کی جگہ نہ لے سکا۔ اس نام کا حصہ ہی بنا رہا۔ علی جواد زیدی اس بارے میں رقمطراز ہیں:

''مسعود صاحب کے نام کے ساتھ آپ نے ایک تخلص بھی دیکھا ہوگا۔ اب سے بہت پہلے شاعر بھی تھے۔ باقاعدہ شاعر ہونے کے لیے جس ظاہری بے پروائی اور بے نظمی کی ضرورت ہے وہ مسعود صاحب میں کہاں تھی، اس لیے اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا۔ اب یہ تخلص صرف متروک شاعری کی یادگار کے طور پر نام کا جز بنا ہوا ہے۔''[۲]

مسعود حسن رضوی جز وقتی شاعر تھے۔ طبیعت آ گئی تو شعر کہہ لیا۔ اسی سلسلے وہ خود جی ایم شاہ کے اس سوال کے جواب میں کہ آپ کے نام نامی کی طرح آپ کا تخلص ادیب بھی مشہور و معروف ہے۔ اس سے ہم یہی سمجھتے ہیں کہ جناب کو شعر گوئی سے بھی شغف ہے۔ فرمایا:

''شعر کا ذوق میری فطرت میں مضمر ہے لیکن شاعر بننے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ پھر بھی کبھی کبھی بعض خیالات و جذبات موزوں اور مترنم شکل میں ظاہر ہوگئے جن کا ایک مختصر سا مجموعہ ہو گیا تھا . . . لیکن جب سے ادبی زندگی میں انہاک رہنے لگا اس وقت سے شاعری سے

۱۔ نقوش، شخصیات نمبر، حصہ اول، جنوری ۱۹۵۵ع، ص ۵۴۲۔
۲۔ آپ سے ملیے: از علی جواد زیدی، ص ۸۷ - ۸۸۔

دلچسپی کسی قدر کم ہو گئی ۔ مشہور سائنس دان ڈارون نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے :

''ابتدا میں مجھ کو شاعری اور موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی ۔ شیکسپئر کے ڈرامے مجھے بے حد پسند تھے ۔ لیکن جب سے سائنسی تحقیق میں منہمک ہوا ، شعر کا ذوق کم ہوتا گیا یہاں تک کہ ایک دفعہ شیکسپئر کا ایک ڈرامہ پڑھنے کی کوشش کی تو میرا جی متلانے لگا ۔''

مجھ کو شاعری سے متلی تو اب بھی نہیں ہوتی مگر شعر سے دلچسپی میں کمی ضرور ہو گئی ہے ۔''[1]

مسعود حسن رضوی اوائل میں مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے ۔ ایک نامکمل یادداشت[2] میں انھوں نے لکھنؤ کے مشاعروں کا ذکر کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''میری عمر اس وقت اسّی برس کے قریب ہے ۔ مدت ہوگئی کہ میں نے مشاعروں اور ادبی جلسوں کی شرکت ترک کر دی ۔ اپنا سارا وقت اپنے قلم سے ادب کی خدمت کرنے میں صرف کرتا ہوں ۔ اپنی جوانی کے زمانے میں چند یادگار مشاعروں میں شرکت کی تھی ۔ ایک مشاعرہ اس وقت کے ہر دلعزیز ادیب ، شاعر ، عاشقِ اردو حامد علی خاں صاحب بیرسٹر کے یہاں بڑے اہتمام و انتظام کے ساتھ ہوا تھا ۔ اس میں شاعروں کی جتنی کثیر تعداد نے اپنا کلام سنایا تھا کہ مشاعرہ مناسب وقفوں کے ساتھ تین دن جاری رہا تھا ۔''

اُس زمانے میں مشاعرے میں طرح ضرور دی جاتی تھی ۔ غیرطرحی مشاعرے کو شعرخوانی کی محفل کہہ سکتے تھے، مشاعرہ نہیں سمجھتے تھے ۔ اس مشاعرے میں طرح تھی : ع

کسی نے بھی نہ کچھ پوچھا مرے حسرت بھرے دل سے

۱- اہلِ قلم سے ملاقات ، از جی ایم شاہ ، لکھنؤ ریڈیو ، نشریہ ۲۶ فروری ۱۹۶۷ع -

۲- موجود ہے -

ثاقب لکھنوی کے دو شعر یاد رہ گئے ہیں ۔ مطلع یہ تھا :

کسی کا رنج دیکھوں ، یہ نہیں ہوگا مرے دل سے
نظر صیاد کی جھپکے تو یہ کہہ دوں عنادل سے

اور ایک لاجواب شعر یہ تھا :

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

ایک مشاعرہ شاید انجمن بہار ادب کی طرف سے ہوا تھا ۔ اس کے صدر سر سیتا رام صاحب تھے ۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے میں نے ایک مضمون پڑھا تھا جس کا عنوان تھا ''حکمت اور شاعری'' مصرع طرح یاد نہیں رہا ۔ اس وقت کے اسم بامسمٰی شاعر ظریف نے مطلع پڑھا :

نر ہے یا مادہ عجب ترکیب ہے اس نام کی
کچھ حقیقت ہی نہیں کھلتی ہے سیتارام کی

مشاعرہ زعفران زار بن گیا ۔ صدر مشاعرہ بھی محظوظ ہوئے ۔

کیننگ کالج کے مشاعرے کے داعی انگریزی ادب کے استاد جناب رف ۔ ٹی رائے صاحب ہوا کرتے تھے ۔ میں اس کالج میں بی ۔ اے کا طالب علم تھا ۔ ایک مشاعرے میں طرح تھی : ع

آج تک ہم ہیں فریب آہ بے تاثیر میں

جوان سال اور جوان طبیعت جوش ملیح آبادی نے بڑے زور دار لہجے میں غزل پڑھی ۔ ایک شعر یاد رہ گیا ہے :

کیسی آزادی کی طالب ہیں یہ فانی ہستیاں
روح تو جکڑی ہوئی ہے زیست کی زنجیر میں

میں نے چند متفرق اشعار کے سوا کوئی غزل کبھی نہیں کہی ۔ لیکن اس طرح میں دو تین شعر نظم ہو گئے :

فرط خود بینی سے دنیا بن گئی آئینہ زار
ایک ہی صورت نظر آئی ہے ہر تصویر میں

مسعود حسن رضوی نے بعد میں مجالس و محافل خاص طور پر مشاعروں میں شرکت کرنا چھوڑ دیا اور وہ مشاعروں میں شرکت کو ضیاعِ وقت سمجھتے تھے ۔ علی عباس حسینی اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

”جہاں کسی شعر کی زیادہ تعریفیں ہوئیں اور اُنھیں اساتذۂ قدیم میں سے کسی کا اس سے بہتر شعر یاد آ گیا ہے ، اب اگر صاحبِ شعر کی تعریف کرتے ہیں تو سرقہ صراحتاً سراہتے ہیں اور اگر خاموش ہیں تو سکوتِ سخن شناس کا الزام لگایا جاتا ہے ، اس لیے کنارہ کشی ہی میں سلامتی دکھائی دی ۔“[1]

غرض مسعود حسن رضوی نے شعر کہے اور کبھی کبھار یہ سلسلہ بھی جاری رکھا ۔ بعض اشعار انھوں نے اپنی آپ بیتی کے آخر میں درج کر دیے ہیں ۔ کچھ اشعار علی جواد زیدی نے اپنے مضمون میں درج کیے ہیں ۔ کچھ اشعار ان کے متفرق کاغذات سے ملے ہیں جن میں ایک غزل بھی شامل ہے ۔ ایک دو شعر انھوں نے اپنی بیگم کے نام خطوط میں لکھے ۔ کچھ اشعار مرزا جعفر حسین نے اپنی کتاب میں درج کیے ہیں ۔ ان تمام اشعار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مسعود حسن کا کلام ان کی داخلی کیفیات اور ان کے ذاتی تجربات کا نچوڑ ہے جس میں ان کا مشاہدہ بھی شامل ہے ۔ ان اشعار میں بے پناہ تغزل موجود ہے ۔ ان سے ایک طرح ان کے نظریۂ شعر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ واردات و کیفیاتِ دل کو لفظوں کا روپ دیتے تھے اور جو کچھ محسوس کرتے تھے وہی شعر کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا ۔ یوں شعر ان کے سچے اور کھرے جذبات و احساسات کی تصویر بن کر سامنے آیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں داخلیت ہے خارجیت نہیں ۔ ان کا لب و لہجہ اور اس میں دردمندی اور سوز و گداز انھیں میر سے قریب تر کر دیتا ہے ۔

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب — ذات و صفات ، مرتبہ مالک رام ، ص ۲۶ ۔

نمونۂ کلام :

غزل[1]

کہتے ہیں وہ کہ ہجر میں تڑپا کرے کوئی
خود کردہ کا علاج کبھو کیا کرے کوئی
تا حشر انتظار سے فرصت ہو کس طرح
ملنے کا روزِ حشر جو وعدہ کرے کوئی
بازارِ عشق گرم ہے سنتا ہوں دیکھیے
میرے دل و جگر کا بھی سودا کرے کوئی
اپنے ہی دل پہ جب نہیں دنیا کو اختیار
پھر کس لیے کسی کا بھی شکوہ کرے کوئی
افشائے رازِ عشق جو منظور ہی نہ ہو
کیوں کر فراقِ یار میں نالہ کرے کوئی
منزل کے پاس جا کے لٹا میرا قافلہ
قسمت کا اپنی ہائے گلہ کیا کرے کوئی

جذبِ دل کا بے نیازی سے اثر بڑھتا گیا
میں ہٹا جس جس طرف عالم اُدھر بڑھتا گیا
کچھ عجب حالت ہے راہِ منزلِ مقصود کی
جتنا جتنا میں بڑھا میرا سفر بڑھتا گیا

فرطِ خود بینی سے دنیا بن گئی آئینہ زار
ایک ہی صورت نظر آتی ہے ہر تصویر میں
کیا کہوں دیوانگیٔ عشق کی رسوائیاں
زلف کے پابند بھی باندھے گئے زنجیر میں

۱- یہ غزل ۱۵ اشعار پر مشتمل ہے اور مسعود حسن رضوی نے مصرعوں میں کافی کاٹ چھانٹ کی ہے - جن اشعار پر نشان لگے ہیں وہی یہاں درج کیے گئے ہیں -

اک فنا زارِ تمنا ، اک بہارستانِ شوق
کیا بتائیں ہم نے کیا دیکھا تری تصویر میں
زحمتِ تقسیم غم کیوں ہو تجھے قسمت تو بس
سختیاں جتنی ہوں سب لکھ دے مری تقدیر میں[1]

پاؤں میں ہوتی ہے بیڑی کی گرانی محسوس
دھیان جب یہ نہیں رہتا کہ اب آزاد ہوں

دردِ دل ہنس ہنس کے کہنے دے ذرا اے مشقِ ضبط
اک دلِ درد آشنا کا امتحاں لینا ہے آج

آپ کی چشمِ کرم نازِ مسیحائی ہے
ابھی کچھ مردہ تمناؤں میں جان آئی ہے

ہے اک نقشہ دلِ مجبور کی اُٹھتی امنگوں کا
لبِ ساحل حبابوں سے اُبھرنا اور مٹ جانا

جلا جن سے نشیمن جب وہ شعلے دل سے اُٹھتے ہیں
تو چار آنسو بہا آتا ہوں میں خاکِ نشیمن پر

یہ سعیٔ پردہ داری ہو اور رائیگاں ہو
وہ حالِ دل جو پوچھیں ہر موئے تن زباں ہو

سمجھے تھے طوفانِ ہستی میں جسے جائے پناہ
ایک موجِ گوہ پیکر وہ بھی تھی ساحل نہ تھا

۱- یہ شعر ڈاکٹر آفاق حسین نے لکھا ہے - نیا دور لکھنؤ ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ - اپریل ۱۹۷۷ء ، ص ۸۳ -

اب خبر دیکھیے بہار کی کیا آتی ہے
ہر طرف سے مجھے رونے کی صدا آتی ہے

اس کی چشمِ مست سے ہشیاریوں کے در کھلے
دل کی دنیا کے بہت سے راز اب ہم پر کھلے

ان دنوں کیوں جی نہیں لگتا ہے گلشن میں کہیں
برق کو شاید ہے پھر میرے نشیمن کی تلاش

خوفِ رسوائی نہیں تو ضبطِ غم سے کام کیا
پختہ کارانِ جنوں کو ہوشِ ننگ و نام کیا
خط سے کیا مطلب مجھے قاصد سے مجھ کو کام کیا
دل میں جو رہتا ہے اس کو نامہ و پیغام کیا

مجھے قاسمِ ازل سے کبھی کچھ گلہ نہ ہوتا
جو یہ غم ملے تھے مجھ کو تو یہ دل ملا نہ ہوتا

وہ سیرِ دشتِ وحشت اور میرے دل کی ویرانی
اُدھر میں تھا بیاباں میں ادھر مجھ میں بیاباں تھا

گریۂ غم یہ بھی آگے جیسے آتی تھی ہنسی
وہ دل خندۂ شادی سے بھی دلگیر ہے اب
تھے ہم آزاد جب آباد تھی دنیائے خیال
حلقۂ حدِ نظر حلقۂ زنجیر ہے اب
صفحۂ دل کے سوا جو کہیں دنیا میں نہ تھی
ذرے ذرے میں جہاں کے وہی تصویر ہے اب

اب کہاں وہ میں کہ جس کے بس کا ہو اخفائے غم
دل میں طاقت چاہیے ضبطِ فغاں کے واسطے

بس اک یہی حسرت ہے اب اے طولِ جدائی
مجھ سے جو ملیں وہ تو میں جی کھول کے رو لوں

ہم سخن لاکھوں ہیں لیکن ہم زباں کوئی نہیں
مجھ کو دنیا کی بھری محفل بھی خلوت خانہ ہے

خوشی میں رنج کہیں کیا مآل کے غم کو
خزاں کا خوف ہے جوشِ بہار میں ہم کو

اپنی تدبیروں پہ اے غافل نظر تو نے نہ کی
ورنہ پڑھ لینا خطِ تقدیر کچھ مشکل نہ تھا

غم شکستِ عہدِ ضبط و صبر کا سہنا پڑا
اپنے ہمدردوں سے آخر دردِ دل کہنا پڑا

ہر تبسم میں وہاں پنہاں تھی برقِ عقل سوز
میں سمجھتا تھا کہ اندازِ جفا کچھ اور ہے

ہم خاک کو سمجھا کیے اکسیر ابھی تک
تدبیر رہی تابعِ تقدیر ابھی تک
پھر ظلم پہ مائل ہیں تو اتنا بھی سمجھ لیں
باقی ہے مری آہ میں تاثیر ابھی تک

شکوہ کیا، مجھ کو جو بزمِ ناز سے اٹھوائے ہے
حال کس بسمل کا اس نازک سے دیکھا جائے ہے

دیکھیں نگاہِ شوق کی گستاخیاں ادیب
تیور بدل گئے مرے نازک مزاج کے

پیری آئینے سے خودبیں کو یہ دیتی ہے صدا
اب میں جانوں کہ ترے ناز اُٹھائے کوئی

دنیا کو کیا خبر مرے حالِ تباہ کی
فرصت کہاں ہجومِ مصائب میں آہ کی

دیکھیے قسمت کی محرومی کہ مثلِ سنگِ راہ
جس کے قدموں سے لگا میں اُس نے ٹھکرایا مجھے

طاقتِ پرواز بھی ہے ، ہمتِ پرواز بھی
کاش پر ہوتے لگاتی حسرتِ پرواز بھی

دیا یہ شوقِ پرواز اک قفس کے رہنے والے کو
مجھے تجھ سے بس اتنا میرے فطرت ساز کہنا ہے

مسعود حسن رضوی نے اپنی بیگم کو خطوں میں اپنے کچھ شعر لکھے جو یہ ہیں :

جو چمن ہوں میں تو نسیم تم جو سمن ہوں میں تو شمیم تم
مرے درد و غم میں سہیم تم ، تمھی مونسِ دلِ زار ہو
مرے دردِ دل کی دوا ہو تم مرے زنگِ دل کی جلا ہو تم
مرے سازِ دل کی صدا ہو تم مری زندگی کی بہار ہو
گلِ باغِ صدق و صفا ہو تم دل و جانِ مہر و وفا ہو تم
تمھیں کچھ خبر بھی ہے کیا ہو تم دلِ مضطرب کا قرار ہو[1]

ڈاکٹر نیر مسعود بتاتے ہیں کہ مسعود حسن رضوی نے اپنی ایک عزیزہ کے مرنے پر ایک نظم کہی تھی جس کا ایک شعر اُنھیں یاد ہے جو غالب کے اس شعر سے ماخوذ ہے :

۱۔ یہ تینوں شعر ایک ایک کر کے الگ الگ خطوں میں ۱۸ ۔ اکتوبر ، ۲۵ ۔ اکتوبر اور ۳۰ ۔ اکتوبر ۱۹۲۹ع کو لکھے گئے ۔

تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

اور وہ شعر یہ تھا :

یہ گھر اک گلدستہ تھا اور تو اس کا بندھن تھی
اب وہ بندھن ٹوٹ گیا، پتی پتی بکھر گئی[۱]

ڈاکٹر آفاق حسین نے اپنے ایک مضمون "میرے بھائی جان"[۲] میں مسعود حسن رضوی کے نوحے کے اشعار لکھے ہیں جو یہ ہیں :

مستعد ہے قلبِ مضطر نوحہ خوانی کے لیے
چشمِ تر تیار ہو گوہر فشانی کے لیے
اے فلک داغِ علی اکبر دیا لیلیٰ کو کب
منتیں کیا کیا نہ مانی تھیں جوانی کے لیے
کاروانِ اہلِ حرم کا ہے روانہ سوئے شام
کیوں فلک موزوں ہیں عابد ساربانی کے لیے
اکبرِ مہ رو کا مرنا اور ایامِ شباب
اے اجل تو منتظر تھی کیا جوانی کے لیے
خنجرِ قاتل بھی تھا بے آب ہے رونے کی جا
شہ کو کیا اعداء نے ترسایا تھا پانی کے لیے
قاصدِ صغریٰ کو لا کر لاشِ اکبر کے قریب
منتظر ہیں شاہ پیغامِ زبانی کے لیے
کہہ دیا کرتی تھیں زینب واقعاتِ کربلا
ضد جو کرتے تھے کبھی بچے کہانی کے لیے
تھا شبِ عاشور ہی سے دل کو کچھ ایسا ہراس
رات بھر ماں روئی اکبر کی جوانی کے لیے

☆ ☆ ☆

۱۔ ڈاکٹر نیر مسعود سے گفتگو (ریکارڈنگ) لکھنؤ، ۲ جون ۱۹۷۹ع -
۲۔ نیا دور، لکھنؤ، مسعود حسن رضوی نمبر، مارچ - اپریل ۱۹۷۷ع، ص ۸۳ - ۸۴ -

ادبی مرتبہ و مقام

گزشتہ ابواب میں مسعود حسن رضوی کی ہمہ جہت شخصیت کا ان کی تحریروں کے حوالے سے بھرپور جائزہ پیش کیا جا چکا ہے ۔ اس سے جہاں ایک طرف ان کے تحقیقی و تنقیدی کارناموں کا علم ہوتا ہے وہاں دوسری طرف یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اردو ادب کو کیا کچھ دیا ہے ۔

مسعود حسن رضوی ادیب بھی ہیں اور نقاد بھی ، محقق بھی اور مرتب بھی ، مؤلف بھی اور حاشیہ نگار بھی اور مترجم بھی ، تبصرہ نگار بھی ہیں اور مراسلہ نگار بھی ، ماہر قواعدِ زبان بھی ہیں اور شاعر بھی ، غرض ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی جہتیں خاصی پھیلی ہوئی ہیں ۔ اپنے تحقیقی و تنقیدی کارناموں کی بدولت وہ تحقیق و تنقید میں اپنی ذات ہی میں ایک دبستان تھے ۔ تحقیق و تنقید کے جو اصول انھوں نے بنائے اور پھر جس طرح عملی تنقید و تحقیق میں انھیں برتا اس کی بدولت وہ مستقبل کا منظر نامہ ہیں ۔ تنقید میں اعتدال و توازن اور تحقیق میں جو تعمیری رویہ ان کے ہاں موجود ہے وہ نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ ہے ۔

اس تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق و تنقید حالی ، شبلی اور آزاد کے بعد ان کی دکھائی ہوئی راہوں پر چل رہی ہے ۔ مسعود حسن رضوی نے "ہماری شاعری" سے لے کر "انیسیات" تک سب کام خاموشی سے کیے کہ : ع

نہ ستائش کی تمنا ، نہ صلے کی پروا

یہی وجہ ہے کہ "سب رس" حیدرآباد دکن کے جنوری ۱۹۴۰ء کے شمارے میں رشید قریشی نے انھیں بھی اردو کے خاموش خدمت گزاروں میں شامل کیا تھا ۔ مسعود حسن رضوی شہرت سے دور رہے اور انھیں کبھی بھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ لوگ ان کی تحریروں کو بہت زیادہ کیوں نہیں سراہتے ۔ اس

کا مطلب یہ نہیں کہ انھیں اپنے کاموں پر داد نہیں ملتی تھی۔ ملتی تھی مگر اتنی نہیں جتنا کہ ان کا حق تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ الگ تھلگ رہتے تھے اور صرف اپنے کام میں جتے رہتے تھے۔ مظفر علی سید اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ان کے نام اور کام سے بالعموم بے توجہی برتی جاتی ہے اور اس کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جس کے وہ مستحق ہیں۔ انھوں نے چپکے چپکے کام کیا ہے اس لیے ہمارے علمی نقارخانے میں ان کی آواز دب سی گئی اور پھر چونکہ ان کا کسی ادارے سے کوئی تعلق نہیں رہا اس لیے بھی ان کی تالیفات و تصنیفات کو اشتہاری درجہ نہیں مل سکا۔"[۱]

جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ اس میں ان کے مزاج کو بھی بڑا دخل تھا۔ وہ ناموری اور شہرت کے لیے خود دوڑ بھاگ کے خلاف تھے۔ یہی نہیں بلکہ نہ تو وہ کسی سے اس بارے میں کہتے تھے اور نہ کسی دوسرے کو ایسا کرنے دیتے تھے۔ ڈاکٹر گیان چند نے ایک مراسلے میں دو یادگاری جلدوں کی تجویز پیش کرتے ہوئے لکھا :

"اردو کے دو اور بزرگ محسنوں کی خدمات کے اعتراف میں جب تک یادگاری جلدیں نہ پیش کی جائیں گی، تب تک ایک کمی کا احساس رہے گا۔ مسعود حسن رضوی صاحب اردو کے مایۂ ناز محقق ہیں اور رشید احمد صدیقی صاحب اردو کے مایۂ ناز طنز و مزاح نگار ہیں . . . کیا ان دونوں بزرگوں کے عقیدت مند ایک ایک کمیٹی تشکیل کر کے ان کو نذرِ عقیدت پیش کرنے کا بیڑا نہ اٹھائیں گے؟"[۲]

اس کی تائید میں ڈاکٹر صفدر آہ ایک مراسلے میں لکھتے ہیں :

"پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اردو کے منفرد عالم اور محقق ہیں۔ ان کی اثباتی تحقیقیں تقریباً نصف صدی سے اردو کو مالا مال کر رہی ہیں۔ ان کی تحریر میں مثالی متانت اور وقار ہوتا ہے۔ ان کی ساری

۱۔ نقوش، اگست ۱۹۷۰ع، ص ۲۲۹۔
۲۔ ہماری زبان، علی گڑھ، ۲۲۔ اگست ۱۹۶۷ع، ص ۷۔

تخلیقات صحتِ زبان ، پختگی سیاق اور صحتِ فکر کا ایک نادر نمونہ ہیں ۔
میں ۲۲ ۔ اگست کے ''ہماری زبان'' میں پروفیسر صاحب موصوف کے
لیے ڈاکٹر گیان چند کی تجدیز و اعزاز کا دل سے خیر مقدم کرتا ہوں
اور اس کارِخیر میں ہر طرح سے شریک ہونے کے لیے حاضر ہوں ۔''[۱]

ان تجاویز میں جہاں ایک طرف مسعود حسن رضوی کے مقام و مرتبے کا علم ہوتا ہے وہاں ان کے عقیدت مندوں کا خلوص بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے ۔ مسعود حسن رضوی خود اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''۲۲ ۔ اگست ۱۹۶۷ع کے اخبار ''ہماری زبان'' میں عزیزی ڈاکٹر گیان چند نے میرے لیے یادگاری کتاب کی تجویز پیش کی ہے ۔ یہ ان کے خلوص کا فطری اظہار ہے جو میرے لیے دلی مسرت کا باعث ہے ۔ میں ان کی اس تجویز کی قدر کرتا ہوں مگر اس کی تائید نہیں کر سکتا ۔ اپنے مخلص احباب سے گزارش ہے کہ وہ از راہِ کرم اس تجویز کو آگے بڑھانے کی کوشش نہ کریں ۔''[۲]

اگرچہ ان کو یادگاری جلد تو پیش نہ کی گئی مگر ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کی زندگی ہی میں مالک رام نے اپنے رسالے ''تحریر'' کا مسعود حسن رضوی نمبر اپریل ، جون ۱۹۷۵ع نکالا اور پھر اسے ''مسعود حسن رضوی ادیب ــ ذات و صفات'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا ۔

ان کی وفات کے بعد یوں تو بے شمار مضامین اخبارات و رسائل میں نکلے مگر ''نیا دور'' لکھنؤ نے مارچ ، اپریل ۱۹۷۷ع میں مسعود حسن رضوی نمبر شائع کیا ۔ اسی طرح ''آج کل'' نئی دہلی نے فروری ۱۹۷۶ع کے شمارے میں مسعود حسن رضوی کے بارے میں کئی مضامین شائع کیے ۔

مرزا جعفر حسین نے ''مسعود حسن رضوی ادیب ــ حیات و خدمات'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جسے ۱۹۷۷ع میں میر اکاڈمی لکھنو نے شائع کیا ۔ اسی طرح ''ہماری زبان'' نئی دہلی نے ۲۲ دسمبر و یکم جنوری ۱۹۷۶ع کو مسعود حسن رضوی ادیب نمبر چھاپا ۔

۱- ہماری زبان ، علی گڑھ ، ۲۲ ستمبر ۱۹۶۷ع ، ص ۸ ۔
۲- ہماری زبان ، علی گڑھ ، ۲۲ ستمبر ۱۹۶۷ع ، ص ۸ ۔

مسعود حسن رضوی نے "ہماری شاعری" سے تنقید کا آغاز کیا اور مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے جواب میں جس طرح غزل کا دفاع کیا اور جو اسلوب تنقید اختیار کیا اس کی بدولت وہ صاحب طرز نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں ۔ ڈاکٹر انصار اللہ ۸ مئی ۱۹۷۳ء کو ڈاکٹر صفدر آہ کے نام ایک خط[1] میں لکھتے ہیں :

"میرے والد محترم فرمایا کرتے تھے کہ حالی کے بعد بلکہ ان کا جواب اگر کوئی سخن شناس نقاد سخن پیدا ہوا تو وہ سید مسعود حسن رضوی ادیب ہی ہے ۔"

یہی وجہ ہے کہ شمس الرحمان فاروقی[2] نے انھیں پرانی تنقید کا اہم ترین نقاد قرار دیا ہے ۔

اردو ڈرامے پر جس طرح مسعود حسن رضوی نے تحقیق کی ہے اور لکھنؤ کا شاہی اسٹیج اور لکھنؤ کا عوامی اسٹیج کی صورت میں اردو ڈرامے کے سلسلے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو جس طرح دور کیا ہے وہ ان کا ہی حصہ ہے ۔ سب سے پہلے اردو ڈرامے کے آغاز کا پتہ لگایا اور یہ ثابت کیا کہ واجد علی شاہ اردو کے پہلے ڈرامہ نگار تھے ۔ حقائق کی بازیافت کے لیے انھوں نے جس احتیاط کا مظاہرہ کیا اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی ۔ چنانچہ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں :

"بالکل ابتدائی ڈرامے پر اردو کے بزرگ محقق سید مسعود حسن رضوی کی کتاب اردو ڈراما اور اسٹیج تحقیق کا شاہکار ہے ۔ اردو میں اس معیار کی تحقیق کم ہوئی ہے ۔"[3]

مرثیہ اور خاص طور پر انیس کے سلسلے میں انھوں نے جو کام کیا ہے اس کی بدولت وہ ماہر انیسیات کہلانے کے ہر طرح سے مستحق ہیں ۔ انھوں نے جس طرح انیس کے کلام کو صحیح متن میں شائع کیا اس کی بدولت انیس کی

۱- میرے پاس موجود ہے ۔
۲- شعر ، غیرشعر اور نثر ، از شمس الرحمان فاروقی ، ص ۲۹ ۔
۳- ماہنامہ آج کل ، نئی دہلی ، اردو نمبر ، اگست ۱۹۶۸ء ، ص ۱۶ ۔

شاعرانہ خوبیاں نکھر کر سامنے آئی ہیں ۔ اسلافِ میر انیس بھی ان کا بڑا کارنامہ ہے ۔ اسی طرح رزم نامہ انیس ایک شاہکار ہے ۔ انھوں نے انیس کا ہر طرح سے دفاع کیا اور دلائل و شواہد کے ساتھ ساتھ میر انیس کے کلام سے میر انیس کو عظیم شاعر قرار دیا ۔ شاید اسی وجہ سے اکبر حیدری نے ڈاکٹر نیر مسعود کے نام ۵ دسمبر ۱۹۷۵ع کے ایک خط[1] میں لکھا :

"انیس اور مرثیے پر اعتراض کرنے والوں کو ان کی وفات سے خوب آزادی ملی ہے ۔"

واجد علی شاہ پر ان کی کتاب ان کا ایک اور تحقیقی کارنامہ ہے ۔ واجد علی شاہ کے بارے میں تصویر کا دوسرا رخ دکھانے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا ہے اور اس علم دوست ، علم پرور اور صاحبِ تصنیفات بادشاہ کی خدمات کا بھرپور جائزہ لے کر مخالفوں کے پروپیگنڈے کے اثرات کو زائل کرنے کی کوشش کی ہے ۔

فائز اور دیوانِ فائز ان کا وہ تحقیقی کارنامہ ہے جس پر انھوں نے قاضی عبدالودود جیسے بت شکن محقق سے بھی داد وصول کی ۔ فیضِ میر کی اشاعت سے جہاں ایک طرف میر کی یہ نایاب تصنیف سامنے آئی اور میر کے بارے میں نامعلوم باتوں کا علم ہوا وہاں دوسری طرف آبِ حیات کے بیانات کی صداقت کا بھی یقین ہوا ۔

"متفرقاتِ غالب" مرتب کرنے سے غالب کے قیامِ کلکتہ ، ان کے وہاں کے لوگوں سے تعلقات اور ان کا وہاں کہا ہوا کلام اور اس طرح کی بہت سی چیزیں پہلی بار سامنے آئیں ۔ غالبیات کے سلسلے میں یہ خاصا اہم کام ہے ۔

قواعدِ زبان کے سلسلے میں "اردو زبان اور اس کا رسمِ خط" اور لسانیات کے موضوع پر نظامِ اردو پر ان کے حاشیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں ۔ اسی طرح مجالسِ رنگین اور فسانۂ عبرت کی ترتیب و تدوین اور گلشنِ سخن کی اشاعت ان کے اہم تحقیقی کارنامے ہیں ۔ تذکرۂ نادر کی نئی شکل میں اشاعت سے تحقیق کے لئے در وا ہوئے ہیں ۔

۱- میرے پاس موجود ہے ۔

اس پس منظر میں ان کے تنقیدی و تحقیقی کارناموں پر نظر ڈالیں تو جس موضوع پر انھوں نے کام کیا ہے اس میں اہم ترین حیثیت رکھتے ہیں اور بلاشبہ ان کا شمار اردو کے ان عظیم نقادوں اور محققوں میں ہوتا ہے جنھوں نے تنقید کے نئے گوشے اجاگر کیے اور تحقیق کی نئی راہیں نکالیں ۔ بیخود موہانی جس نے ''ہماری شاعری'' پر خاصے اعتراضات لگائے تھے وہ بھی ان کے معتقد نظر آتے ہیں ۔ مسعود حسن رضوی کو ایک خط میں جو ۱۵ مئی ۱۹۲۰ع کو لکھا گیا ان کا علی عباس حسینی سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''عباس صاحب زبان اور محاورہ اچھا لکھیں گے ،کچھ تنقید کے اصطلاحی الفاظ بھی لکھیں گے مگر ادبیت کا صحیح توازن اور ''ما قل و دل'' میں آپ مشکل سے پہنچیں گے ۔''۱

ویسے یہ رائے ان کی مسعود حسن رضوی کے اختلافات سے پہلے کی ہے ۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو ان کی علمی و ادبی قابلیت کا ان کے مخالفین کو بھی اعتراف تھا ۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں :

''میں نے مسعود حسن رضوی کی علمیت کے بارے میں کبھی بھی دو رائیں نہیں پائیں ۔ وہ لوگ جو ان سے اختلاف کرتے تھے وہ بھی ان کے قائل رہے اور جن لوگوں نے ان سے استفادہ کیا ان کو بھی ان کی عالمانہ عظمت کا ہمیشہ احساس رہا ۔''۲

مسعود حسن رضوی کی اصل حیثیت محقق کی ہے ۔ ان کی تنقید میں بھی تحقیقی انداز ہی پایا جاتا ہے ۔ تحقیقی اعتبار سے جو مقام انھیں اپنی زندگی میں ملا اور جس طرح ان کی علمی و ادبی تحقیقات کا اعتراف کیا گیا اس کی بنا پر وہ بڑے محققوں میں شمار ہوتے ہیں ۔

''آج کل'' نئی دہلی نے اگست ۱۹۶۷ع میں جو اردو تحقیق نمبر چھاپا تھا اس کے سرورق کے پیچھے ''اردو تحقیق کے چار ستون'' کے عنوان سے قاضی

۱۔ خطوطِ بے خود ، مرتبہ سید زائر حسین کاظمی ، ص ۶۱ ۔
۲۔ ہماری زبان ، نئی دہلی ، ۲۲ دسمبر ، یکم جنوری ۱۹۷۶ع ۔

عبدالودود ، امتیاز علی عرشی ، مسعود حسن رضوی اور مالک رام کی تصاویر لگائی ہیں ۔ اسی نمبر میں سید علی جواد زیدی نے اپنے مضمون ''اردو تحقیق کے چند سنگ میل اور ستون'' میں لکھا ہے :

''جہاں تک تحقیق کے میدان میں راہ نمائی کا تعلق ہے ، ہمارے سامنے ہندوستان میں چار محققین کے نام یک وقت آتے ہیں : قاضی عبدالودود ، امتیاز علی عرشی ، سید مسعود حسن رضوی اور مالک رام . . . مسعود صاحب کی تحقیق میں پھیلاؤ اور وسعت ہے اور وہ تحقیق کے ساتھ ہی قدیم طرز کے اصلاحی نقد ادب پر بھی حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں . . . . مسعود صاحب ہمارے ان محققین میں ہیں جن کا اثر ان کی زندگی ہی میں محسوس کیا جانے لگا ہے ۔''[1]

اسی طرح ڈاکٹر گیان چند نے بھی اپنے ایک مضمون[2] میں مسعود حسن رضوی کو تحقیق کی آبرو قرار دیا ہے ۔ یہ مضمون ان کی کتاب ''حقائق'' میں بھی شامل ہے ۔

مسعود حسن رضوی ، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے ، اپنی ذات میں ایک انجمن اور ایک دبستان تھے اور اپنے موضوعات کے میدان میں حرف آخر اور سند کی حیثیت رکھتے تھے ۔ اسی بات کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر تنویراحمد علوی لکھتے ہیں :

''ان کی ذات نے رفتہ رفتہ ایک ادارے کی شکل اختیار کر لی تھی ۔ ان کا فرمایا ہوا سب کے لیے مستند بن گیا ۔''[3]

مالک رام نے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے :

''پروفیسر مسعود حسن رضوی محض ایک شخص کا علم نہیں تھا بلکہ یہ تاریخ ادب اردو کے ایک پورے باب کا عنوان تھا اور اگر کبھی

۱۔ ماہنامہ آج کل اردو تحقیق نمبر ، اگست ۱۹۶۷ع ، ص ۶۷ - ۷۱ ۔
۲۔ آج کل نئی دہلی ، جنوری ۱۹۷۴ع ، ص ۱۴ ۔
۳۔ نوائے ادب بمبئی ، جنوری ۱۹۷۶ع ، ص ۷۱ ۔

کسی کو یہ تاریخ لکھنے کی توفیق نصیب ہوئی تو یقیناً ان کے لیے
ایک پورا باب وقف کرنا پڑے گا۔"۱

غرض مسعود حسن رضوی مفکر و دانشور ، انیس شناس ، کبھی نہ بجھنے والی ادبی شمع ، نئی نسل کے رہنما اور لکھنؤ کی تہذیب کے رمز شناس تھے۔ اس وجہ سے ڈاکٹر صفدر آہ نے انھیں لکھنویات کا آخری مستند محقق لکھا ہے۔ لکھتے ہیں :

"بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے انھیں تحقیق ہی کے کام کے لیے
پیدا کیا تھا۔"۲

خواجہ احمد فاروقی نے آج کل فروری ۱۹۷۶ع کے مسعود حسن رضوی نمبر میں "عالم کی موت" کے نام سے جو مضمون لکھا وہ ان کی آل انڈیا ریڈیو سے تقریر تھی۔ یہ مضمون "ہماری زبان" کے مسعود حسن رضوی نمبر میں بھی شائع ہوا ہے اور اس پر انھوں نے نظرثانی کی ہے۔ یہ مضمون مسعود حسن رضوی کی وفات پر لکھا گیا۔ اس میں انھوں نے مسعود حسن رضوی کو دبستانِ لکھنؤ کا سب سے قدآور ادیب اور دانشور ، ایک بالغ نظر محقق ، ایک دیدہ ور نقاد اور ایک شریف النفس انسان قرار دیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"اب کون ہے جو شعر کی حقیقت اور ماہیت اور اس کی معنوی خوبیوں
کو سمجھائے گا ؟ کون ہے جو اردو کی تصویر کو تہذیب کے بڑے
مرقع میں سجائے گا ؟ کون ہے جو اچھی کتاب کے لکھنے یا چھپنے
پر اتنا خوش ہوگا . . . یہ وسعتِ معلومات ، یہ بالغ نظری ، یہ
سخن فہمی ، یہ متانتِ علم ، یہ نفاستِ ذوق ، یہ وضع داری ، یہ
وقار ، علم کا یہ شوق ، یہ نکتہ رسی ، لکھنؤ سے یہ عشق ، یہ کرید ،
یہ جستجو ، زبان و ادب کی ادا شناسی اب کہاں ملے گی۔ پروفیسر
مسعود حسن رضوی کے اُٹھ جانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرد
نہیں ، پورا ایک عہد ختم ہو گیا ، ایک تہذیب سوگوار ہو گئی ، ایک
شہر بے رونق ہو گیا ، ایک انجمن سونی ہو گئی۔ مجھے ہرگز امید نہیں

۱۔ آج کل ، فروری ۱۹۷۶ع ، ص ۲۴۔
۲۔ کتاب ، لکھنؤ ، دسمبر ۱۹۶۴ع ، ص ۵۱۔

کہ اب ہمارے یہاں کوئی ایسا جامع حیثیات شخص پیدا ہوگا جو ہماری شاعری یا میر انیس کے موضوع ، فارسی مرثیے کی تاریخ ، شاہانِ اودھ کے علمی کارناموں یا واجد علی شاہ کے ادبی مشاغل پر اس اعتماد ، اس سنجیدگی اور اس وثوق سے لکھ سکے گا ۔''۱

یہ ایک بھرپور خراج تحسین ہے جو مسعود حسن رضوی کے ایک ہمعصر نے انھیں پیش کیا ہے اور واقعی جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو یہ بات حرف بہ حرف صحیح معلوم ہوتی ہے کہ تنقید و تحقیق میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکے گا ۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین :

''ان کی ساری زندگی تحقیق و تدقیق میں گزری . . . مرحوم نے اردو زبان و ادب کی جو خدمت سرانجام دی ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔''۲

مسعود حسن رضوی کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان کی تحریروں میں کہیں بھی تلخی اور اشتعال نام کو نہیں ۔ اگرچہ کہیں کہیں عقیدت کا رنگ آ جاتا ہے اور موضوع سے ان کی جذباتی وابستگی بھی ظاہر ہوتی ہے ، مگر اعتراض کرنے والوں کا جواب دیتے ہوئے وہ متانت اور سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ۔ رشید احمد صدیقی اسی وجہ سے رقمطراز ہیں :

''مرحوم کی تحریر حشو و زوائد سے پاک ہوتی ہے ۔ سنجیدہ ، شائستہ اور پُرمغز اردو لکھنے میں مرحوم صاحبِ طرز مانے جا چکے ہیں ۔''۳

اس اعتبار سے مسعود حسن رضوی ایک صاحبِ طرز اسلوب رکھتے تھے اور محمد حسین آزاد کا ادبی رنگ ان سے بہتر کسی اور کے ہاں دکھائی نہیں دیتا ۔ وہ لفظ و معنی کا بھی اتنا دھیان رکھتے تھے کہ ان کے سامنے بڑے بڑے اردو کے عالموں کو بھی احتیاط کرنا پڑتی تھی ۔ ان کے بعد بلاشبہ لفظ ، لہجے اور تلفظ کی ایک روایت کا خاتمہ ہو گیا ہے ۔

۱- ہماری زبان ، نئی دہلی ، ۲۲ دسمبر و یکم جنوری ۱۹۷۶ع ، ص ۱ ۔
۲- ہماری زبان ، نئی دہلی ، ۲۲ دسمبر و یکم جنوری ۱۹۷۶ع ، ص ۱۱ ۔
۳- ہماری زبان ، نئی دہلی ، ۲۲ دسمبر و یکم جنوری ۱۹۷۶ع ، ص ۱۱ ۔

مسعود حسن رضوی جتنی بڑی قد آور ادبی شخصیت تھے اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بہت سے ادیبوں ، نقادوں اور محققوں نے اپنی کتابوں کے انتساب ان کے نام کیے ہیں ۔ چند ایک انتساب ملاحظہ ہوں ۔

محمد باقر شمس نے اپنی کتاب ''لکھنؤ کی شاعری'' کا انتساب اس طرح کیا ہے :

''ذوقِ سلیم کا مظہر ، شرافتِ انسانی کا جوہر ، تہذیب و شائستگی کا پیکر ، ادب نواز ، ادیب ساز ، انشا پرداز پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے نام ۔''

ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اپنی کتاب ''مطالعہ و مشاہدہ'' کا انتساب ان الفاظ میں کیا ہے :

''پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب سابق صدر و پروفیسر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے نام جو علم کے سمندر اور خلوص کے پیکر ہیں ۔''

مولانا اختر علی تلہری نے ، جو مسعود حسن رضوی کے خاص دوستوں میں سے تھے ، اپنی کتاب ''تنقیدی شعور'' کا انتساب بڑی عقیدت سے یوں کیا ہے :

''ادبی خلوص و مودت اور فنی محبت و عقیدت کے بے لوث جذبات کے تحت اپنے تنقیدی مضامین کے پہلے مجموعے ''تنقیدی شعور'' کو ادیبِ جلیل ، محققِ نبیل ، گرہ کشائے رموزِ فکر و فن ، محبِ مومن جناب پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے سعید نام سے منسوب کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جنھوں نے میرے ذوقِ تحریر و انشا کو ادبیات کے جادے پر گام پیمائی کا خاص طور سے شوق دلایا ۔''

ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی نے اپنی کتاب ''اردو کا پہلا یک بابی ڈراما'' کا انتساب ''اردو ڈرامے کے محققِ اول'' محترم جناب پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے نام کیا ہے ۔

مسعود حسن رضوی کے نام دیگر انتسابوں کی تفصیل یہ ہے :

میر انیس سے تعارف ، از صالحہ عابد حسین ۔

اردو کی نثری داستانیں ، از ڈاکٹر گیان چند ۔

تاجدار اودھ ، از امجد علی خاں ۔

مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات ، از ڈاکٹر محمد حسین ۔

فسانۂ عجائب ، مرتبہ اطہر پرویز ۔

مرثیہ بعد انیس ، از ڈاکٹر سید صفدر حسین ۔

تعبیر تشریح تنقید ، از ڈاکٹر مسیح الزماں ۔

مسعود حسن رضوی کی خدمات کا اعتراف علمی ادبی سطح کے علاوہ سرکاری سطح پر بھی ہوا ۔ باب اول میں ان کے انعامات و اعزازات کا تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے ۔ یہاں صرف یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ ۱۰ - اپریل ۱۹۶۹ع کو صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے انھیں سب سے بڑا علمی اعزاز ''سرٹیفکیٹ آف آنر'' دیا - ۲۱ - اپریل ۱۹۷۰ع کو صدر جمہوریہ وی ۔ وی ۔ گری نے ''پدم شری'' کا اعزاز دیا ۔ کتابوں پر انعامات اور وظائف اس کے علاوہ ہیں ۔

مسعود حسن رضوی کی اتنی اہمیت تھی کہ جو ادیب اور شاعر باہر سے آتا تھا وہ مسعود حسن رضوی سے ملاقات کیے بغیر نہیں جاتا تھا ۔ اس سلسلے میں بہت سے نقادوں اور محققوں نے مسعود حسن رضوی سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے ۔ میں یہاں صرف ایک اقتباس پر اکتفا کروں گا ۔

رام لعل نے ''شب خون'' الہ آباد کے دسمبر ۱۹۶۸ع کے شمارے میں ''احساس کی یاترا'' کے عنوان سے جو رپورتاژ لکھی ہے اس میں لکھتے ہیں :

''نارنگ صاحب کو پروفیسر مسعود حسن رضوی سے کچھ کام ہے ۔ دوسرے جدید فن کار بھی ان سے ملنے کے مشتاق ہیں ۔ عقیدت مندانہ اور تعظیم آمیز نگاہوں کے ساتھ ہم ان کے کمرے میں داخل ہو رہے ہیں . . . ۔ میرا خیال ہے مسعود حسن رضوی صاحب بھی جدید ذہن سے ہی تعلق رکھتے ہیں ۔ برسوں پہلے ''ہماری شاعری'' میں حالی کے مقدمے پر اجتہادی نظریات اور حقائق پیش کرنے والے ناقد اور ملک کے اہم ترین سکالر ہیں ۔ آج بھی نئی سے نئی دریافتوں کی جستجو اور

اس جستجو کی حسرت میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔"۱

یہ اعتراف قابلِ ستائش ہے اس لیے کہ یہ کسی نقاد یا محقق کا نہیں بلکہ ایک افسانہ نگار کا خراج ہے جو انھوں نے مسعود حسن رضوی کی علمی خدمات کو دیا ہے ۔

تحقیق و تنقید میں مسعود حسن رضوی کا رویہ اپنے ہمعصروں سے مختلف رہا ہے ۔ اگر ہم ان کی قبیل کے تین محققوں قاضی عبدالودود ، امتیاز علی عرشی اور مالک رام سے ان کا تقابلی مطالعہ کریں تو وہ ان سے الگ نظر آتے ہیں ۔ خاص طور پر قاضی عبدالودود کے مقابلے میں ان کے ہاں خردہ گیری ، عیب جوئی ، اشتعال ، تلخی اور ہیجان کی کیفیات نہیں پائی جاتیں ۔ انھیں خود بھی اس بات کا احساس تھا ، تبھی انھوں نے اپنی کتاب ''اسلافِ میر انیس'' کا انتساب تعمیری تحقیق کے قدر شناسوں کے نام کیا ہے ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک تخریبی تنقید بھی تھی جس سے ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا ۔ اس کے ذریعے انھوں نے ایک طرح ایسے محققوں پر بھرپور طنز کیا ہے جو ساری عمر دوسروں کے عیب اور غلطیاں نکالنے میں صرف کرتے ہیں اور خود کچھ نہیں کرتے ۔ مسعود حسن رضوی کو تعمیری تحقیق کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے اس لیے کہ انھوں نے تحقیقی سچائی کو برقرار رکھا ہے اور احتساب کا کوڑا ہاتھ میں نہ ہونے کے باوجود بھی بہترین تحقیقی نمونے پیش کیے ہیں ۔ ان کی وفات پر جو تعزیت نامے آئے ان سے اس بات کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے ۔ ذیل میں چند خطوں کے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں ۔ یہ سب خطوط میرے پاس موجود و محفوظ ہیں ۔

وہ اردو کے صاحبِ نظر محقق تھے اور احتیاط پسندی کو عموماً ملحوظ رکھتے تھے ۔

(رشید حسن خاں ، ۴ دسمبر ۱۹۷۵ع)

''انھوں نے ساٹھ سال سے زیادہ تک اردو زبان کو اپنی بے بہا تصنیف و تالیف ، تحقیق سے جس طرح مالامال کیا ہے اس کے احسان سے اردو زبان کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتی ۔''

(صالحہ عابد حسین ، یکم دسمبر ۱۹۷۵ع)

۱۔ شب خون ، الہ آباد ، دسمبر ۱۹۶۸ع ، ص ۳۰ ۔

"ان کے اُٹھ جانے سے اردو دنیا ایک عظیم محقق ، عالم ، استاد اور ایک بزرگ ادیب سے محروم ہو گئی ۔"

(آل احمد سرور ، یکم دسمبر ۱۹۷۵ع)

"رضوی صاحب کی اردو تحقیق کی خدمات بے مثال ہیں جن کی وجہ سے انھیں کبھی بھلایا نہیں جا سکے گا ۔ ان کی شخصیت قاضی عبدالودود ، امتیاز علی عرشی اور مالک رام کے ساتھ جڑتی ہے بلکہ ان سے بلند ہی معلوم ہوتی ہے ۔"

(رام لعل ، ۲ دسمبر ۱۹۷۵ع)

"ادب میں علمی حیثیت سے خود کو لاوارث تصور کرتا ہوں کیونکہ میں علمی و ادبی معاملات میں اکثر و بیشتر ان سے مشورہ کرتا تھا ۔"

(ڈاکٹر سلام سندیلوی ، یکم دسمبر ۱۹۷۵ع)

"ہم سب نے پروفیسر صاحب کی وفات کی صورت میں بہت کچھ کھو دیا ہے ۔ اردو کو اب ایسا کوہکن شاید ہی مل سکے ۔ ۔ ۔ ۔ اب ایسا کون ہے جس کی تحریر کا باطن بھی خوب صورت ہو اور ظاہر بھی ۔"

(مشفق خواجہ ، ۴ دسمبر ۱۹۷۵ع)

ان آرا سے مسعود حسن رضوی کے مقام اور ان کی ادبی خدمات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہمعصروں کی نظر میں ان کا کیا مقام اور مرتبہ تھا ۔ مسعود حسن رضوی کے ویسے تو تمام کارنامے ایسے ہیں کہ اردو ادب کی تاریخ انھیں فراموش نہیں کر سکتی تاہم اردو ڈراما ، انیس اور واجد علی شاہ پر کوئی کتاب یا مضمون ان کے حوالے کے بغیر مکمل نہیں کہا جا سکتا ۔ دراصل انھوں نے مواد کی فراہمی اور مستند حوالوں کی تلاش میں اتنا عرصہ لگا دیا کہ وہ بعد میں اس کو سمیٹ نہ سکے ۔ یہی وجہ ہے کہ اردو مرثیے پر ان کا کوئی مبسوط کام سامنے نہ آسکا ۔ بہرکیف مسعود حسن رضوی نے جس بھی موضوع پر تحقیقی کام کیا ہے اس میں انھیں بانی کا درجہ حاصل ہے ، چاہے وہ اردو ڈراما ہو یا واجد علی شاہ ، مرثیہ یا میر انیس ۔ ان سب پر انھوں نے ہی کام کا آغاز کیا اور انتہا تک پہنچایا ۔

مسعود حسن رضوی کے علمی و ادبی کارناموں کو سمیٹا جائے تو صاف نظر

آتا ہے کہ انھوں نے اپنی ژرف نگاہی ، دیدہ ریزی ، محنت ، ریاضت اور ادبی دیانت داری سے اردو ادب کو وہ کچھ دیا ہے ادر فرد واحد کی حیثیت سے دیا ہے کہ بڑے بڑے ادارے بھی نہیں دے سکتے ۔ انھوں نے ہماری شاعری کے حوالے سے شاعری خاص طور پر غزل کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ۔ ادبی معرکوں میں اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لہجے کی متانت برقرار رکھی ۔ منفرد اور الگ طرز نگارش اور اسلوب بیان اختیار کیا ۔ اصول تنقید کے ساتھ ساتھ اصول تحقیق وضع کیے اور تعمیری تحقیق کا حق ادا کیا ۔ مضامین میں معلوماتی لکتے پیدا کیے ، لسانیاتی معلومات دیں ۔ انیس کو از سر لو دریافت کیا اور اردو ڈرامے کے آغاز پر فیصلہ کن مہر ثبت کر دی ۔ ان تمام باتوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مسعود حسن رضوی کا مقام ان کے ہمعصر محققوں اور نقادوں سے کہیں بلند ہے اور ادبی تاریخ ان کی خدمات کو کسی طرح بھی فراموش نہیں کر سکتی اور ان کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی ہر تاریخ ادھوری ہوگی ۔

☆ ☆ ☆

کتابیات

اردو کتب :

۱- آزاد ، محمد حسین : مقدمۂ آبِ حیات ، لاہور ، مکتبۂ عالیہ (س ۔ ن) ۔

۲- آزاد ، محمد حسین : آبِ حیات ، لاہور ، سنگِ میل (س ۔ ن) ۔

۳- ابنِ حسن قیصر : غالب نما ، کراچی ، ادارۂ یادگار غالب (س ۔ ن) ۔

۴- اثر ، اخلاق : ریڈیو ڈرامے کا فن ، دہلی ، مکتبہ جامعہ ۱۹۷۷ع ۔

۵- احتشام حسین : تنقیدی نظریات ، لکھنؤ ، ادارۂ فروغ اردو ۱۹۶۱ع ۔

۶- احتشام حسین : داستانِ اردو ، کراچی ، الکتاب ۱۹۶۵ع ۔

۷- احسن لکھنوی ، میر مہدی حسن : واقعاتِ انیس ، لاہور ، سنگِ میل ۱۹۷۴ع ۔

۸- آرزو ، مختار الدین احمد : احوالِ غالب ، علی گڑھ ، انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۵۳ع ۔

۹- اسلم فرخی : محمد حسین آزاد ، کراچی ، انجمن ترقی اردو ۱۹۶۵ع ۔

۱۰- اعجاز حسین : مختصر تاریخ ادب اردو ، لکھنؤ ، ادارۂ فروغِ اردو ۱۹۶۵ع ۔

۱۱- اعظمی عبداللطیف : مشاہیر کے خطوط ، دہلی ، مکتبہ جامعہ ۱۹۷۵ع ۔

۱۲- افسر ، حامد اللہ : تنقیدی اصول اور نظریے ، کراچی ، انجمن ترقی اردو ۱۹۷۵ع ۔

۱۳- افضال احمد : نذر آرزو ۔

۱۴- النقوی ، علی تقی : شہیدِ انسانیت ، لکھنؤ ، کتاب نگر ، ۱۹۷۴ع ۔

۱۵- امانت لکھنوی : اندر سبھا ، لاہور ، عشرت پبلشنگ ہاوس (س ۔ ن) ۔

۱۶- امجد علی خان : تاجدار اودھ ، لکھنؤ ، لکھنؤ کلچر ایسوسی ایشن ۱۹۷۶ع۔

۱۷- امجد علی خان : تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ ، لکھنؤ ، واجد علی شاہ اکاڈمی ۱۹۷۸ع -

۱۸- بیخود موہانی : جوہر آئینہ ، لکھنؤ ، انوار بکڈپو ، ۱۹۲۳ع -

۱۹- ایخود موہانی : منظر آئینہ ، شیعہ کالج لکھنؤ ۱۹۳۶ع -

۲۰- بیخود موہانی : گنجینہ تحقیق ، لکھنؤ اتر پردیش اردو اکاڈمی ۱۹۷۹ع -

۲۱- تارا چند ، ڈاکٹر : نذر ذاکر ، نئی دہلی ، مجلس نذر ذاکر ۱۹۶۸ع -

۲۲- تلہری ، اختر علی : تنقیدی شعور ، لکھنؤ ، کتاب نگر (س ـ ن) ـ

۲۳- جعفر حسین ، مرزا : مسعود حسن رضوی ادیب ، حیات و خدمات ، لکھنؤ ، آل انڈیا میر اکاڈمی ۱۹۷۷ع -

۲۴- جعفر حسین ، مرزا : ادبیات و شخصیات ، لکھنؤ ، ۱۹۷۸ع -

۲۵- جعفر حسین ، مرزا : بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں ، لکھنؤ ، اتر پردیش اردو اکاڈمی ۱۹۷۸ع -

۲۶- جعفری ، رئیس احمد : واجد علی شاہ اور ان کا عہد ، لاہور ، شیخ غلام علی ۱۹۶۷ع -

۲۷- جعفری ، علی سردار : ترقی پسند ادب ، لاہور ، مکتبہ پاکستان (س ـ ن) ـ

۲۸- چڑیا کوٹی ، مولانا محمد مبین : جواہر سخن جلد دوم ، الہ آباد ، ہندوستانی اکاڈمی ۱۹۳۵ع -

۲۹- حالی، الطاف حسین : مقدمہ شعر و شاعری ، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی لاہور ، مکتبہ جدید ۱۹۵۳ع -

۳۰- حامد اللہ ندوی : لکھنؤ کی لسانی خدمات ، بمبئی ، مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر ۱۹۷۵ع -

۳۱- حسینی ، علی عباس : مرثیہ ، لکھنؤ ، اردو پبلشرز ۱۹۷۲ع -

۳۲- حیدر ، آغا : مطالعہ آب حیات ، لاہور ، سنگ میل ۱۹۶۹ع -

۳۳- خبیر لکھنوی : رزم نامہ دبیر ، لکھنؤ ، نسیم بکڈپو ، ۱۹۶۴ع -

۳۴- خورشید ، عبدالسلام : اردو ڈراما ، لاہور ، مکتبۂ اردو (س ۔ ن) ۔

۳۵- خویشگی ، محمد عبداللہ خان : بوستانِ قلم ۔

۳۶- خبیر بیوروی : لذرِ مقبول ، جون پور ، آل الذیا شفیق میموریل ۔وسائٹی
۱۹۷۰ع ۔

۳۷- ذکی کاکوروی : مطالعۂ لکھنؤ ، مرکز ادب ۱۹۷۳ع ۔

ذکی کاکوروی : فسانۂ عبرت ، لکھنؤ ، مرکز ادب ۱۹۷۷ع ۔

۳۸- ذوالفقار ، غلام حسین : اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر ،
لاہور ، جامعۂ پنجاب ۱۹۶۶ع ۔

۳۹- رشید حسن خاں : ادبی تحقیق ۔ مسائل اور تجزیہ ، علی گڑھ ، ایجوکیشنل
بک ہاؤس ۱۹۷۸ع ۔

۴۰- رضوی ، نیر مسعود : رجب علی بیگ سرور ، الہ آباد ، الہ آباد یونیورسٹی
۱۹۶۷ع ۔

۴۱- زور ، محی الدین قادری : ہندوستانی لسانیات ، لاہور ، مکتبۂ معین الادب
۱۹۶۱ع ۔

۴۲- زیدی ، سید احمد عباس : گلستانِ سعید ، لکھنؤ ، ۱۹۶۶ع ۔

۴۳- زیدی ، علی جواد : آپ سے ملیے ، دہلی ، مکتبۂ شاہراہ ۱۹۶۳ع ۔

۴۴- سبزواری ، شوکت : داستانِ زبانِ اردو ، کراچی ، انجمن ترقی اردو
۱۹۶۰ع ۔

۴۵- سبزواری ، شوکت : لسانی مسائل ، کراچی ، مکتبۂ اسلوب ۱۹۶۲ع ۔

۴۶- سجاد ، سید : آبِ حیات کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ ، لاہور ، نئی
مطبوعات ۱۹۶۶ع ۔

۴۷- سرور ، آلِ احمد : تنقید کیا ہے ، کراچی ، اردو اکاڈمی سندھ ۱۹۵۲ع ۔

۴۸- سکسینہ ، رام بابو : تاریخ ادب اردو ، لاہور ، نیشنل بک ہاؤس ۱۹۸۰ع ۔

۴۹- سکندر ، آغا : بیخود موہانی ۔ حیات و شاعری ، لکھنؤ ، ۱۹۷۴ع ۔

۵۰- سلام سندیلوی : مطالعہ و مشاہدہ ، لکھنؤ ، نسیم بکڈپو (س ۔ ن) ۔

۵۱- سلیم اختر : اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (آٹھواں ایڈیشن) ، لاہور ، سنگِ میل ۱۹۸۱ع -
۵۲- شاد عظیم آبادی : پیغمبرانِ سخن ، لاہور ، بارگاہِ ادب ۱۹۷۴ع -
۵۳- شارب ردولوی : جدید اردو تنقید ، لکھنؤ ، نصرت پبلشرز (س - ن) -
۵۴- شبلی نعمانی ، موازنۂ انیس و دبیر ، کراچی ، اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۶۲ع-
۵۵- شبیہ الحسن : ناسخ ، لکھنؤ ، اردو پبلشرز ۱۹۷۵ع -
۵۶- شرر ، عبدالحلیم : گزشتہ لکھنؤ ، لکھنؤ ، نسیم بکڈپو ۱۹۷۴ع -
۵۷- شمس ، محمد باقر : لکھنؤ کی تہذیب ، کراچی ، دارالتصنیف (س - ن) -
۵۸- شمس ، محمد باقر : شکستِ آئینہ ، لکھنؤ ، ۱۹۳۷ع -
۵۹- شیرانی ، حافظ محمود : پنجاب میں اردو ، لاہور ، مکتبۂ معین الادب ۱۹۶۸ع -
۶۰- صابر علی خان : سعادت یار رنگین ، کراچی ، انجمن ترقی اردو ۱۹۵۶ع -
۶۱- صالحہ عابد حسین : میر انیس سے تعارف ، دہلی ، مکتبۂ جامعہ ۱۹۷۵ع -
۶۲- صدیقی ، ابواللیث : لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ، لاہور ، اردو مرکز ، ۱۹۶۷ع -
۶۳- صفدر آہ : میر اور میریات ، بمبئی ، علوی بکڈپو ۱۹۷۲ع -
۶۴- صفدر حسین ، سید : لکھنؤ کی تہذیبی میراث ، لاہور ، بارگاہِ ادب ۱۹۷۵ع -
۶۵- عبادت بریلوی : غزل اور مطالعۂ غزل ، کراچی ، انجمن ترقی اردو ۱۹۵۰ع -
۶۶- عبادت بریلوی : شاعری اور شاعری کی تنقید ، کراچی ، اردو دنیا ، ۱۹۶۵ع -
۶۷- عبادت بریلوی : اردو تنقید کا ارتقا ، کراچی ، انجمن ترقی اردو ۱۹۸۰ع-
۶۸- عباسی ، عرفان : آپ ، لکھنؤ ، ۱۹۴۸ع -
۶۹- عبدالحق ، مولوی : سرسید احمد خان - حالات و افکار ، کراچی ، انجمن ترقی اردو ۱۹۷۵ع -

۷۰- عبدالحق ، مولوی : افکار حالی ، کراچی ، انجمن ترقی اردو ۱۹۷۶ع -

۷۱- عبداللہ ، سید : شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن ، لاہور، مکتبہ جدید ۱۹۵۲ع -

۷۲- عبداللہ ، سید : سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ ، لاہور ، مکتبہ کارواں ۱۹۶۰ع -

۷۳- عبداللہ ، سید : اردو ادب ۱۸۵۷ع تا ۱۹۶۶ع ، لاہور ، مکتبہ خیابانِ ادب ۱۹۶۷ع -

۷۴- عبدالودود ، قاضی : عیارستان ، پٹنہ ، ادارۂ تحقیقاتِ اردو ۱۹۵۷ع -

۷۵- عسکری ، مرزا محمد : من کیستم ، لکھنؤ ۱۹۳۲ع -

۷۶- عشرت رحمانی : اردو ڈراما ـــ تاریخ و تنقید ، کراچی ، اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۵۷ع -

۷۷- عشرت رحمانی : اردو ڈرامے کا ارتقاء ، لاہور ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۶۸ع -

۷۸- عطا کاکوی : گلشن و گلزار ، پٹنہ ، عظیم الشان بکڈپو ۱۹۶۸ع -

۷۹- عطیہ نشاط : اردو ڈراما ـــ روایت اور تجربہ ، لکھنؤ ، نصرت پبلشرز ۱۹۷۳ع -

۸۰- عقیل ، معین الدین : تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ ، کراچی ، انجمن ترقی اردو ۱۹۷۶ع -

۸۱- علوی ، تنویر احمد : ذوق ـــ سوانح و انتقاد ، لاہور ، مجلس ترقی ادب ۱۹۶۳ع -

۸۲- علوی ، منظور علی : فکرِ انیس ، لاہور ، مکتبہ امامیہ مشن ۱۹۷۷ع -

۸۳- فاروقی ، شمس الرحمن : شعر ، غیر شعر اور نثر ، الہ آباد ، شب خون کتاب گھر ۱۹۷۳ع -

۸۴- فاروقی ، شمس الرحمن : عروضِ آہنگ اور بیان ، لکھنؤ ، کتاب نگر ۱۹۷۷ع -

۸۵- فاروق ، محمد احسن : مرثیہ نگاری اور انیس ، لاہور ، اردو اکیڈمی ۱۹۵۱ع -

۸۶- فاروق ، محمد احسن : اردو میں تنقید ، لاہور ، عشرت پبلشنگ ہاؤس ۱۸۷۷ع -

۸۷- فاطمی ، ایم - کے : اردو تذکروں میں "نکات الشعراء" کی اہمیت ، لکھنؤ ، ساجد صدیقی ۱۹۶۲ع -

۸۸- فراق گورکھپوری : اردو کی عشقیہ شاعری ، کراچی ، مکتبۂ عزم و عمل ۱۹۶۶ع -

۸۹- فرمان فتحپوری : شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن ، لاہور ، مجلس ترقی ادب ۱۹۷۲ع -

۹۰- فرمان فتحپوری : میر انیس ـ حیات اور شاعری ، کراچی ، اردو اکیڈیمی ۱۹۷۶ع -

۹۱- فرمان فتحپوری : اردو املا اور رسم الخط ، لاہور ، سنگ میل ۱۹۷۷ع -

۹۲- فرمان فتحپوری : ہندی اردو تنازعہ ، اسلام آباد ، نیشنل بک فاؤنڈیشن ۱۹۷۷ع -

۹۳- قادری ، حامد حسن : داستانِ تاریخِ اردو ، آگرہ ، مطبع لکشمی نرائن ۱۹۵۷ع -

۹۴- قادری ، حامد حسن : تاریخِ مرثیہ گوئی ، کراچی اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۶۴ع -

۹۵- قریشی ، محمد اسلم : ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر ، لاہور ، مجلس ترقیٔ ادب ۱۹۷۱ع -

۹۶- قریشی ، محمد اسلم : الدرسبھا کا تنقیدی جائزہ ، لاہور ، اظہار سنز ۱۹۷۲ع -

۹۷- کاشمیری ، اکبر حیدری : مرزا سلامت علی دبیر ، لکھنؤ ، اردو پبلشرز ۱۹۷۶ع -

۹۸- کاظمی ، زائر حسین : خطوطِ بیخود ، لکھنؤ ۱۱۷۷ع -

۹۹۔ کشفی ، ابوالخیر : اردو شاعری کا تاریخی و سیاسی پس منظر ، کراچی ، ادبی پبلشرز ۱۹۷۴ء -
۱۰۰- کلیم الدین احمد : اردو تنقید پر ایک نظر ، لاہور ، عشرت پبلشنگ ہاؤس ۱۹۶۵ء -
۱۰۱- کلیم الدین احمد : اردو شاعری پر ایک نظر ، لاہور ، عشرت پبلشنگ ہاؤس ۱۹۶۵ء -
۱۰۲- گیان چند : اردو کی نثری داستانیں ، کراچی ، انجمن ترقیٔ اردو ۱۹۶۹ء
۱۰۳- گیان چند : حقائق ، لکھنؤ ، اتر پردیش اکاڈمی ۱۹۷۸ء -
۱۰۴- لاری ، مقبول احمد : حدیثِ میر ، لکھنؤ ، آل انڈیا میر اکاڈمی ۱۹۶۷ء
۱۰۵- مالک رام ، مختار الدین احمد : نذرِ عرشی ، نئی دہلی ، مجلسِ نذرِ عرشی ۱۹۶۵ء -
۱۰۶- مالک رام : نذرِ عابد ، نئی دہلی ، مجلسِ نذرِ عابد ۱۹۶۸ء -
۱۰۷- مالک رام : عیارِ غالب ، دلی ، ۱۹۶۹ء -
۱۰۸- مالک رام : سید مسعود حسن رضوی ادیب ـ ذات و صفات ، دلی ، علمی مجلس ۱۹۷۴ء -
۱۰۹- مجلس عاملہ ادارۂ معارفِ اسلامیہ لاہور : روئداد ادارۂ معارف اسلامیہ ، اجلاس دوم ، منعقدہ لاہور ، ۱۹۳۸ء -
۱۱۰- محمد اکرام ، شیخ : موجِ کوثر ، لاہور ، فیروز سنز ۱۹۶۵ء -
۱۱۱- محمد تقی احمد : واجد علی شاہ ، لکھنؤ ، مرکزِ ادب اردو ۱۹۵۵ء -
۱۱۲- محمد خالدی ، ابو النصر : تقویمِ ہجری عیسوی ، کراچی ، انجمن ترقی اردو ۱۹۷۴ء -
۱۱۳- محمد طفیل : مجتبیٰ ، لاہور ، ادارۂ فروغِ اردو ۱۹۸۱ء -
۱۱۴- مرتضیٰ حسین فاضل : انیس اور مرثیہ زندگی اور پیام ، لاہور ، (س ۔ ن)۔
۱۱۵- مسعود حسین خان : تاریخ زبانِ اردو ، دہلی ، آزاد کتاب گھر ۱۹۵۴ء -
۱۱۶- مسیح الزمان : اردو مرثیے کا ارتقاء ، لکھنؤ ، کتاب نگر ۱۹۶۸ء -

۱۱۷- مسیح الزماں : اندر سبھا ، الہ آباد ، ناشرین ۱۹۷۲ع -

۱۱۸- مظفر حسن ملک : اردو مرثیے میں مرزا دبیر کا مقام ، لاہور ، مقبول اکیڈمی ۱۹۷۶ ع -

۱۱۹- معین الرحمن : سید وقار عظیم ، کراچی ، اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۸۰ع -

۱۲۰- ممتاز لیاقت : بکف چراغ دارد ، لاہور ، مکتبۂ میزان الادب ۱۹۶۸ع -

۱۲۱- ممتاز منگلوری : اندر سبھا ، لاہور ، مکتبۂ خیابانِ ادب ۱۹۶۶ع -

۱۲۲- مہدی حسن : افادات مہدی ، مرتبہ مہدی بیگم ، اعظم گڑھ ، (س - ن) -

۱۲۳- میر ، میر تقی : دریائے عشق ، لکھنؤ ، کتاب نگر ۱۹۶۸ع -

۱۲۴- نارنگ ، گوپی چند : ارمغانِ مالک رام ، دہلی ، مجلسِ ارمغانِ مالک ۱۹۷۱ع -

۱۲۵- نارنگ ، گوپی چند : املا نامہ ، دہلی ، مکتبۂ جامعہ ۱۹۷۴ع -

۱۲۶- نارنگ ، گوپی چند : وضاحتی کتابیات ، جلد اول ۱۹۷۶ع ، نئی دہلی ، ترقی اردو بیورو ۱۹۸۰ع -

۱۲۷- نارنگ ، گوپی چند : انیس شناسی ، دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۱ع

۱۲۸- نذیر احمد ، عباد اللہ : تاریخِ ادبِ اردو ، علی گڑھ ، ایجوکیشنل بک ہاؤس (س - ن) -

۱۲۹- نقوی ، احراز : راہِ سراب کے تنہا مسافر ، لاہور ، شجیع پبلی کیشنز ۱۹۸۱ع -

۱۳۰- نقوی ، احراز : انیس ـ ایک مطالعہ ، لاہور مکتبۂ میری لائبریری ۱۹۷۰ع -

۱۳۱- نور الٰہی محمد عمر : اندرسبھا ، لاہور ، دار الاشاعت پنجاب ۱۹۲۴ع -

۱۳۲- نورانی ، امیر حسن : اردو کے ادبی معرکے ، لکھنؤ ، نسیم بکڈپو ۱۹۶۹ع

۱۳۳- وحید قریشی ، ڈاکٹر : مطالعۂ حالی ، لاہور ، دارالادب ۱۹۶۶ع -

۱۳۴- وقار عظیم : اندر سبھا ، لاہور ، اردو مرکز (س - ن) -

۱۳۵- ہاشمی ، نور الحسن : دلی کا دبستانِ شاعری ، کراچی ، انجمن ترقی اردو ۱۹۴۹ع -

۱۳۶- یگانہ چنگیزی : غالب شکن ، حیدر آباد دکن ، ۱۹۳۴ع -

رسائل و اخبارات :

۱- آج کل ، نئی دہلی ، ڈرامہ نمبر ، جنوری ۱۹۵۹ء -

۲- آج کل ، نئی دہلی ، اردو تحقیق نمبر ، اگست ۱۹۶۷ء -

۳- آج کل ، نئی دہلی ، اردو نمبر ، اگست ۱۹۶۸ء -

۴- آج کل ، نئی دہلی ، اردو نمبر ، اگست - ستمبر ۱۹۷۳ء -

۵- آج کل ، نئی دہلی ، جنوری ۱۹۷۴ء -

۶- آج کل ، نئی دہلی ، فروری ۱۹۷۶ء -

۷- ادب ، لکھنؤ ، فروری ۱۹۳۰ء -

۸- ادبی دنیا ، لاہور ، جنوری ۱۹۳۰ء -

۹- اردو ، اورنگ آباد دکن ، جنوری ۱۹۲۴ء -

۱۰- اردو ، کراچی ، جولائی ۱۹۷۷ء -

۱۱- اسد ، لکھنؤ ، ۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء -

۱۲- افکار ، کراچی ، اکتوبر ۱۹۷۸ء -

۱۳- افکارِ نو ، گورکھپور یونیورسٹی ، ۱۹۶۰ء -

۱۴- الزبیر ، بھاول پور ، ادبی معرکے نمبر ، ۱۹۷۴ء -

۱۵- الناظر ، لکھنؤ ، جنوری ۱۹۳۵ء -

۱۶- انجمن وظیفۂ سادات و مومنین ، سلور جوبلی نمبر ، مارچ ۱۹۱۲ تا دسمبر ۱۹۳۶ء -

۱۷- اودھ اخبار ، لکھنؤ ، ۹ اپریل ۱۹۳۱ء -

۱۸- تحریر ، نئی دہلی ، مسعود حسن رضوی نمبر ، اپریل - جون ۱۹۷۴ء -

۱۹- تخلیقی ادب - ۲ ، کراچی ، ۱۹۸۰ء -

۲۰- تعمیرِ حیات ، لکھنؤ ، ۲۵ مارچ ۱۹۷۶ء -

۲۱- تنویر ، لکھنؤ ، ۳۰ - اکتوبر ۱۹۷۸ء -

۲۲- جامِ جہاں نما ، لکھنؤ ، جولائی تا ستمبر ۱۹۳۱ء -

۲۳- جامعہ ، دہلی ، مارچ ۱۹۲۸ع -

۲۴- جدت ، لکھنؤ ، ۴ دسمبر ۱۹۲۹ع -

۲۵- حقیقت ، لکھنؤ ، ۳۱ - اگست ۱۹۲۸ع -

۲۶- حقیقت ، لکھنؤ ، ۷ دسمبر ۱۹۳۴ع -

۲۷- حقیقت ، لکھنؤ ، ۲۳ دسمبر ۱۹۳۴ع -

۲۸- حقیقت ، لکھنؤ ، ۲۵ جنوری ۱۹۳۵ع -

۲۹- حقیقت ، لکھنؤ ، ۵ فروری ۱۹۳۵ع -

۳۰- خیابان ، لکھنؤ ، جنوری ۱۹۲۷ع -

۳۱- خیابانِ انیس ، پشاور یونیورسٹی ، دسمبر ۱۹۷۴ع -

۳۲- ذوالفقار ، پشاور ، شہیدِ اعظم نمبر ، یکم جنوری ۱۹۷۶ع -

۳۳- رہبرِ تحقیق ، لکھنؤ یونیورسٹی ، ۱۹۷۶ع -

۳۴- زمانہ ، کانپور ، جنوری ۱۹۲۲ع -

۳۵- سرفراز ، لکھنؤ ، ۷ ستمبر ۱۹۲۸ع -

۳۶- سرفراز ، لکھنؤ ، ۹ جون ۱۹۳۱ع -

۳۷- سرفراز ، لکھنؤ ، ۲۱ دسمبر ۱۹۳۴ع -

۳۸- سرفراز ، لکھنؤ ، ۱۷ - اپریل ۱۹۹۹ع -

۳۹- سرفراز ، لکھنؤ ، محرم نمبر ، ۱۷ فروری ۱۹۷۲ع -

۴۰- سرفراز ، لکھنؤ ، ۹ مارچ ۱۹۷۲ع -

۴۱- سرفراز ، لکھنؤ ، ۹ - اپریل ۱۹۷۲ع -

۴۲- سرفراز ، لکھنؤ ، ۱۷ مئی ۱۹۷۲ع -

۴۳- سرفراز ، لکھنؤ ، ۱۷ جون ۱۹۷۲ع -

۴۴- شاعر ، آگرہ ، دسمبر ۱۹۳۸ع -

۴۵- شب خون ، الہ آباد ، دسمبر ۱۹۶۸ع -

۴۶- صبح نو ، پٹنہ ، علی عباس حسینی نمبر ، جنوری ، فروری ، مارچ ۱۹۶۵ع -

۴۷- صداقت ، لکھنؤ ، ۴ ستمبر ۱۹۴۸ء -

۴۸- صدقِ جدید ، لکھنؤ ، ۸ مئی ۱۹۴۹ء -

۴۹- صدقِ جدید ، لکھنؤ ، یکم اگست ۱۹۵۸ء -

۵۰- فروغِ اردو ، لکھنؤ ، جون ۱۹۵۴ء -

۵۱- فروغِ اردو ، لکھنؤ ، ادبی معرکے نمبر ، ۱۹۵۶ء -

۵۲- فروغِ اردو ، لکھنؤ ، اپریل ۱۹۷۲ء -

۵۳- فروغِ اردو ، لکھنؤ ، مارچ ۱۹۷۴ء -

فروغِ اردو ، لکھنؤ ، اپریل - مئی ۱۹۷۴ء -

فروغِ اردو ، لکھنؤ ، اگست - ستمبر ۱۹۷۴ء -

۵۴- فن و شخصیت ، بمبئی ، غزل نمبر ، مارچ ۱۹۷۸ء -

۵۵- قائد ، لکھنؤ ، ۱۷ مارچ ۱۹۶۹ء -

۵۶- قندِ مردان ، ڈرامہ نمبر ، ۱۹۶۱ء -

۵۷- قومی آواز ، لکھنؤ ، ۱۳ جنوری ۱۹۵۸ء -

۵۸- قومی آواز ، لکھنؤ ، ۲۳ مئی ۱۹۶۰ء -

۵۹- قومی آواز ، لکھنؤ ، ۱۲ مئی ۱۹۶۱ء -

۶۰- قومی آواز ، لکھنؤ ، ۱۶ مئی ۱۹۶۱ء -

۶۱- قومی آواز ، لکھنؤ ، ۱۶ مارچ ۱۹۶۹ء -

۶۲- قومی آواز ، لکھنؤ ، ۶ جون ۱۹۷۱ء -

۶۳- قومی آواز ، ۴ - اپریل ۱۹۷۶ء -

۶۴- قومی زبان ، کراچی ، اگست ۱۹۶۹ء -

۶۵- قومی زبان ، کراچی ، مارچ ۱۹۷۶ء -

۶۶- قومی زبان ، کراچی ، فروری ۱۹۸۰ء -

۶۷- کتاب ، لکھنؤ ، دسمبر ۱۹۶۴ء -

۶۸- کتاب ، لکھنؤ ، دسمبر ۱۹۶۸ء -

۶۹- لکھنؤ یونیورسٹی جرنل ، دسمبر ۱۹۲۲ع -
۷۰- ماہِ نو ، کراچی ، مارچ ۱۹۴۹ع -
۷۱- ماہِ نو ، کراچی ، الیس نمبر ، ۱۹۷۲ع -
۷۲- مشرب ، کراچی ، تاریخ ادب اردو نمبر ، جون - جولائی ۱۹۵۶ع -
۷۳- معارف ، اعظم گڑھ ، جنوری ۱۹۲۹ع -
۷۴- معارف ، اعظم گڑھ ، نومبر ۱۹۳۶ع -
۷۵- معارف ، اعظم گڑھ ، اگست ۱۹۴۱ع -
۷۶- معارف ، اعظم گڑھ ، فروری ۱۹۴۶ع -
۷۷- معاصر ، پٹنہ ، شمارہ نمبر ۱ -
۷۸- نظامِ ادب ، حیدر آباد دکن ، مارچ ۱۹۴۳ع -
۷۹- نقوش ، شخصیات نمبر (حصہ اول) ، جنوری ۱۹۵۵ع -
۸۰- نقوش ، اگست ۱۹۶۰ع -
۸۱- نقوش ، خطوط نمبر ، اپریل - مئی ۱۹۶۸ع -
۸۲- نقوش ، آپ بیتی نمبر (حصہ دوم) -
۸۳- نقوش ، سالنامہ ، جنوری ۱۹۷۷ع -
۸۴- نقوش ، میر تقی میر نمبر ، نومبر ۱۹۸۰ع -
۸۵- نقوش ، میر انیس نمبر ، نومبر ۱۹۸۱ع -
نقوش ، ادبی معرکے نمبر ، ۱۹۸۱ع -
۸۶- نگار ، کراچی ، مسائل ادب نمبر ، ۱۹۶۸ع -
۸۷- نگار ، سر سید نمبر ، حصہ اول ، نومبر - دسمبر ۱۹۷۰ع -
نگار ، سر سید نمبر ، حصہ دوم ، جنوری - فروری ۱۹۷۱ع -
۸۸- نوائے ادب ، بمبئی ، جنوری ۱۹۷۶ع -
۸۹- نئی قدریں ، حیدر آباد سندھ ، ۱۹۵۹ع -
۹۰- نیا دور ، لکھنؤ ، مسعود حسن رضوی نمبر ، مارچ - اپریل ۱۹۷۷ع -

۹۱- نیرنگِ خیال ، اپریل - مئی ۱۹۲۸ع -
نیرنگِ خیال ، مئی ۱۹۳۰ع -
۹۲- ہماری زبان ، علی گڑھ ، یکم جنوری ۱۹۵۶ع -
۹۳- ہماری زبان ، علی گڑھ ، ۱۵ فروری ۱۹۵۸ع -
۹۴- ہماری زبان ، علی گڑھ ، ۱۵ - اپریل ۱۹۶۰ع -
۹۵- ہماری زبان ، علی گڑھ ، ۸ نومبر ۱۹۶۱ع -
۹۶- ہماری زبان ، علی گڑھ ، یکم اگست ۱۹۶۲ع -
۹۷- ہماری زبان ، علی گڑھ ، یکم ستمبر ۱۹۶۳ع -
۹۸- ہماری زبان ، علی گڑھ ، ۱۵ مئی ۱۹۶۵ع -
۹۹- ہماری زبان ، علی گڑھ ، ۲۲ ستمبر ۱۹۶۷ع -
۱۰۰- ہماری زبان ، علی گڑھ ، ۲۲ اگست ۱۹۶۸ع -
۱۰۱- ہماری زبان ، علی گڑھ ، ۲۲ جولائی ۱۹۷۱ع -
۱۰۲- ہماری زبان ، علی گڑھ ، ۸ جنوری ۱۹۷۲ع -
۱۰۳- ہماری زبان ، علی گڑھ ، ۸ جولائی ۱۹۷۳ع -
۱۰۴- ہماری زبان ، دہلی ، مسعود حسن رضوی نمبر ، ۲۲ دسمبر و یکم جنوری ۱۹۷۶ع -
۱۰۵- ہمایوں ، لاہور ، جنوری ۱۹۳۷ع -
۱۰۶- روزنامہ ہمت ، لکھنؤ ، ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ع -
۱۰۷- ہندوستانی ، الہ آباد ، جولائی ۱۹۳۱ع تا اکتوبر ۱۹۳۹ع -

تقاریر :

۱۰۸- میری ادبی زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعات و شخصیات : مسعود حسن رضوی ، لکھنؤ ریڈیو ، نشریہ ۲ ستمبر ۱۹۲۰ع -

انٹرویوز :

۱۰۹- مسعود حسن رضوی سے انٹرویو ، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ، فروغِ اردو ، ۱۹۵۴ع -
۱۱۰- سید مسعود حسن رضوی سے انٹرویو ، احتشام حسین ، لکھنؤ ریڈیو ، نشریہ ۲۰ جون ۱۹۶۰ع -
۱۱۱- اہلِ قلم سے ملاقات ، مسعود حسن رضوی سے گفتگو ، جی - ایم شاہ ، لکھنؤ ریڈیو ، نشریہ ۲۶ فروری ۱۹۶۷ع -

اہلِ قلم سے ملاقاتیں :

۱۱۲- ڈاکٹر اختر مسعود رضوی سے گفتگو ، پشاور ، ۲۰ فروری ۱۹۷۸ء -

۱۱۳- مولانا باقر شمس سے گفتگو ، کراچی ، ۱۱ مارچ ۱۹۷۸ء -

۱۱۴- مولانا نسیم امروہوی سے گفتگو ، کراچی ، ۱۳ مارچ ۱۹۷۸ء -

۱۱۵- کے کے باتھر سے گفتگو ، لکھنؤ ، ۷ مئی ۱۹۷۹ء -

۱۱۶- ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سے گفتگو ، لکھنؤ ، ۲۸ مئی ۱۹۷۹ء -

۱۱۷- مولانا علی نقی سے گفتگو ، ۲۹ مئی ۱۹۷۹ء -

۱۱۸- ڈاکٹر نیّر مسعود سے گفتگو ، لکھنؤ ۲ جون ۱۹۷۹ء -

۱۱۹- ڈاکٹر آفاق حسین سے گفتگو ، لکھنؤ ، ۵ جون ۱۹۷۹ء -

۱۲۰- محمد خلیق سے گفتگو ، ملتان ، ۱۲ فروری ۱۹۸۰ء -

۱۲۱- ڈاکٹر عبادت بریلوی سے گفتگو ، لاہور ، ۲ دسمبر ۱۹۸۱ء -

ENGLISH BOOKS :

122. Muhammad Sadiq Dr. : A History of Urdu Literature, Oxford University Press.
123. Poet Liaureate : The works of Lord Tennyson Part II, London Macmillan and Co.
124. Poet Liaureate : All India Oriental Conference 1892. Nagpur University 1946, Popular Printing Press 1950.

PERIODICALS :

125. Bombay Chronicle : June 3, 1928.
126. Hindu, Madras : June 25, 1961.
127. Hindustan Review ; Calcutta, October, 1929.
128. Indian Literature Vol 3, No 2, April-September, 1960.
129. Link, New Dehli, February 28, 1960.
130. Modern Review, Calcutta, October, 1928.
131. Muslim Review, Calcutta, Jan - March, 1928.
132. Pakistan Times, Lahore, August 6, 1967.

☆ ☆ ☆

مجلس ترقیِ ادب کی چند مطبوعات

۱- عکس : (عربی فلسطینی شعرا کی نظموں کا منظوم ترجمہ) :
مترجم امجد اسلام امجد - - - - - - ۱۰/۰۰

۲- البیان : از سید عابد علی عابد - - - - ۶۰/۰۰

۳- البدیع : از پروفیسر سید عابد علی عابد - - - ۳۰/۰۰

۴- یادگار داغ : مرتبہ کلب علی خاں فائق - - ۵۰/۰۰

۵- عبدالرحمٰن چغتائی — فن اور شخصیت :
مرتبہ ڈاکٹر وزیر آغا - - - - ۵۵/۰۰

۶- تاریخِ پنجاب : (طبع دوم)
از کنھیا لال لاہوری ، مرتبہ کلب علی خاں فائق - ۹۰/۰۰

۷- قدیم اسلامی مدارس : از منوّر جہاں رشید - - ۳۵/۰۰

۸- نذرِ حمید احمد خاں : مرتبہ احمد ندیم قاسمی - - ۵۰/۰۰

۹- انتخابِ غزلیاتِ امیر خسرو :
مرتبہ پروفیسر وزیر الحسن عابدی - - - ۲۷/۰۰

۱۰- ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ :
از ڈاکٹر سید عبداللہ - - - - - ۳۷/۰۰

۱۱- خطباتِ اقبال : پنجابی ترجمہ از پروفیسر شریف کنجاہی ۳۰/۰۰

۱۲- جاوید نامہ : پنجابی ترجمہ از پروفیسر شریف کنجاہی ۱۹/۰۰

۱۳- مجرم کون : از جے - بی - پرسٹلے - - - ۱۵/۰۰

۱۴- آر - یو - آر : از کارل چپیک - - - - ۱۲/۰۰

۱۵- تین بہنیں : از چیخوف - - - - - ۱۳/۰۰

مجلس ترقی ادب - کلب روڈ - لاہور

زرین آرٹ پریس ، لاہور